باب دوم

اسلام اور عصرِ حاضر

خالق کی طرف سے انسان کو جو نعمتیں دی گئی ہیں، ان میں سے ایک عظیم نعمت قرآن ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ اِس میں تمام باتوں کا بیان ہے (16: 89)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ہمارے لیے معاملاتِ زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک مستند کتابِ حوالہ (book of reference) کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کے ذریعے ہم خالق کے تخلیقی پلان (creation plan) کو سمجھ سکتے ہیں، اور زندگی کی منصوبہ بندی کے لیے صحیح نقطۂ آغاز (starting point) کو پا سکتے ہیں۔ اِسی طرح دعوت الی اللہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے بھی قرآن ایک مستند کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ حق کے دو دور ہیں۔ ایک ہے پیغمبروں کا زمانہ، اور دوسرا ہے بعد کو آنے والا زمانہ۔ پیغمبروں کے زمانے میں خدا نے آیاتِ وحی کے ذریعے حق کا اظہار فرمایا، اور اس کی مزید تائید کے لیے پیغمبروں کو معجزے دئے، یعنی ایسی نشانیاں (signs) جن کا انکار کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہ ہو۔

بعد کے زمانے میں پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا، لیکن دعوت کا عمل بدستور جاری رہا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے میں، آفاق اور انفس میں ایسی آیات ظاہر ہوں گی جو حق کی تبیین کرنے والی ہوں (41: 53)۔ اِس قرآنی وضاحت کے مطابق، تبیینِ حق کے دو دور ہیں۔ ایک ہے تبیین بذریعہ آیاتِ وحی، اور دوسری ہے تبیین بذریعہ آیاتِ فطرت۔

دعوت کے پہلے دور میں تبیینِ حق کا کام پیغمبروں کے ذریعے انجام پایا۔ دعوت کے دوسرے دور میں، قرآن کے مطابق، تبیینِ حق کا کام آیاتِ فطرت کے ذریعے انجام پائے گا۔ دوسرے دور میں تبیینِ حق کی پیشگی خبر قرآن کی سورہ حم السجدہ کی مذکورہ آیت نمبر 53 میں دی گئی ہے۔ دورِ اوّل میں تبیینِ حق کا کام خدا کے پیغمبروں کے ذریعے انجام پایا، اور دورِ ثانی میں تبیینِ حق کا کام علماءِ اسلام کے ذریعے انجام پائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **العلماء ورثة الانبياء** (سنن أبي داؤد، کتاب العلم،

باب الحث علی طلب العلم) یعنی امتِ محمدی کے علما نبیوں کے وارث ہیں۔

دعوت کے پہلے دور میں تبیینِ حق کا کام جن پیغمبروں نے انجام دیا، انھوں نے اپنے کام کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں (إني رسول الله إليكم)۔ اِس اعلان کا حق انھیں اِس لیے تھا کہ فرشتہ جبریل کے ذریعے اُنھیں براہِ راست طور پر یہ علم دیا گیا تھا۔لیکن بعد کے دور میں جو عالم، یا علما کا جو گروہ تبیین حق کے کام کو انجام دے، اس کو مذکورہ قسم کے پیغمبرانہ اعلان یا دعویٰ (claim) کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرنے کا حق نہیں۔

بعد کے زمانے میں تبیینِ حق کا کام کرنے والے علما کی شناخت ان کے ذاتی اعلان کے ذریعے نہ ہوگی، بلکہ ان کے کام کے ذریعے ہوگی، یعنی جو علما بعد کے دور میں ظاہر ہونے والی آیاتِ فطرت (signs of nature) کا گہرا علم حاصل کریں اور ان کو دعوتِ حق کی حمایت میں درست طور پر اور موثر طور پر استعمال کریں، وہ اِس آیت میں کی گئی پیشین گوئی کا مصداق ٹھیریں گے۔ایسے علما کو صرف ان کے کام کو دیکھ کر پہچانا جا سکتا ہے، نہ کہ ان کے اعلان کے ذریعے۔

ایک یادگار دن

29 فروری 1955 میری زندگی کا وہ دن تھا جس کو میں اپنے لیے ایک بریک تھرو (break through) سے تعبیر کرتا ہوں۔ اُس دن لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں جماعت اسلامی ہند کے زیرِ اہتمام ایک عمومی اجتماع ہوا۔ اِس موقع پر اسلام کے عقلی اثبات پر راقم الحروف کی ایک تقریر ہوئی۔ بعد کو جب اعلان کیا گیا کہ یہ تقریر چھپی ہوئی صورت میں یہاں بک اسٹال پر موجود ہے، تو لوگوں کا ہجوم اس کو لینے کے لیے بک اسٹال پر ٹوٹ پڑا۔ تقریر کے تمام مطبوعہ نسخے اُسی وقت فروخت ہو گئے۔ یہ تقریر پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اردو میں اس کا نام تھا ’’نئے عہد کے دروازے پر‘‘، ہندی میں ’’نو یُگ کے پرویش دوار پر‘‘ اور انگریزی میں:

On the Threshold of A New Era

اِس تقریر کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اسلام کی دعوت کو عصری اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش

کی گئی تھی۔ یہ میری زندگی میں ایک انقلابی واقعہ تھا۔ اِس واقعے نے میری آئندہ زندگی کا رخ متعین کردیا۔ اب میں نے شعوری طور پر یہ طے کرلیا کہ مجھے عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہے۔ اس کے بعد میں نے مذکورہ موضوع کا زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ شروع کردیا۔ اِس درمیان میں مقالہ یا پمفلٹ کی صورت میں بعض تحریریں شائع ہوئیں۔ مثلاً حقیقت کی تلاش''۔ یہ مقالہ 6 ستمبر 1958 کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے یونین ہال میں پڑھا گیا، اوراس کے بعدوہ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا۔

اِس موضوع پر میرے مطالعے کا ایک نتیجہ وہ تھا جو باقاعدہ کتاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ کتاب جو پہلی بار 1966 میں مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام (ندوۃ العلماء، لکھنؤ) سے شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا اردو ٹائٹل ''مذہب اور جدید چیلنج'' تھا۔ بعد کو اِس کتاب کا عربی ترجمہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے کیا۔ یہ عربی ترجمہ پہلی بار 1969 میں کویت اور بیروت اور قاہرہ سے ''**الاسلام یتحدّیٰ**'' کے نام سے چھپا۔ اِس کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر فریدہ خانم نے کیا، جو پہلی بار 1985 میں گاڈ ارائزز (God Arises) کے نام سے شائع ہوا۔

مذہب اور جدید چیلنج 1964 میں لکھ کر تیار ہوئی۔ میں نے اس کا مسوّدہ (manuscript) مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام (لکھنؤ) کے ذمے داروں کو برائے اشاعت دیا۔ چوں کہ اِس کتاب میں بہت زیادہ سائنسی حوالے تھے، مجلس کے ذمے داروں نے چاہا کہ اشاعت سے پہلے وہ کسی ایکسپرٹ (expert) سے اس کی تصدیق حاصل کرلیں۔ اِس مقصد کے لیے کتاب کے مسوّدے کو لکھنؤ کے ایک مسلم آئی اے ایس افسر کو دیا گیا۔ انھوں نے کتاب کے مسوّدے کو پڑھنے کے بعد مجلس کے نام ایک تحریر بھیجی۔ اِس تحریر میں کتاب کے بارے میں منفی رائے دیتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ ایسی ایک کتاب لکھنے کے لیے مصنف کا کریڈنشیل (credential) کیا ہے۔

مذکورہ مسلم افسر کی یہ تحریر مجھے دی گئی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں نے تحریری صورت میں اس کا جواب دیا۔ میں نے اپنے جواب میں یہ لکھا کہ — اس کتاب کے مصنف کا کریڈنشیل یہ ہے کہ اِس موضوع پر پوری مسلم دنیا میں اب تک کوئی ایک کتاب بھی لکھی یا چھاپی نہیں گئی ہے۔

جدید تاریخ میں میں پہلا شخص ہوں جس نے اسلام اور جدید علمی چیلنج کے موضوع پر باقاعدہ مطالعہ کیا اور اس پر ایک مکمل کتاب تیار کی۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق، اِس موضوع پر کوئی دوسری کتاب پائی جاتی ہے، تو آپ مجھے اُس کا نام بتائیں۔ میرے اِس جواب کے بعد لوگ خاموش ہوگئے اور میری کتاب کو 1966 میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے شائع کردیا گیا، جو اِس کتاب کا پہلا ایڈیشن تھا۔ اِس کے بعد میری زندگی مختلف مراحل سے گزرتی رہی۔ یہاں تک کہ میں نے 1970 میں دہلی میں اسلامی مرکز کے نام سے ایک دعوتی ادارہ قائم کیا، اور 1976 میں 'الرسالہ' کے نام سے ایک دعوتی ماہ نامہ جاری کیا، جو اب تک پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔

اِس ادارہ (اسلامی مرکز) کے تحت، میں نے باقاعدہ طور پر کتابیں شائع کرنا شروع کیا۔ اِن کتابوں کا موضوع براہِ راست یا بالواسطہ طور پر صرف ایک ہوتا تھا، اور وہ ہے — جدید علمی چیلنج کے مقابلے میں اسلام کا مدلّل تعارف پیش کرنا۔ ماہ نامہ الرسالہ میں اِن کتابوں کا اشتہار جس عنوان کے تحت چھپتا تھا، وہ عنوان یہ تھا — عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جدید تہذیب کے ظہور اور پرنٹنگ پریس کے زمانے میں پوری مسلم دنیا میں مختلف زبانوں میں کثرت سے کتابیں چھاپی گئیں، لیکن میرے علم کے مطابق، اِن کتابوں کے تعارف کے لیے کسی نے بھی ''عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، اب بھی کوئی مسلم ادارہ ایسا نہیں ہے جو اپنی مطبوعات کے تعارف کے لیے عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کا لفظ استعمال کرتا ہو۔ گویا کہ یہ ٹائٹل غیر متنازعہ طور پر صرف ہمارے مشن کے تحت شائع شدہ کتابوں پر منطبق ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص یا ادارہ اِس معاملے میں، دعوے دار کے درجے میں بھی اس میں شریک نہیں۔

جدید تہذیب کی طرف سے جو فکری چیلنج پیدا ہوا، اس کا تعلق تمام مذاہب سے تھا۔ اِس صورتِ حال کے پیدا ہونے کے بعد دورِ جدید میں کچھ نمایاں افراد پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے عقیدہ یا اپنے مذہب کو ماڈرن معیار پر پیش کرنے کا کام کیا۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر رادھا کرشنن (وفات: 1975) ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے۔ ان کا

مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ ہندوازم (Hinduism) پر گہرا عقیدہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ہندوازم کو جدید معیار پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اِس سلسلے میں ان کی دو کتابوں کے نام یہ ہیں:

1. *A Source Book in Indian Philosophy*, 1957

2. *Recovery of Faith*, 1956

ڈاکٹر رادھا کرشنن موجودہ زمانے کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے، تاہم یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے جس مقدمے کی پیروی کی، وہ مقدمہ اپنے آپ میں کم زور تھا۔ اور جو مقدمہ اپنے آپ میں کمزور ہو، کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی اس کو مضبوط نہیں بنا سکتا۔

1938 سے 1947 تک دس سال کا زمانہ میری زندگی میں بہت اہم زمانہ تھا۔ اِس زمانے میں میرا دماغ افکار ونظریات کے اعتبار سے گویا کہ ایک میلٹنگ پاٹ (melting pot) بنا ہوا تھا۔ اُس زمانے میں پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کے حال اور مستقبل کے بارے میں بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ہر تحریر اور ہر تقریر میں اِسی کا چرچا ہوتا تھا۔ فطری طور پر میرا ذہن مختلف خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں پوری مسلم دنیا میں بڑے پیمانے پر فکری سرگرمیاں جاری تھیں۔ بہ ظاہر اِن سرگرمیوں کے مختلف دھارے تھے، لیکن ایک چیز سب میں مشترک تھی، وہ یہ کہ یہ مختلف قسم کی سرگرمیاں اصلاً ردّ عمل کے تحت پیدا ہوئیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، اِس زمانے میں مغربی قوموں نے جدید ذرائع کے بل پر پوری مسلم دنیا میں سیاسی اور تہذیبی غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ صورت حال مسلم رہنماؤں کے لیے نا قابلِ قبول تھی۔ چناں چہ ہر ایک اِحیاء (revival) کے نام پر اٹھ کھڑا ہوا۔ اِن سب کا مشترک نشانہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے قدیم دورِ عروج کو دوبارہ جدید تاریخ میں واپس لایا جائے۔

مسلمانوں کے اندر اگر یہ سرگرمیاں مثبت ذہن کے تحت پیدا ہوئی ہوتیں، تو ان کا ماڈل زمانۂ رسالت ہوتا۔ اِس ابتدائی ماڈل کی پیروی میں وہ دعوت الی اللہ کو اپنا نشانہ بناتے۔ لیکن اِن سرگرمیوں کا

سرچشمہ چوں کی منفی ردعمل تھا، اِس لیے عملاً بعد کو قائم ہونے والا دورِ تاریخ لوگوں کا ماڈل بن گیا۔ لوگ عباسی سلطنت، اور عثمانی سلطنت، اور مغل سلطنت کے زمانے کو دوبارہ واپس لانے کے نشانے کے تحت، سرگرمِ عمل ہوگئے۔ اِن سرگرمیوں کے دو بڑے دھارے تھے — احیاءِ خلافت، اور احیاءِ جہاد۔

اِن دونوں دھاروں کے تحت بیسویں صدی عیسوی میں غیر معمولی کوششیں کی گئیں، لیکن اپنے مطلوب نشانے کے اعتبار سے یہ کوششیں مکمل طور پر ناکام رہیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ یہ لوگ صرف دورِ قدیم کی مسلم تاریخ کو جانتے تھے، اور اِسی قدیم ماڈل کو دوبارہ واپس لانے کے لیے وہ سرگرمِ عمل ہوگئے۔ وہ اِس حقیقت سے بے خبر تھے کہ کامیابی کے لیے دوسری ضروری چیز جو مطلوب ہے، وہ رعایت زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں کام کے طریقے پوری طرح بدل چکے تھے۔ یہ لوگ اپنی بے خبری کی بنا پر اِس تبدیلی کی رعایت نہ کرسکے، اِس لیے وہ اپنے مطلوب نشانے کو حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔

دوسرا فکری دھارا وہ تھا جس کا کہنا یہ تھا کہ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے، ورنہ اسلام کو اس کی مطلوب اہمیت حاصل نہ ہوسکے گی۔ اِس نقطۂ نظر کے حامل ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے لکھا تھا کہ — آج ضرورت ہے کہ قرآن دوبارہ نازل ہو:

The Quran has to be re-revealed today.

اِس دوسرے فکری دھارے کو امت میں قبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ یہ لوگ صرف ایک قسم کا مبتدعانہ گروہ بن کر رہ گئے۔ اِس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ جن افراد نے اِس دوسرے دھارے کی نمائندگی کی، وہ اپنے مشن کے لیے پوری طرح اہل (competent) نہ تھے۔ اُن کا مدعا اصلاً غلط نہ تھا، لیکن وہ طاقت ور انداز میں اس کی درست نمائندگی نہ کرسکے۔ اِس بنا پر وہ اپنے اصل مقصد، دورِ جدید کے اعتبار سے امت کو رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ راقم الحروف نے اللہ کی توفیق سے، اسلام کی دعوت کو اپنا موضوع بنایا۔ اِس سلسلے میں میں نے وسیع مطالعے کے ذریعے اسلام اور جدید تحدّیات (modern challenges) کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے پایا کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں عام تاثر یہ ہے کہ اسلام جدید دور میں غیر متعلق (irrelevant) ہوگیا ہے۔ اسلام کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ

جدید ذہن کو ایڈریس کر سکے۔ موجودہ زمانے میں مسلم مصنفین نے جو کتابیں لکھی ہیں، وہ تقریباً سب کی سب قدیم روایتی اسلوب میں ہیں۔ اِس قسم کی کتابیں جدید تحدیات کا جواب نہیں بن سکتیں۔ یہ کتابیں آج کے ذہن کو اسلام کی صداقت پر مطمئن کرنے کے لیے یقینی طور پر نا کافی ہیں۔

اِس معاملے کا موضوعی مطالعہ (objective study) کرنے کے بعد میں نے یہ پایا کہ جدید دور کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ روایتی ذہنی فریم ورک اب ٹوٹ گیا ہے۔ آج کے انسان کا ذہنی فریم ورک اُس سے بالکل مختلف ہے جو قدیم زمانے کے انسان کا ہوا کرتا تھا۔ ماڈرن افکار کو سمجھنے کے لیے میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ اِن میں سے کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں:

1. Thomas Paine, *The Age of Reason* (1994)
2. J.F. West, *The Great Intellectual Revolution* (1965)
3. Julian Huxley, *Religion without Revelation* (1927)
4. A.A.A. Faizi, *A Modern Approach to Islam* (1963)
5. Philip Hodgkiss, *The Making of the Modern Mind* (2001)
6. John Herman Randall, *The Making of the Modern Mind* (1926)
7. Brinton Corone, *The Shaping of the Modern Mind* (1953)
8. W. T. Stace, *Religion and the Modern Mind* (1952)

کامیاب دعوت وہ ہے جو مخاطب کے مائنڈ کو ایڈریس کرے۔ موجودہ زمانے کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ قدیم روایتی لٹریچر جدید ذہن کو ایڈریس کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ گویا کہ آج داعی اور مدعو کے درمیان ایک فکری بُعد (intellectual gap) پیدا ہو گیا ہے۔ اِس لیے اسلامی دعوت کے سلسلے میں پہلا ضروری کام یہ ہے کہ اِس فکری بُعد کو ختم کیا جائے تاکہ اسلام آج کے انسان کے لیے قابلِ فہم (understandable) اور قابلِ قبول (acceptable) بن سکے۔

اِس معاملے میں، میں نے اپنے مطالعے کے ذریعے جانا کہ اِس اعتبار سے جو مسئلہ پیدا ہوا ہے، وہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ لمبے فکری عمل کے بعد آج کے انسان کا ذہنی شاکلہ (framework) بدل گیا ہے۔ یہ تبدیلی بنیادی طور پر دو چیزوں میں ہوئی ہے:

1- روایتی معیار کی جگہ سائنسی معیار کا ظہور میں آنا۔

2- حاکمانہ معیار کے بجائے جمہوری معیار کا رواج۔

میں نے اپنے مطالعے کے دوران پایا کہ موجودہ زمانے میں مسلم مصنفین کا پیدا کردہ جو لٹریچر ہے، وہ جدید سائنٹفک معیار پر پورا نہیں اترتا۔ موجودہ دست یاب لٹریچر روایتی زبان میں لکھا گیا ہے۔ وہ اُس سائنٹفک زبان میں نہیں لکھا گیا ہے جو موجودہ زمانے میں قبولیت کا درجہ حاصل کیے ہوئے ہے۔ اِس طرح، کتاب اور قاری کے درمیان جو ذہنی بُعد (intellectual gap) پیدا ہو گیا ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ لٹریچر جدید ذہن کو ایڈریس نہیں کرتا۔

یہی معاملہ دوسرے پہلو کا ہے۔ مسلمانوں کا موجودہ ذہن، قدیم بادشاہی نظام کے تحت بنا ہے، اِس لیے وہ اسلام کو جمہوری انداز میں پیش کرنے سے عاجز رہ گئے۔ چناں چہ اِن مسلمانوں کی باتیں اُس جدید ذہن کو اپیل نہیں کرتیں جو چیزوں کو صرف اُس وقت سمجھ پاتا ہے، جب کہ وہ جمہوری انداز میں پیش کی گئی ہوں۔ مثلاً خلافت کا روایتی تصور قدیم شاہی ذہن کے لیے تو قابلِ تصور تھا، لیکن جدید جمہوری ذہن کے لیے وہ قابل فہم نہیں۔ اِسی طرح توہینِ اسلام کے نام پر قتل کی سزا دینا جدید ذہن کے لیے نا قابلِ فہم ہے، کیوں کہ جدید ذہن اِس طرح کی ''گستاخی'' کے تصور سے نا آشنا ہے۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ اظہارِ خیال کی آزادی (freedom of expression) انسان کا ایک ایسا حق ہے جس کو کسی بھی عذر کی بنا پر منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

یہی معاملہ مسلّح جہاد (armed struggle) کا ہے۔ موجودہ زمانے میں صرف پُرامن جدوجہد (peaceful struggle) کو قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے۔ حق کے حصول کے لیے پُرامن جدوجہد پوری طرح درست ہے، لیکن مسلح جدوجہد کسی بھی حال میں درست نہیں۔ اِن اسباب کی بنا پر آج کے انسان کو وہ لٹریچر اپیل نہیں کرتا جو جمہوریت کی شرطوں پر پورا نہ اترتا ہو۔

لٹریچر کے اعتبار سے اسلامی تاریخ کے تین بڑے دور ہیں۔ پہلا دور، رسالت اور صحابہ کا دور ہے۔ یہ دور ساتویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس دور میں اسلام کا مستند (authentic) یا کلاسکل لٹریچر (classical literature) وجود میں آیا۔ یہ لٹریچر عربی زبان میں ہے، اور قرآن اور

حدیث اور سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہ پر مشتمل ہے۔

دوسرا دور وہ ہے جو عباسی سلطنت کے زمانے میں شروع ہوا اور عثمانی سلطنت اور مغل سلطنت کے زمانے تک جاری رہا۔ یہ دور آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں، جو آج اسلامی کتب خانے کا تاریخی حصہ ہیں۔ یہ تمام کتابیں قبل از سائنس دور (pre-scientific era) میں لکھی گئیں۔ چناں چہ یہ کتابیں قدیم روایتی اسلوب میں ہیں، نہ کہ جدید سائنسی اسلوب میں۔

تیسرا دور وہ ہے جو مغرب کے نو آبادیاتی نظام کے زمانے میں ظہور میں آیا۔ یہ دور انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس تیسرے دور میں پرنٹنگ پریس وجود میں آچکا تھا اور کاغذ سازی کی جدید صنعت قائم ہوچکی تھی۔ چناں چہ اِس زمانے میں ہزاروں کی تعداد میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں کتابیں لکھی اور چھاپی گئیں۔ یہ کتابیں عربی کے علاوہ دوسری مختلف زبانوں میں تھیں۔

مگر تیسرے دور کی کتابیں بھی عملاً دوسرے دور کی کتابوں کا امتداد (extention) بن گئیں، یعنی تحریر اور استدلال کا جو روایتی اسلوب دوسرے دور میں قائم ہوا، وہی بڑی حد تک، تیسرے دور میں بھی جاری رہا۔ تیسرا دور تحریر اور استدلال کے اسلوب کے اعتبار سے وہ دور تھا جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے، مگر تیسرے دور کی کتابیں بھی عملاً دوسرے دور کی کتابوں میں اضافے کے ہم معنی بن گئیں۔ صرف اِس فرق کے ساتھ کہ دوسرے دور میں تیار کی ہوئی کتابیں قلمی کتابیں ہوا کرتی تھیں، جب کہ تیسرے دور کی کتابیں مطبوعہ کتابوں کی صورت میں سامنے آئیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی اٹھارھویں صدی عیسوی کے مشہور عالم ہیں۔ ان کی وفات 1762 میں ہوئی۔ اسلامی عقلیات کے موضوع پر ان کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغۃ' ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حجۃ اللہ البالغہ تیسرے دور کے آغاز میں لکھی گئی، مگر وہ پوری طرح روایتی فریم ورک کے مطابق لکھی گئی۔ اِس اعتبار سے وہ دوسرے دور ہی کی ایک تکرار تھی۔

موجودہ زمانے میں اِس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، اُن میں سے ایک کتاب الجزائری عالم شیخ محمد حسین الجِسر (وفات: 1909) کی کتاب: الرّسالة الحميدية في حقيقة الدّيانة الإسلامية ہے۔ اِس کتاب کو مزید اضافے کے ساتھ ان کے صاحب زادے شیخ ندیم حسین الجسر (وفات: 1980) نے شائع کیا ہے۔ اِس دوسری کتاب کا نام یہ ہے: قصة الإيمان بين الفلسفة والعلم والقرآن (1961) ۔ یہ کتاب پوری کی پوری فلسفیانہ پیٹرن پر لکھی گئی ہے، نہ کہ سائنٹفک پیٹرن پر۔ اِس لیے وہ عصرِ حاضر میں اسلام کی ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔

اِس موضوع پر ایک اور کتاب ڈاکٹر محمد اقبال (وفات: 1938) کی ہے۔ یہ کتاب مصنف کے مختلف خطبات پر مشتمل ہے۔ وہ پہلی بار 1930 میں چھپی تھی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Reconstruction of Religious thought in Islam.

ڈاکٹر اقبال کی یہ کتاب بھی فلسفیانہ پیٹرن پر لکھی گئی ہے، اِس لیے اس کا معاملہ بھی سابقہ کتاب جیسا ہے۔ وہ عصرِ حاضر میں اسلام کی دعوتی ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔ میرے علم کے مطابق، غالباً صرف ایک کتاب ہے جو براہِ راست طور پر اِس موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب اصلاً فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اِس کتاب کے مصنف فرانس کے ڈاکٹر موریس بکائی (Maurice Bucaille) ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار 1975 میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Bible, the Quran, and Science

مگر یہ کتاب بھی اصل ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔ اِس کتاب میں قرآن کے صرف ایک پہلو پر کچھ شواہد پیش کئے گئے ہیں۔ وہ دین اسلام کا سائنسی تعارف نہیں۔ اِس اعتبار سے اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ اسلام کی ایک جُزئی خدمت کہا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، راقم الحروف نے عصری اسلوب میں اسلام کے تعارف کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔ میری تمام کتابیں، براہِ راست یا بالواسطہ طور پر، اِسی موضوع سے متعلق ہیں۔ میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی پوری زندگی اسی کام پر وقف کردی۔ میرے نزدیک

اِس موضوع کے بنیادی طور پر دو پہلو ہیں — سائنسی اسلوب میں اسلامی تعلیمات کی تبیین، جدید علمی دریافتوں کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو مدلّل انداز میں پیش کرنا۔

مثال کے طور پر، 'تذکیر القرآن' اور 'مطالعۂ سیرت' پہلی قسم کی کتب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور 'مذہب اور جدید چیلنج' اور 'عقلیات اسلام' کو دوسری نوعیت کی کتابوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ میری تقریباً تمام کتابیں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اِنھیں دونوں پہلوؤں کی مثالیں ہیں۔

سائنٹفک اسلوب کیا ہے، اس کو ایک لفظ میں، مبنی بر حقیقت اسلوب کہا جاسکتا ہے، یعنی حقیقت نگاری کا اسلوب۔ پرنٹنگ پریس کے زمانے میں تصنیف وتالیف کا رواج بہت زیادہ بڑھا اور کثیر تعداد میں کتابیں شائع ہوئیں، لیکن یہ تمام کتابیں قدیم روایتی اسلوب میں تھیں۔ قدیم روایتی اسلوب میں مسجّع اور مقفّیٰ (rhymed) عبارتیں، تمثیلی استدلال، خطیبانہ نثر، انشائیہ اسلوب، شاعرانہ اندازِ تحریر اور ادبی طرزِ نگارش کا رواج تھا۔ یہی اسلوب موجودہ زمانے میں بھی کم وبیش جاری رہا۔ جدید دور میں سائنس کے زیر اثر مذکورہ اسالیب متروک ہوگئے۔ جدید سائنس، حقائق کے مطالعے کا نام تھی، اِس لیے یہی اسلوب دیگر تصنیفی شعبوں میں بھی رائج ہوگیا۔ اِس اسلوب کو ترتیبِ حقائق (arrangement of facts) کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانے میں برٹرینڈ رسل کی کتابیں اِسی سائنٹفک اسلوب کا ایک نمونہ ہیں۔ راقم الحروف نے اِسی اسلوب کو اسلام کے تعارف کے لیے اپنایا۔

جہاں تک سائنٹفک اسلوب کے دوسرے پہلو کی بات ہے، یعنی اسلام کی توضیح وتفہیم میں سائنسی دلائل کو استعمال کرنا، اس کو دوسرے لفظوں میں، اسلام کا جدید علم کلام (modern theology) بھی کہا جاسکتا ہے۔ قدیم علم کلام، روایتی استدلال اور یونانی منطق پر قائم تھا۔ جدید علم کلام وہ ہے جو سائنسی استدلال پر قائم ہو۔ سائنسی استدلال سے مراد ہے — جدید دریافت شدہ حقائق کی روشنی میں اسلام کے عقائد کو مدلل کرنا۔ راقم الحروف نے اِس اعتبار سے متعدد کتابیں تیار کیں۔ اِن میں سے ایک کتاب وہ ہے جس کا اردو ٹائٹل 'مذہب اور جدید چیلنج' (*God Arises*) ہے۔ وہ مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں شائع ہوچکی ہے۔ عربی زبان میں اس کا ٹائٹل 'الاسلام یتحدّی' ہے۔

سائنس کی جدید دریافتوں کی بنیاد پر کلامیاتی استدلال کی ایک مثال وہ ہے جس کو ضابطۂ ناکارگی (Law of entropy) کہا جاتا ہے۔ اِس دریافت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادّی کائنات ازلی نہیں ہوسکتی۔ قدیم یونانی فلاسفہ مادّہ (matter) کو قدیم مانتے تھے۔ اس کے زیر اثر مسلم فلسفی ابن رُشد (وفات: 1198ء) نے مادّہ کو قدیم مان لیا۔ مگر مادّہ کی قدامت کا نظریہ اسلامی عقیدے سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ اِس کے مطابق، خدا اور مادّہ دونوں قدیم ہوجاتے ہیں، جب کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق، خدا قدیم اور ازلی ہے، اور مادّہ بعد کی تخلیق۔ یہ جدید دریافت اسلامی عقیدے کے حق میں سائنسی تصدیق (scientific affirmation) کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضابطۂ ناکارگی کے قانون کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: 'مذہب اور جدید چیلنج'، صفحہ 55۔

اوپر کی بات نظریاتی اعتبار سے ذہنی فریم ورک سے تعلق رکھتی ہے۔ اب اِس معاملے کے دوسرے پہلو کو لیجئے، یعنی وہ مسئلہ جس کو عملی فریم ورک کہا جا سکتا ہے۔ اِس دوسرے معاملے میں مسلمان موجودہ زمانے میں اتنے اجنبی ہوگئے ہیں کہ موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو وہ آج کی دنیا کے لیے ناموزوں (misfit) نظر آتے ہیں۔

اس کا سبب کیا ہے۔ میرے مطالعے کے مطابق، اِس کا سبب دوبارہ یہ ہے کہ اِس معاملے میں بھی دوسرے دور کا فریم ورک تیسرے دور میں بھی بدستور جاری رہا۔ حالاں کہ تیسرے دور میں ضرورت تھی کہ اِس پہلو سے قدیم ڈھانچے پر نظر ثانی کی جائے اور اس کو جدید مسلّم ڈھانچے کے مطابق بنایا جائے۔ اِس نظر ثانی کا تعلق عقائد میں نظر ثانی سے نہیں ہے، بلکہ منہاج (method) میں نظر ثانی سے ہے۔

عقائد ہمیشہ ابدی ہوتے ہیں، ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر منہاج (method) کا تعلق حالات سے ہے۔ فقہ کا مسلّمہ اصول اسی منہاج کے پہلو سے ہے۔ وہ فقہی اصول یہ ہے کہ: تتغیر الأحکام بتغیّر الزمان والمکان (زمان اور مکان کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں)۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بار بار مخالف گروپ کی طرف سے قتال کا چیلنج پیش آیا، مگر آپ نے اس کے جواب میں مختلف رویہ اختیار کیا۔

مثال کے طور پر مکی حالات میں آپ نے ہجرت کا طریقہ اختیار فرمایا، یعنی ٹکراؤ کے مقام کو چھوڑ دینا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر آپ نے خندق (trench) کا طریقہ اپنایا، یعنی اپنے اور مخالف کے درمیان ایک حاجز (buffer) قائم کر دینا۔ اِسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے ٹکراؤ سے اعراض کرنے کے لیے فریقِ مخالف کی یک طرفہ شرطوں کو قبول کرتے ہوئے اُن سے صلح کر لی، وغیرہ۔

جمہوریت کا تعلق عملی معاملات سے ہے۔ اور اجتماعی نوعیت کے مشترک معاملات میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ اِس طرح کے معاملات میں جو صورتِ حال پیش آتی ہے، وہ نہ خیرِ مطلق ہوتی ہے اور نہ شرِ مطلق، بلکہ اُن میں دونوں قسم کے پہلو شامل رہتے ہیں۔ اِس لیے اِس طرح کے کسی معاملے کو آئڈیل کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے، بلکہ عملی افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اِس طرح کے کسی معاملے میں بہترین اصول یہ ہے کہ — مسائل کو نظر انداز کرو، اور مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problems, avail the opportunities.

موجودہ زمانے میں مسلم رہنماؤں نے قربانی کی حد تک غیر معمولی سرگرمیاں دکھائیں، لیکن اِن سرگرمیوں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ رہنما اپنی سرگرمیوں میں مذکورہ حکمت کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ وہ ہر جگہ مسائل سے ٹکراتے رہے، اور مبنی بر مواقع منصوبہ بندی (opportunity-based planning) کا طریقہ اختیار کرنے میں ناکام رہے۔

پچھلے دو سو سال کے درمیان مسلم دنیا میں جو سرگرمیاں جاری رہی ہیں، ان کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اِس پوری مدت میں مسلم رہنما ٹکراؤ کے اصول پر عمل کرتے رہے۔ ہر مقام پر انھوں نے ایک مسئلہ (problem) دریافت کیا اور اِس پرابلم سے ٹکرانے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ اُن کی سوچ یہ تھی کہ جب تک یہ پرابلم ختم نہ ہو، اُس وقت تک کوئی مثبت کام نہیں کیا جاسکتا — کہیں یہودی پرابلم، کہیں برٹش پرابلم، کہیں امریکن پرابلم، کہیں نو آبادیاتی پرابلم، کہیں ہندو پرابلم، کہیں ظالم حکومت کا پرابلم، کہیں کوئی اور پرابلم، یہی ہر جگہ مسلم رہنماؤں کا نشانۂ عمل بنا رہا۔

اس طریقِ کار کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ خدا کے تخلیقی نقشے کے خلاف تھا۔ خدا نے اپنے تخلیقی نقشے

کے مطابق، موجودہ دنیا میں انسان کو مکمل آزادی عطا فرمائی ہے۔ انسان کو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرنے کا بھی اختیار ہے، اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اپنی خداداد آزادی کو غلط طور پر استعمال کرے۔ انسان کی اِس آزادی کو صرف قیامت منسوخ کرے گی۔ اِس سے پہلے کوئی شخص اس کو منسوخ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ موجودہ دنیا کے تمام مسائل اسی انسانی آزادی کے غلط استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ چوں کہ ہم انسان کی آزادی کو منسوخ نہیں کرسکتے، اِس لیے ہم یہ بھی نہیں کرسکتے کہ اُن چیزوں کو دنیا سے ختم کردیں جن کو ہم اپنے لیے قومی یا سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں۔

خدا کے قائم کردہ اِس تخلیقی نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں ہمارے لیے جو انتخاب (choice) ہے، وہ صحیح (right) اور غلط (wrong) کے درمیان نہیں ہے، بلکہ یہ انتخاب چھوٹے شر (lesser evil) اور بڑے شر (greater evil) کے درمیان ہے۔ کسی صورتِ حال میں ہمارے عمل کی منصوبہ بندی اِس تصور کے تحت نہیں ہوسکتی کہ ہم یہ دیکھیں کہ اصولی اعتبار سے درست کیا ہے اور نادرست کیا، اور پھر جو چیز ہمیں اصولی طور پر درست نظر آئے، اس کو حاصل کرنے کے لیے ہم پُرشور جدوجہد شروع کردیں۔ اِس کے بجائے یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ دیکھیں کہ عملی اعتبار سے جو دو انتخاب ہمارے لیے ممکن ہیں، اُن میں سے کون سا انتخاب اَہوَن (easier) ہے اور کون سا غیر اہون (non-easier)۔ اِسی اصول کو فقہ میں اهون البليّتين کہا جاتا ہے، یعنی دو مصیبتوں میں سے آسان (easier) مصیبت۔

یہ فطرت کا اصول ہے۔ اِس اصول کو اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ ہر صورت حال میں آدمی کو بلا تاخیر اپنے عمل کے لیے ایک نتیجہ خیز نقطۂ آغاز (starting point) مل جاتا ہے، اور کسی صورتِ حال میں حقیقی نقطۂ آغاز کا ملنا کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔ اِس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کسی مزید نقصان میں مبتلا ہوئے بغیر نتیجہ خیز عمل شروع کردیتا ہے اور آخر کار وہ اپنے مطلوب تک پہنچ جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں حالات مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ اِس لیے ضروری ہے کہ منہاج کے معاملے میں نئے ماڈل کو اختیار کیا جائے۔ یہ ماڈل اصولی طور پر نتیجہ (result) کی بنیاد پر ہوگا،

یعنی جو ماڈل اسلام کے لیے بہ اعتبار نتیجہ مفید ہو، اس کو اختیار کرنا اور اُس ماڈل کو چھوڑ دینا جو نتیجے کے اعتبار سے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہونے والا ہو۔

اِس اعتبار سے موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ جدید جمہوری ماڈل کو اختیار نہ کر سکے۔ وہ جدید جمہوری نظام میں بھی قدیم حاکمانہ ماڈل پر قائم رہنا چاہتے ہیں، حالاں کہ جدید حالات میں عملاً یہ ممکن ہی نہیں۔ اِس قسم کے اصرار کا نتیجہ صرف دو صورتوں میں برآمد ہوگا۔ یا تو مسلمان ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کریں جو بلاشبہہ خودکشی کے ہم معنیٰ ہے، یا پھر وہ منافق بن جائیں، یعنی اپنی ذہنی سوچ کے اعتبار سے وہ حاکمانہ ماڈل کو اپنائے ہوئے ہوں اور عملی اعتبار سے مصلحت کا انداز اختیار کر کے وہ اپنے مادی مفاد کو بچانے کی کوشش کریں۔

اِس معاملے میں تفصیلی مطالعے کے بعد میں نے کئی کتابیں لکھیں۔ میں نے اپنی کتابوں میں بتایا کہ جمہوری ماڈل اگر چہ بہ ظاہر ایک نیا ماڈل ہے، لیکن اُس میں اور اسلام کی حقیقی تعلیمات میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ ہم اپنی اسلامی حیثیت کو پوری طرح باقی رکھتے ہوئے جمہوری نظام میں اپنے آپ کو شامل کر سکتے ہیں۔ یہاں میں چند مثالوں کی روشنی میں اس کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

موجودہ زمانے میں جن چیزوں کی بنا پر اسلام کے بارے میں یہ عالمی تاثر قائم ہو گیا ہے کہ اسلام جدید حالات کا ساتھ نہیں دیتا، اسلام جدید دور کے لیے ایک غیر متعلق مذہب ہے۔ یہ تاثر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی قومی روش کی بنا پر قائم ہوا ہے، نہ کہ اسلام کی اصل تعلیمات کی بنا پر۔

1 - مثال کے طور پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے رسول کی شان میں ''گستاخی'' کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنے مذہبی عقیدے کی بنا پر ان کے اوپر فرض ہے کہ وہ ایسے انسان کو قتل کر ڈالیں۔ مسلمانوں کا یہ نظریہ دورِ جدید کے تصورات سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ موجودہ زمانے کا یہ مسلّمہ ہے کہ ہر شخص کو پُرامن اظہار رائے کی آزادی ہے۔ اِس آزادی کو کسی بھی حال میں ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ ٹکراؤ جدید دور اور مسلم تصورات کے درمیان ہے، نہ کہ جدید دور اور اصل اسلامی تعلیمات کے درمیان۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں بھی اظہارِ خیال کی آزادی اُسی کامل درجے میں

دی گئی ہے جس کو جدید دور کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اِس معاملے کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب 'شتمِ رسول کا مسئلہ' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

2- یہی معاملہ سیکولرازم کا ہے۔ موجودہ زمانے میں سیکولرازم کو اسٹیٹ پالیسی کا معیاری ماڈل سمجھا جاتا ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے اسلام پسند مسلم رہنماؤں نے یہ اعلان کیا کہ سیکولرازم، اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم سیکولر نظام کے خلاف لڑکر اس کا خاتمہ کریں۔ لیکن یہ ٹکراؤ بھی جدید دور اور مسلمانوں کے درمیان ہے، نہ کہ جدید دور اور اسلام کے درمیان۔ اسلام خود بھی مشترک سماج کے لیے اُسی طرح سیکولر پالیسی کا حامی ہے، جس طرح جدید دور میں سمجھا جاتا ہے۔ اِس مسئلے کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب 'دینِ کامل' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح کا ایک معاملہ وہ ہے جو جمہوریت (democracy) سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ زمانے کے اسلام پسند مسلم لیڈروں نے اعلان کیا کہ جمہوریت ایک غیر اسلامی نظریہ ہے، اِس لیے وہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ دوسری طرف، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ جمہوریت کا ماڈل سب سے بہتر سیاسی ماڈل ہے۔ مگر یہ ٹکراؤ بھی جدید ذہن اور موجودہ مسلمانوں کے درمیان ہے، نہ کہ جدید ذہن اور اصل اسلام کے درمیان۔ اسلام خود بھی سیاسی تنظیم کے لیے جمہوری طریقے کا حامی ہے۔ اسلام میں تھیاکریٹک اسٹیٹ (theocratic state) کا تصور نہیں۔ اسلام مکمل طور پر جمہوری نظام کا قائل ہے، یعنی عوام کی رائے کے مطابق، سیاسی نظام کی تشکیل۔

اِس موضوع کی وضاحت میں نے اپنی مختلف کتابوں میں کی ہے۔ مثلاً 'فکرِ اسلامی' اور 'مسائل اجتہاد' وغیرہ۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک عقیدہ اور عبادت کا تعلق ہے، اِس معاملے میں اسلام کی تعلیمات مطلق حکم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن جہاں تک اجتماعی نظام کا معاملہ ہے، اس کا کوئی مطلق معیار نہیں۔ اجتماعی نظام کا معاملہ عوام کی اجتماعی صورتِ حال پر منحصر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: كماتكونون كذلك يؤمّر عليكم (البيهقي، رقم الحديث: 6896) یعنی جیسے تم ہوگے، ویسے ہی تمھارا حکومتی نظام ہوگا۔

اجتماعی نظام کے معاملے میں اسلام کا اصول اِس پر مبنی ہے کہ عوام یا معاشرہ کی استعدادِ قبولیت کس درجے کی ہے۔ عوام کے اندر جن اجتماعی احکام کی قبولیت کی استعداد ہوگی، اُن کو آغاز میں نافذ کیا جائے گا، لیکن جن احکام کی قبولیت کی استعداد عوام کے اندر موجود نہ ہوگی، اُن احکام کی تنفیذ کا آغاز خود قانون کے نفاذ سے نہ ہوگا، بلکہ ذہن سازی کے عمل سے ہوگا۔ اسلام کے اِس اصول کو تدریج کا اصول کہہ سکتے ہیں، یعنی عوام کی استعداد کے مطابق، احکام کا تدریجی نفاذ، نہ کہ ان کا بہ یک وقت نفاذ۔

موجودہ دنیا چوں کہ امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے، اِس لیے یہاں انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ یہ آزادی خود خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق ہے، اِس لیے کوئی بھی طاقت اس کو منسوخ نہیں کرسکتی۔ تجربہ ہے کہ انسان زیادہ تر اِس آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اِسی بنا پر ایسا ہوا کہ تاریخ میں کبھی معیاری نظام نہ بن سکا، اور نہ آئندہ اِس کا کوئی امکان ہے۔ مومن اور غیر مومن دونوں مجبور ہیں کہ اِس غیر معیاری دنیا میں وہ اپنی زندگی کا نقشہ بنائیں۔ اِسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ — اِس دنیا میں معیار کبھی حاصل نہیں ہوسکتا:

The Ideal can not be achieved in this world.

اِس صورتِ حال کی بنا پر اسلام کا اصول یہ ہے کہ معیار کے حصول کے لیے جنگ نہ کی جائے، بلکہ کسی صورتِ حال میں عملی طور پر جو ممکن ہو، اس کو مان کر اپنی زندگی کا نقشہ بنایا جائے۔ اِس اصول کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو ہر صورتِ حال میں فوراً ہی ایک نقطۂ آغاز (starting point) مل جاتا ہے۔ ہر صورتِ حال میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی فوری طور پر اپنے عمل کا نقشہ بنائے، تاکہ جو کچھ آج قابلِ حصول نہ تھا، وہ مستقبل میں قابلِ حصول ہوجائے۔

فکرِ مغرب

فکرِ مغرب (western thought) کیا ہے۔ فکرِ مغرب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، سائنسی طرز فکر (scientific thinking) کا نام ہے، اور سائنسی طرزِ فکر پورے معنوں میں ایک درست طرز فکر ہے۔ وہ بجائے خود اسلامی فکر نہیں ہے، لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک موافقِ اسلام طرز فکر ہے۔ وہ اسلام کے حق میں ایک مؤید علم (supporting knowledge) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل مغربی فکر نہ غیر اسلامی فکر ہے اور نہ وہ کسی بھی اعتبار سے، اسلام دشمن فکر ہے۔

قرآن کی سورہ الاحقاف میں یہ آیت آئی ہے: قُلْ أَرَءَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (46:4) یعنی کہو کہ کیا تم نے غور کیا اُن چیزوں پر جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے زمین میں کیا بنایا ہے، یا آسمانوں میں ان کی کچھ شرکت ہے۔ میرے پاس اِس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ، یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچے ہو۔

مفسر ابن کثیر (وفات: 774 ہجری) نے درست طور پر لکھا ہے کہ قرآن کی اِس آیت میں دو قسم کے علم کو بطور مستند علم (authentic knowledge) تسلیم کیا گیا ہے — ایک، علمِ نقلی اور دوسرا علمِ عقلی۔ علمِ نقلی سے مراد مبنی بر وحی علم ہے اور علم عقلی سے مراد وہ علم ہے جو عقلِ انسانی پر مبنی ہو۔ تاہم علمِ عقلی سے مراد صرف وہ علم نہیں ہے جو عباسی دور کے معتزلہ اور متکلمین کے درمیان پایا جاتا تھا، بلکہ توسیعی طور پر اُس سے مراد سائنسی دور کا وہ جدید علم بھی ہے جس کو عقلی علم (rational knowledge) کہا جاتا ہے۔

اِس جدید عقلی دور کا آغاز اٹلی کے سائنس داں گلیلیو (Galieo Galilei) سے ہوا۔ گلیلیو کی وفات 78 سال کی عمر میں 1642 میں ہوئی۔ گلیلیو پہلا شخص ہے جس نے دوربین (telescope) کا استعمال کیا۔ گلیلیو کو جدید سائنس کا بانی (founder of modern science) کہا جاتا ہے۔

گلیلیو سے پہلے دنیا میں زمین مرکزی نظریہ (geo-centric theory) کو مانا جاتا تھا، جس کو ٹالمی (Claudius Ptolemy) اور ارسطو (Aristotle) کی حمایت حاصل تھی۔ گلیلیو نے ثابت کیا کہ زمین مرکزی نظریہ غلط ہے اور اِس کے مقابلے میں وہ نظریہ درست ہے جس کو آفتاب مرکزی نظریہ (heleo-centric theory) کہا جاتا ہے۔

اِس کے بعد تاریخ میں ایک نیا عقلی دور یا سائنسی دور شروع ہوا۔ اِس دور میں عقلی ثبوت کا یہ معیار قرار پایا کہ قابلِ اعتماد علم صرف وہ ہے جو قابلِ تصدیق علم (verifiable knowledge) ہو۔ دور بینی مشاہدہ نے زمین مرکزی نظریہ کی تصدیق نہیں کی، اِس لیے علمی دنیا میں اُس کو رد کر دیا گیا، جب کہ دور بینی مشاہدہ نے آفتاب مرکزی نظریہ کی تصدیق کردی، اِس لیے وہ عقلی طور پر درست قرار پایا۔

سائنس دراصل اِسی قابلِ تصدیق علم (verifiable knowledge) کا اصطلاحی نام ہے۔ اہلِ سائنس نے علمِ وحی (revealed knowledge) کا انکار نہیں کیا، البتہ انھوں نے علم وحی کو اپنے دائرۂ تحقیق سے باہر قرار دیا، کیوں کہ وہ ان کے نزدیک قابلِ تصدیق نہ تھا۔

اِس کے بعد علم کی دنیا میں ایک تقسیم (bifurcation) کا طریقہ وجود میں آ گیا۔ اب علمِ وحی کا دائرہ الگ ہو گیا اور عقلی علم یا سائنسی علم کا دائرہ الگ۔ یہ تقسیم بجائے خود غلطی نہ تھی۔ اِس کی بنا پر اہلِ سائنس کو یہ موقع ملا کہ وہ آزادانہ طور پر اپنی تحقیق کو جاری رکھ سکیں۔ اِس طرح سائنس کی تحقیق کا دائرہ اُس دنیا سے ہو گیا جس کو فطرت (nature) کہا جاتا ہے۔ اِسی لیے سائنس کو دوسرے الفاظ میں، فطری علم (natural science) یا مادّی علم (physical science) کہا جاتا ہے۔

تائیدی علم

سائنسی علم براہِ راست طور پر اسلامی علم نہ تھا، لیکن بالواسطہ طور پر وہ اسلام کے لیے ایک تائیدی علم کی حیثیت رکھتا تھا۔ عقل کی صلاحیت کو لے کر سائنسی دنیا میں جو تحقیقات ہوئیں، اُس سے اسلام کو بہت زیادہ فائدے حاصل ہوئے۔ اِس اعتبار سے، سائنس کا پورا علم، اسلام کے لیے تائیدی علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اُس حدیث رسول کی مصداق ہے جو

پیشین گوئی کی زبان میں اِن الفاظ میں آئی ہے: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3062)۔

فطرت میں سائنسی تحقیق کے ذریعے جو دریافتیں وجود میں آئیں، وہ خاص طور پر دو اعتبار سے، اسلام کے لیے غیر معمولی تائید کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایک قسم کی تائید وہ تھی جو اُس سائنس کے ذریعے حاصل ہوئی جس کو نظریاتی سائنس (theoretical science) کہا جاتا ہے۔ اور اسلام کے لیے دوسری تائید وہ تھی جس کو اصطلاحی طور پر انطباقی سائنس (applied science) کہا جاتا ہے۔

نظریاتی سائنس نے یہ کیا کہ اس نے فطرت (nature) میں چھپے ہوئے وہ قوانین دریافت کیے جو اب تک غیر معلوم تھے۔ اِن قوانین کے بارے میں اشارات قرآن میں موجود تھے، لیکن قرآن میں ان کی تفصیل موجود نہ تھی۔ اہلِ ایمان کو ابھارا گیا کہ وہ زمین وآسمان میں غور کرکے اِن تفصیلات کو دریافت کریں، جو کہ ان کے لیے اضافہ ایمان کا ذریعہ ہیں۔ لیکن بعد کے زمانے کے مسلمان یہ کام نہ کرسکے۔ آخر کار، اللہ تعالی نے اہلِ سائنس کے ذریعے یہ کام لیا۔ اللہ تعالی کا یہی منصوبہ ہے جس کو قرآن میں مستقبل کی پیشین گوئی کے طور پر اِس طرح بیان کیا گیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)

اِس معاملے کی ایک مثال قرآن کی یہ آیت ہے: وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا (50:9) یعنی ہم نے آسمان سے مبارک پانی اتارا۔ قرآن کی اِس آیت میں اُس آفاقی تطہیر کا ذکر ہے جس کو موجودہ زمانے میں ازالہ نمک (desalination) کہا جاتا ہے۔ پانی کا ذخیرہ جو سمندروں میں جمع ہے، اُس میں تحفظاتی مادہ (preservative) کے طور پر تین فی صد نمک ملا ہوا ہے۔ یہ نمکین پانی انسان کے لیے ناقابلِ استعمال ہے۔ یہاں فطرت کے قانون کے مطابق، ایک عظیم آفاقی عمل ہوتا ہے جس کے ذریعے سمندر کا پانی نمک سے الگ ہوکر اوپر فضا میں جاتا ہے اور پھر بارش کی صورت میں خالص پانی زمین کی طرف لوٹتا ہے جس کو انسان اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ قرآن میں، مبارک کے لفظ کی صورت میں اُس کا اشارہ موجود تھا،

لیکن اس کی تفصیل ہزار سال بعد جدید سائنس نے معلوم کی، وغیرہ۔

انطباقی سائنس (applied science) کے ذریعے اسلام کو بہت سے تائیدی ذرائع حاصل ہوئے۔ مثلاً پرنٹنگ پریس اور کمیونکیشن۔ اِن جدید سائنسی دریافتوں کے ذریعے تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ اسلام کی اشاعت کا کام عالمی سطح پر انجام دیا جاسکے۔ اللہ تعالی کو اول دن سے یہ مطلوب تھا کہ دینِ حق کو دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچایا جائے، لیکن جدید ذرائع کے وجود میں آنے سے پہلے اِس کا امکان ہی نہ تھا۔ تاریخ میں پہلی بار یہ امکان جدید انطباقی سائنس کے ذریعے پیدا ہوا ہے۔

عالمی دعوت کا امکان

حدیث میں اسلامی دعوت کے ایک امکان کو اِس طرح بیان کیا گیا ہے: لايبقي على ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام (مسند احمد، رقم الحديث: 24215) یعنی زمین کی سطح پر کوئی گھر ایسا باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہوجائے۔

اِس حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی میں جب کہ اسلام کا ظہور ہوا، اُس وقت سے یہ اسلامی دعوت کا نشانہ تھا کہ اسلام کا کلمہ کرہ ارض پر بسنے والے تمام مردوں اور عورتوں تک پہنچ جائے۔ مگر ایک ہزار سال تک یہ نشانہ عملاً پورا نہ ہوسکا، کیوں کہ اسباب کی اِس دنیا میں اِس نشانے کو پورا کرنے کے لیے عالمی ذرائع درکار تھے، جو کہ پچھلے ادوار میں موجود نہ تھے۔ دورِ جدید میں سائنس نے پہلی بار یہ موافق ذرائع فراہم کیے۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو مذکورہ حدیث کی تشریح اِن الفاظ میں کرنا درست ہوگا کہ — بعد کے زمانے میں ایسا ہوگا کہ اللہ کی توفیق سے ایسے اسباب وجود میں آئیں گے جن کو استعمال کرکے یہ ممکن ہوجائے گا کہ اہلِ ایمان اسلام کے کلمہ کو دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچادیں۔

منفی رائے کا سبب

مغرب اور فکرمغرب کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان منفی رائے پائی جاتی ہے۔ عام طور پر مسلمان مغرب اور فکرمغرب کو اسلام کا دشمن سمجھتے ہیں۔ اِسی بنا پر موجودہ زمانے کے تمام مسلمان اہلِ مغرب سے نفرت کرتے ہیں اور مغربی علم سیکھنے کو ایک ناپسندیدہ فعل قرار دیتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی

یہ رائے حقیقت پر مبنی نہیں ہے، وہ تمام تر متعصّبانہ فکر (biased thinking) کا نتیجہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ جس زمانے میں مغربی علم وجود میں آیا، اُسی زمانے میں ایک اور واقعہ وجود میں آیا جس کو مغربی استعمار (western colonisation) کہا جاتا ہے۔ اِسی زمانے میں مغربی قوموں، خاص طور پر برطانیہ اور فرانس، نے ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں اپنا سیاسی غلبہ قائم کرلیا۔ یہ ممالک اُس وقت مسلم سلطنت کا حصہ تھے۔ اِس سیاسی واقعے نے مسلمانوں کے اندر اہلِ مغرب کے خلاف شدید نفرت پیدا کردی۔ اِس کے بعد جب 1948 میں برطانی حکومت نے فلسطین کی تقسیم کی اور پھر امریکا، عربوں کے مقابلے میں اسرائیل کا حامی بن گیا، تو اِس کے نتیجے میں اہلِ مغرب کے خلاف مسلمانوں کی نفرت اپنی آخری حد پر پہنچ گئی۔ یہ نفرت ابتداءً قومی سطح پر ہوئی اور پھر اِس کے بعد مسلمان ہر اُس چیز سے نفرت کرنے لگے جو مغرب کی طرف سے آئی ہو۔

دو چیزوں میں فرق نہ کرنا

کہا جاتا ہے کہ — نفرت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ یہی واقعہ مغرب کے معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ نفرت کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر جو متعصّبانہ ذہن پیدا ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دو چیزوں میں فرق نہ کرسکے — مغربی علم اور اہلِ مغرب کی عملی کمزوریاں۔ یہ کمزوریاں ہر قوم میں لازماً پیدا ہوتی ہیں، حتی کہ خود مسلمانوں میں بھی۔

اہلِ مغرب کی جدید تاریخ کا ایک حصہ وہ تھا جو سائنسی علم یا عقلی علم (rational knowledge) سے تعلق رکھتا تھا، کیوں کہ اسلام خود پورے معنوں میں ایک عقلی مذہب (rational religion) ہے۔ جدید سائنسی علم کا یہ حصہ پوری طرح اسلام کے موافق تھا۔ اِسی کے ساتھ بشری کمزوری کی بنا پر دو اور ظاہرے وجود میں آئے جو عام طور پر ہر قوم میں وجود میں آتے ہیں — ایک، حقیقتوں کی غلط توجیہہ (misinterpretation) اور دوسرے، آزادی کا غلط استعمال (misuse of freedom)۔ یہ دونوں چیزیں بلاشبہہ قابلِ اعتراض تھیں، مگر وہ اہلِ مغرب کی انسانی کمزوریاں تھیں، وہ خود مغربی سائنس کا حصہ نہ تھیں۔ مگر مسلمان اپنے تعصب کی بنا پر اِس فرق کو سمجھ نہ سکے، وہ غلط توجیہہ یا

آزادی کے غلط استعمال کی طرح خود مغربی سائنس کو بھی منفی نظر سے دیکھنے لگے۔

مثال کے طور پر مغربی دنیا میں برہنگی (nudity) کا کلچر ہے۔ یہ بات بطور واقعہ درست نہیں ہے، مگر اس کا تعلق فکرِ مغرب سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق آزادی کے غلط استعمال سے ہے۔ اللہ تعالی نے امتحان کی مصلحت کی بنا پر انسان کو آزادی دی ہے۔ انسان کو خود اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے یا چاہے تو وہ اس کا درست استعمال کرے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا رہا ہے، اِسی طرح موجودہ زمانے میں بھی۔ البتہ موجودہ زمانے میں ڈگری کے اعتبار سے اس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اِسی طرح مغربی دنیا میں شراب کا رواج بھی آزادی کے غلط استعمال سے تعلق رکھتا ہے۔ خود فکر مغرب سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں، وغیرہ۔

اِس سلسلے میں دوسرا معاملہ غلط توجیہ (misinterpretation) کا ہے۔ موجودہ زمانے میں مغربی دنیا میں کئی نظریات وجود میں آئے۔ مثلاً ڈارون ازم (Darwinism)، فرائڈ ازم (Freudism) اور مارکس ازم (Marxism)، وغیرہ۔ یہ نظریات بلا شبہہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف تھے، مگر یہ نظریات فکر مغرب کا براہِ راست حصہ نہیں ہیں، بلکہ وہ زندگی کی غلط توجیہہ سے وجود میں آئے ہیں۔ ہم کو یقیناً دلائل کی بنیاد پر ان نظریات کی تردید کرنا چاہیے، مگر یہ درست نہیں کہ ہم اِن نظریات کے حوالے سے خود فکر مغرب کو غلط سمجھنے لگیں۔

اِس قسم کی برائی ہر معاشرے میں پائی جاتی ہے، حتی کہ خود مسلم معاشرے میں بھی۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں جن لوگوں نے حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی کو شہید کیا، ان کا کیس یہی تھا کہ انھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔ اِس طرح موجودہ زمانے میں آزاد مسلم ملکوں میں خود مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی آزادی کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے، وہ خود اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ نہیں۔

یہی معاملہ غلط توجیہہ کا ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں خوارج کا جو ظاہرہ پیدا ہوا،

وہ اسلام کی غلط توجیہہ کا نتیجہ تھا۔ اِسی طرح موجودہ زمانے میں اسلام کی سیاسی تعبیر بھی قرآن وحدیث کی غلط توجیہہ کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

عصری ذہن

عام طور پر مسلمان عصری ذہن کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ اس کا سبب وہی ہے جس کو الناس أعداء ما جهلوا کہا جاتا ہے، یعنی بے خبری کی بنا پر کسی کو اپنا دشمن سمجھ لینا۔ عصری ذہن کے بارے میں عادلانہ رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حقیقت پسندانہ ذہن کے تحت اس کا تجزیہ کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے، عصری ذہن کا کیس کیا ہے۔

عصری ذہن کی اصل مغربی ذہن ہے۔ مغربی ذہن یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد پیدا ہونے والے ذہن کا نام ہے۔ اُس دور میں کچھ ایسے افراد یورپ میں اٹھے جنھوں نے فطرت (nature) کا مطالعہ غیر روایتی انداز میں شروع کیا۔ اِس سلسلے میں پہلا نمایاں نام اٹلی کے سائنس داں گلیلیو (وفات: 1642) کا ہے۔ گلیلیو تاریخ کا پہلا شخص ہے جس نے فلکیات کے مطالعے میں دوربین (telescope) کا استعمال کیا۔ یہ 1609 کا واقعہ ہے۔ اُس زمانے میں روایتی تصور یہ تھا کہ زمین مرکز میں ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ گلیلیو نے اپنے دوربینی مشاہدے میں جن حقیقتوں کو دریافت کیا، اُن سے یہ اخذ ہوتا تھا کہ سورج مرکز میں ہے اور زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔

سترھویں صدی کے آغاز میں عام طور پر روایتی طرزِ فکر کا غلبہ تھا۔ اُس وقت گلیلیو کا یہ اعلان ایک دھماکہ خیز واقعہ ثابت ہوا۔ اُس وقت مسیحی چرچ یورپ میں روایتی طرزِ فکر کا نمائندہ تھا۔ مسیحی پوپ کو یورپ کا بے تاج بادشاہ (uncrowned king) سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ مسیحی چرچ اور سائنس دانوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ پیش آیا۔ اِس ٹکراؤ میں سائنس دانوں کو فتح ہوئی۔

مسیحی چرچ کے اختیار کا دائرہ دن بدن سمٹنے لگا، یہاں تک کہ 1929 میں حکومتِ اٹلی اور مسیحی پوپ کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جس کو لیٹران معاہدہ (Lateran Treaty) کہا جاتا ہے۔ اِس معاہدے کے مطابق، مسیحی چرچ اِس پر راضی ہوگیا کہ اس کا دائرہ اختیار روم کے ایک مختصر علاقہ

ویٹکن (Vatican) تک محدود رہے گا جس کا کُل رقبہ صرف 109 ایکڑ ہے۔

اِس طرح تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جس کو سائنس کا دور کہا جاتا ہے۔ اگر اِس واقعے کو مذہبی اصطلاح میں بیان کیا جائے تو اِس دور کو ایمان بالغیب کے بجائے ایمان بالشہود کا دور کہا جائے گا۔ اِس دور میں فطرت کا مطالعہ مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں کیا جانے لگا۔ اِس کے نتیجے میں فطرت کے اندر چھپے ہوئے بے شمار رموز دریافت ہوئے جو اب تک انسان کے لیے غیر دریافت شدہ بنے ہوئے تھے۔ اِس کے نتیجے میں نئی ٹکنالوجی، نئی صنعتیں، نئے ذرائع ووسائل انسان کی دسترس میں آ گئے۔

یہ نئی مسحور کن دنیا تمام تر آبجیکٹیو مطالعہ (objective study) کے ذریعے انسان کی دسترس میں آئی تھی۔ اِس میں مبنی بر وحی مطالعہ کا بظاہر کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ دور بظاہر سائنس دانوں کی تحقیقات کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اِس دور کا ایک عملی نتیجہ یہ تھا کہ قابلِ پیمائش (measurable) کو ناقابلِ پیمایش (non-measurable) سے الگ کر دیا گیا۔ اِس کے نتیجے میں علمی دنیا میں فکر کا وہ طریقہ رائج ہوا جس کو موضوعی طریقِ مطالعہ (objective method of study) کہا جاتا ہے۔ اِس طریقے کی عملی کامیابی کی بنا پر اس کو موجودہ دور میں رواجِ عام حاصل ہو گیا۔

سائنس دانوں نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا کہ اُن کا طریقِ مطالعہ تمام حقائق کو جاننے کے لیے واحد کار آمد طریقہ ہے۔ اِس کے برعکس، انھوں نے کھلے طور پر یہ تسلیم کیا کہ سائنس پورے علم حقیقت کا احاطہ نہیں کرتی، وہ حقیقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

سائنسی طریقِ مطالعہ اپنی عملی کامیابی، نہ کہ نظری صداقت کی بنا پر موجودہ زمانے میں بہت زیادہ عام ہو گیا، حتی کہ فلاسفہ اور مفکرین نے بھی اِسی طرزِ فکر کو اختیار کر لیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جس طرح فطرت (nature) کا مطالعہ موضوعی انداز میں کرتے تھے، اسی طرح وہ مذہب کا مطالعہ بھی موضوعی انداز میں کرنے لگے۔ وہ مذہب کو الہامی ظاہرہ (revealed phenomenon)

تسلیم کرنے کے بجائے، اس کو صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) سمجھنے لگے۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق، پیغمبر اور پیغمبر کے کام کا اُسی طرح تجزیہ کرنے لگے جس طرح وہ مادی چیزوں کا تجزیہ کررہے تھے۔

جدید مفکرین کا یہ طریقہ از روئے حقیقت درست نہ تھا، لیکن اس کا سبب عناد یا سازش نہ تھی، بلکہ وہ اُن کے اختیار کردہ طریقِ مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ یہ طریقہ مذہب کے خلاف تھا، مگر وہ کسی بدنیتی کا نتیجہ نہ تھا۔ وہ بطور خود اِسی کو درست طریقِ مطالعہ سمجھتے تھے۔ سنجیدگی کے ساتھ ان کا یہ یقین تھا کہ یہ طریقہ جس طرح مظاہر فطرت کے مطالعے میں کامیاب ثابت ہوا ہے، اِسی طرح وہ وحی والہام کے مظاہر کے مطالعے میں بھی کامیاب ہوسکتا ہے۔

سائنس دانوں نے جو کام کیا، وہ تائید (support) کے اعتبار سے، اہلِ اسلام کے لیے انتہائی مفید تھا، لیکن مسلم ذہن اپنی منفی سوچ کی بنا پر اِس فرق کو سمجھ نہ سکا۔ انھوں نے نئے دور میں پیدا ہونے والی مغربی تہذیب کو کلی طور پر اسلام دشمنی کا کیس قرار دے دیا، حالاں کہ اگر وہ اِس معاملے میں غیر جانب دارانہ انداز میں اہلِ مغرب کے کیس کو سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ اہلِ مغرب کا کام، خود پیغمبر اسلام کی پیشین گوئی کے مطابق، باعتبار نتیجہ، تائید دین کی حیثیت رکھتا تھا، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے تخریبِ دین کا معاملہ نہ تھا۔

حرفِ آخر

موجودہ زمانے میں اہلِ مغرب کا کنٹری بیوشن (contribution) بہت زیادہ ہے، سیکولر اعتبار سے بھی اور اسلامی اعتبار سے بھی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اہلِ مغرب کی کوششوں سے ایک نئی دنیا وجود میں آئی ہے، جس کو جدید تہذیب (modern civilization) کہا جاتا ہے۔ جدید تہذیب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، منصوبہ خداوندی کا ایک حصہ ہے۔

اللہ تعالی کو یہ مطلوب تھا کہ فطرت (nature) میں چھپے ہوئے قوانین دریافت کیے جائیں۔ فطرت کے تخلیقی امکانات کو انفولڈ (unfold) کیا جائے۔ مادی دنیا میں چھپے ہوئے

آلاء اللہ (wonders of God) کو علمِ انسانی کا حصہ بنایا جائے، تاکہ خدا کا دین روایتی دور سے نکل کر سائنسی دور تک پہنچے، تاکہ خدا کی معرفت کے اعلیٰ پہلو انسان پر کھلیں، تاکہ قرآن کے مخفی 'عجائب' معلوم واقعہ بن جائیں۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کو مطلوب تھا اور مغربی تہذیب کے ذریعے اِسی مطلوبِ الٰہی کی تکمیل ہوئی ہے۔

اِس دنیا میں مثبت پہلو (positive aspects) کے ساتھ ہمیشہ کچھ منفی پہلو (negative aspects) شامل رہتے ہیں۔ اِس کے باوجود اِس کی ضرورت ہوتی ہے کہ تاریخ کی مثبت تعبیر تلاش کی جائے۔ مثال کے طور پر اسلام کے عہدِ اول میں اہلِ ایمان کی پہلی جنریشن کے درمیان خوں ریز لڑائی ہوئی، جو کہ بلاشبہہ ایک منفی واقعہ تھا، مگر اِس منفی واقعے کے باوجود اسلام کے مثبت انقلابی رول کا اعتراف کیا جائے گا۔ اِسی طرح، اہلِ مغرب کے ترقیاتی کارناموں کے ساتھ اگر کچھ منفی پہلو شامل ہیں تو اِس بنا پر ہرگز ایسا کرنا درست نہ ہوگا کہ مسلمان اہلِ مغرب کے بارے میں منفی ذہن کا شکار ہوجائیں اور وہ اہلِ مغرب کے مثبت کارناموں کا اعتراف نہ کریں۔

اِس قسم کا منفی رویہ خود مسلمانوں کی اپنی ذات کے لیے شدید نقصان کی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ اِس قسم کا منفی رویہ حقیقتِ واقعہ کا اعتراف نہ کرنا ہے اور حقیقتِ واقعہ کا اعتراف نہ کرنا بلاشبہہ دنیا کے پہلو سے بھی ہلاکت خیز ہے اور آخرت کے پہلو سے بھی۔

اسلام اور دورِ جدید

تاریخ کے بارے میں اللہ کا ایک منصوبہ قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:
وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (8:39)۔

اِس معاملے کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ نے موجودہ کرۂ ارض کو بنایا اور یہ مقدر کردیا کہ اس کی نعمتیں (blessings) یکساں طور پر تمام انسانوں کو حاصل ہوں (55:10)۔ تاریخ انسانی کی ابتدا میں ایک عرصے تک یہ صورتِ حال قائم رہی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے دنیا میں شخصی حکمرانی کا نظام آ گیا۔ یہ سیاسی کلچر طاقت کے زور پر قائم ہوا اور پھر پوری انسانی تاریخ میں پھیل گیا۔

یہ سیاسی اجارہ داری (political monopoly) اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے خلاف تھی۔ اِس نظام نے انسانی آزادی کو بہت زیادہ محدود کردیا، جب کہ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ انسان پوری طرح آزاد رہے۔ اِس نظام کے تحت یہ ہوا کہ ایک طبقے کو ہر اعتبار سے مراعاتی طبقہ (priveleged class) کا درجہ مل گیا، جب کہ بیش تر لوگ اُس سے محروم رہے۔ اِس نظام نے اپنے تحفظ کے لیے مختلف قسم کی پابندیاں لوگوں پر عائد کردیں۔ انھیں میں سے ایک چیز وہ بھی تھی جس کو مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔

اِس سیاسی نظام کا مطلب یہ تھا کہ اللہ کے پیدا کردہ تمام مواقع پر ایک محدود طبقے کی اجارہ داری قائم ہو اور بیش تر لوگ اِس سے محروم ہوجائیں کہ وہ آزادانہ طور پر وہ کام کرسکیں جو نظامِ تخلیق کے مطابق، اُن سے مطلوب ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔ اُس وقت تک سیاسی اجارہ داری کا یہ نظام لوگوں کے اوپر اپنی گرفت (grip) پوری طرح مضبوط کر چکا تھا۔ یہ صورتِ حال اللہ کے تخلیقی منصوبہ کے سراسر خلاف تھی۔ اِس نظام کے تحت یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ انسانی شخصیت کے فطری امکانات (potentials) انفولڈ (unfold) ہوں، زمین کے فطری امکانات دریافت ہوں اور وہ چیز وجود میں آئے جس کو تہذیب (civilization) کہا جاتا ہے۔

اُس وقت رسول اور اصحابِ رسول کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اِس غیر فطری نظام کا خاتمہ کردیں، تاکہ انسان کے اوپر اللہ کی تمام امکانی سعادتوں کے دروازے کھل سکیں۔ اُس وقت عرب کے پڑوس میں دو بڑی سلطنتیں قائم تھیں — ایک، ساسانی ایمپائر (Sassanid Empire) اور دوسری، بازنطینی ایمپائر (Byzantine Empire)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اِن سلطنتوں کے سربراہوں کے نام خطوط روانہ کیے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے مرحلے میں یہ کوشش کی گئی کہ یہ حکمراں پُرامن فہمائش کے ذریعے اپنی اصلاح کرلیں۔ جب اِن حکمرانوں کے اوپر پُرامن فہمائش کارگر نہیں ہوئی تو اس کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ اِن حکمرانوں کے خلاف فوجی کارروائی کی جائے۔ یہ فوجی کارروائی گویا انسانوں کے ذریعے ایک خدائی آپریشن (divine operation) تھا جو اللہ کی خصوصی مدد کے ذریعے کامل طور پر انجام پایا۔ یہ خدائی آپریشن کسی وقتی مقصد کے لیے نہ تھا۔ اُس کا نشانہ یہ تھا کہ ایک تاریخی نظام کا خاتمہ کرکے دنیا میں دوسرے تاریخی نظام کو وجود میں لایا جائے۔ اِس قسم کا منصوبہ صرف ایک لمبے عمل (long-term process) کے ذریعے بروئے کار لایا جاسکتا تھا، چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

سب سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ ہوا کہ ملکِ عرب میں قبائلی حکمرانی کو ختم کیا گیا۔ اِس کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ایشیا اور فریقہ کے درمیان قائم شدہ دو بڑی سلطنتوں — ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر — کا خاتمہ کیا گیا۔ یہ دونوں واقعات غیر معمولی قربانیوں کے ذریعے پیش آئے۔ یہ تاریخ بشری کا ایک عظیم سیاسی انقلاب تھا جس کا ذکر بائبل میں اِن الفاظ میں آیا ہے — اُس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے:

> He looked and startled the nations. And the everlasting mountains were scattered. (Habakkuk 3:6)

تاہم اللہ تعالی کو تاریخ میں جو نیا دور لانا تھا، اس کے لیے اتنا ہی کافی نہ تھا۔ اِس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ سیاسی اجارہ داری کے نظام کو عالمی سطح پر ختم کردیا جائے۔ منصوبۂ الٰہی کا یہ دوسرا مرحلہ مسلم مجاہدین کے ذریعے انجام پایا۔ جیسا کہ معلوم ہے، اس کے بعد بنوامیہ کے دور اور بنوعباس کے دور اور دوسری مسلم سلطنتوں کے دور میں یہ ہوا کہ دنیا کے تقریباً پورے آباد حصے میں مسلم مجاہدین نے قدیم طرز کے سیاسی نظام کو

توڑ ڈالا۔ اِس عمل کی تکمیل انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں ہوئی۔ اِس زمانے میں بڑے بڑے سیاسی مفکرین (political thinker) پیدا ہوئے۔ مثلاً روسو، وغیرہ۔ اِن لوگوں نے قدیم زمانے کے جابر حکمرانوں (despotic kings) کے خلاف طاقت ور کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں چھپ کر پورے یورپ میں پھیل گئیں۔ اِس کے بعد عملی انقلاب کے لیے بڑی بڑی سیاسی تحریکیں اٹھیں۔ اِس کی تکمیل 1879 میں ہوئی، جب کہ وہ تاریخی واقعہ پیش آیا جس کو فرنچ انقلاب (French Revolution) کہا جاتا ہے۔ اِس کے بعد قدیم طرز کا بادشاہی نظام عملاً ختم ہوگیا اور دنیا میں بڑے پیمانے پر جمہوری نظام قائم ہوگیا۔

سائنس کا دور

قدیم بادشاہی نظام میں آزادانہ سوچ کا ماحول موجود نہ تھا۔ بادشاہ ہر نئی فکر کو کچل دیتے تھے۔ مثال کے طور پر رومن ایمپائر تقریباً دو ہزار سال تک قائم رہا۔ مگر اِس طویل مدت میں کوئی سائنسی دریافت نہ ہوسکی۔ موجودہ زمانے میں جمہوریت کا دور آیا تو انسان کو مکمل معنوں میں فکری آزادی حاصل ہوگئی۔ اب فطرت (nature) میں آزادانہ تحقیق کا عمل شروع ہوگیا۔ اِس کے نتیجے میں فطرت میں چھپے ہوئے قوانین دریافت ہونے لگے، یہاں تک کہ وہ دور پیدا ہوگیا جس کو جدید سائنسی دور کہا جاتا ہے۔

جدید سائنس کے دو پہلو ہیں — نظری سائنس (theoratical science) اور انطباقی سائنس (applied science)۔ نظری سائنس میں تحقیقات کے ذریعے عالم فطرت کے اُن مخفی قوانین کا ایک حصہ دریافت ہوا جس کو قرآن میں آیات اللہ (sign of God) کہا گیا ہے۔ اِن قوانین کی دریافت کا یہ عظیم فائدہ ہوا کہ دینِ خداوندی کے معتقدات مسلّمہ انسانی علم کی بنیاد پر ثابت شدہ بن گئے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''مذہب اور جدید چیلنج)

سیکولرزم کا نظریہ

قدیم سیاسی نظام میں بادشاہ کو مطلق اختیار حاصل ہوتا تھا۔ جدید جمہوریت میں اِس کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس کے بعد حالات کے تحت ایک نیا نظریہ پیدا ہوا جس کو سیکولرزم کہا جاتا ہے۔ سیکولرازم کا مطلب لادینیت نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ملکی انتظام کے سوا

دوسرے امور میں اسٹیٹ کا رویہ عدم مداخلت (non-interference) کا ہوگا۔

یہ ایک دوررس انقلابی واقعہ تھا جو تاریخ میں پہلی بار پیش آیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے تمام غیر سیاسی شعبے مثلاً مذہب، تعلیم، اقتصادیات، وغیرہ حکومت کی گرفت سے آزاد ہوگئے۔ اب لوگوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اِن غیر سیاسی شعبوں میں آزادانہ طور پر اپنے منصوبے کی تکمیل کرسکیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے بلاشبہ یہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ یہ گویا سنتِ حدیبیہ کا عالمی احیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فائدہ اِس طرح حاصل ہوا تھا کہ آپ کو فریقِ ثانی کی تمام شرطوں کو یک طرفہ طور پر ماننا پڑا تھا۔ موجودہ زمانے میں حدیبیہ جیسے فائدے مزید اضافے کے ساتھ غیر مشروط طور پر حاصل ہوگئے ہیں۔ اب اگر کوئی شرط ہے تو وہ صرف یہ کہ اہلِ ایمان کسی کے خلاف تشدد (violence) نہ کریں۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی شرط نہیں، کیوں کہ اہلِ ایمان اپنے عقیدے کے تحت پہلے ہی سے تشدد کو قابلِ ترک قرار دئے ہوئے ہیں۔

جدید ٹکنالوجی

انطباقی سائنس کے ذریعے موجودہ زمانے میں انسان کو ایک عظیم نعمت حاصل ہوئی ہے، یعنی جدید ٹکنالوجی۔ جدید ٹکنالوجی کے بے شمار فائدے ہیں۔ یہ فائدے عملاً تمام انسانوں کے لیے عام ہیں، لیکن اہلِ ایمان کے لیے وہ ہزاروں گنا زیادہ بڑے فائدے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اہلِ ایمان اِس ٹکنالوجی کی مدد سے اپنی دنیا کی بھی پر امن تعمیر کرسکتے ہیں، اسی کے ساتھ وہ تعلیم دین اور دعوت الی اللہ کے کام میں اِس ٹکنالوجی کو استعمال کرسکتے ہیں اور اِس طرح وہ اُس ربانی کام کو انجام دے سکتے ہیں جو اُن کے لیے آخرت کی ابدی سعادتوں کا دروازہ کھولنے والا ہے۔

اقوامِ متحدہ

قدیم زمانے میں انسانی آبادی مختلف الگ الگ حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اُس وقت وہ وسائل موجود نہ تھے جس کے ذریعے یہ ممکن ہو کہ دنیا کے تمام انسانوں کی عالمی تنظیم قائم کی جاسکے۔ موجودہ زمانے میں نئے حالات نے ساری دنیا کو ایک گلوبل ولیج (global village) کی حیثیت دے دی ہے۔

اب زمین کے ایک کونے میں بسنے والا انسان زمین کے دوسرے کونے میں بسنے والے انسان سے کامل طور پر مربوط ہے۔ حالات کے اِس نئے تقاضے کے تحت 1920 میں ایک عالمی تنظیم قائم ہوئی جس کا نام لیگ آف نیشنس (League of Nations) تھا۔ اِس کے بعد 1945 میں زیادہ بڑے پیمانے پر ایک اور عالمی تنظیم قائم ہوئی جس کا نام اقوامِ متحدہ ہے۔ اقوامِ متحدہ اپنے مختلف اداروں کے ساتھ اب ایک مستحکم عالمی تنظیم بن چکی ہے اور اس میں دنیا کے تمام ممالک شامل ہیں جن کی تعداد تقریباً دوسو ہے۔

اقوامِ متحدہ موجودہ زمانے میں ایک بین اقوامی نعمت (international blessing) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بہت سے اجتماعی فائدے ہیں۔ مثلاً موجودہ زمانے میں اقوامِ متحدہ کے عالمی پلیٹ فارم کی بنا پر تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں نے باقاعدہ طور پر اور سرکاری طور پر یہ تسلیم کرلیا کہ ان کے شہریوں کو مکمل معنوں میں مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ آزادی کے اِس حق کے ذریعے موجودہ زمانے میں کام کے ایسے مواقع (opportunities) کے دروازے کھل گئے ہیں جو اِس سے پہلے پوری تاریخ میں انسان کے اوپر یکسر بند پڑے ہوئے تھے۔

اقوامِ متحدہ کے ذریعے حاصل ہونے والے انسانی حقوق بلاشبہہ ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس نعمت سے بے خبر صرف وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو اپنی قومی خواہشوں میں جیتے ہوں اور اُس کو خود ساختہ طور پر معیار کا درجہ دئے ہوئے ہوں۔

خلاصہ کلام

موجودہ زمانے میں دنیا کے نظام میں جو دور رس تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، وہ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے لائے جانے والے انقلاب کا منتہا (culmination) ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے عرب اور اطراف عرب میں جو انقلاب آیا، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک تاریخی انفجار (historical explosion) کے ہم معنی تھا۔

یہ اللہ کا ایک منصوبہ تھا جس کے ذریعے تاریخ میں ایک نیا عمل (process) شروع ہوا۔ یہ عمل مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بیسویں صدی عیسوی میں اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔ اِس انقلاب کا

مقصد دنیا میں کوئی معیاری نظام (ideal system) قائم کرنا نہ تھا، بلکہ یہ تھا کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، انسان کی آزادی کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے دنیا میں ایسا ماحول قائم کیا جائے جس میں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہر چیز ہر انسان کے لیے ہوجائے۔

اِسی کے ساتھ دینی نقطۂ نظر سے یہ مطلوب تھا کہ اہلِ ایمان کے لیے ایک طرف یہ ممکن ہوجائے کہ وہ کھلے طور پر اعلیٰ معرفت کے درجات طے کرسکیں اور اِسی کے ساتھ اُن کو اِس بات کی کامل آزادی حاصل ہو کہ وہ دعوت الی اللہ کے پرامن کام کو آخری حد تک انجام دے سکیں۔

یہ تمام مطلوب فائدے موجودہ زمانے میں کامل طور پر حاصل ہوگئے ہیں۔ اب انسان کے اوپر حصولِ معرفت کے بھی تمام دروازے کھل چکے ہیں اور دعوتی عمل کے تمام مواقع بھی۔ یہ کام اتنے بڑے پیمانے پر ہوا ہے کہ یہ کہنا کسی مبالغے کے بغیر درست ہے کہ — دورِ جدید اسلام کا دور ہے۔ اکیسویں صدی میں قرآن کی وہ پیشین گوئی آخری حد تک پوری ہوچکی ہے جو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی تھی: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (48:28) یعنی اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ اُس کو تمام دینوں پر غالب کردے، اور اللہ کافی گواہ ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں وقتی اعتبار سے کسی سیاسی واقعے کا ذکر نہیں ہے، اِس میں اللہ کے ایک تاریخی منصوبے کا ذکر ہے جس کو ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہونا تھا اور پھر لمبے عمل کے بعد اپنی تکمیل تک پہنچنا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی میں یہ خدائی منصوبہ اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔ اب اہلِ ایمان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اِن عالمی مواقع کو جانیں اور ان کو بھرپور طور پر استعمال (avail) کریں۔

مغربی تہذیب، مغربی کلچر

مغربی تہذیب اور مغربی کلچر دونوں ایک دوسرے سے اُسی طرح الگ ہیں جس طرح اسلام اور مسلمانوں کی قومی تاریخ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایک شخص اگر ایسا کرے کہ وہ صرف مسلم تاریخ کو پڑھے اور اُسی سے اسلام کے متعلق رائے قائم کرے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کا مذہب نام ہے — باہمی لڑائی، خاندانی حکومت، ملک گیری، فرقہ بندی، عسکریت اور خودکش بم باری جیسی چیزوں کا۔ مگر یہ تاثر سرتاسر غلط ہوگا، کیوں کہ یہ چیزیں بلاشبہہ مسلم تاریخ کا حصہ ہیں، لیکن وہ ہرگز مذہب اسلام کا حصہ نہیں۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو مسلمانوں کی قومی تاریخ سے الگ کرکے دیکھا جائے، ورنہ آدمی اسلام کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

یہی معاملہ مغربی تہذیب اور مغربی کلچر کا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ مغربی تہذیب اصلاً سائنسی تہذیب، بالفاظِ دیگر، قوانینِ فطرت کی دریافت کا نام ہے۔ اِس دریافت کے نتیجے میں جو نظام وجود میں آیا، اُسی کا نام مغربی تہذیب ہے۔ دوسری چیز مغربی اقوام ہیں۔ مغربی اقوام کو اُسی طرح آزادی ملی ہوئی ہے جس طرح دوسری قوموں کو آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ بھی اُسی طرح خواہشات کا شکار ہوتی ہیں جس طرح دوسری قومیں خواہشات کا شکار ہوتی ہیں۔ ان کے درمیان بھی اُسی طرح ایک قومی سیاست وجود میں آتی ہے جس طرح دوسرے گروہوں کے درمیان ان کی قومی سیاست وجود میں آتی ہے۔ اِن اسباب کی بنا پر مغربی قوموں کے درمیان بھی وہ تمام خرابیاں پیدا ہوئیں جو دوسری قوموں میں پیدا ہوئیں، حتی کہ خود مسلم قوموں کے درمیان بھی۔ عدل کا تقاضا ہے کہ ہم دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھیں۔ اِس قسم کی عادلانہ تفکیر کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہم اِس غلطی سے بچ جائیں گے کہ ہم اہلِ مغرب کی قومی خرابیوں کو سائنسی تہذیب کا حصہ سمجھ لیں اور مغربی اقوام اور سائنسی تہذیب دونوں کے بارے میں یکساں طور پر منفی ذہن کا شکار ہوجائیں۔ یہ عین وہی منصفانہ طریقِ مطالعہ ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے ذیل میں کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی قومی خرابیوں کو

الگ کر کے اسلام کو اس کی نظریاتی حیثیت میں دیکھا جاتا ہے۔ اس طریقِ مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والے کے سامنے اسلام کی بھی درست تصویر آتی ہے اور مسلم قوم کی بھی درست تصویر۔

مغربی تہذیب بمعنی سائنسی تہذیب، اسلام کی دشمن نہیں، بلکہ وہ اسلام کے لیے ایک عظیم مددگار کی حیثیت رکھتی ہے۔ مغربی تہذیب بمعنی سائنسی تہذیب کے ذریعے موجودہ زمانے میں بہت سی نئ حقیقتیں سامنے آئی ہیں۔ اِن حقیقتوں کے ذریعے سائنس نے فیصلے کی ایک نئ بنیاد فراہم کی ہے جو عین ہمارے حق میں ہے۔ مثال کے طور پر سائنسی طریقِ مطالعہ کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ کوئی چیز مقدس (holy) نہیں، ہر چیز علمی تنقیح (scientific scrutiny) کے تابع ہے۔ اِس اصول کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی تاریخ میں ایک نیا شعبہ علم وجود میں آیا جس کو تنقید عالیہ (higher criticism) کہا جاتا ہے۔ اِس شعبہ علم کے تحت قدیم مذہبی کتابوں، خصوصاً بائبل کا، تنقیدی مطالعہ کیا جانے لگا، جب کہ یہ کتابیں پہلے تنقید سے بالاتر سمجھی جاتی تھیں۔ اِس مطالعے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالص علمی اعتبار سے، یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کتابیں تاریخی اعتباریت (historical credibility) سے خالی ہیں۔ اِس سلسلے میں مغربی زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں سے ایک کتاب یہ ہے:

Albert Schweitzer, *The Quest of the Historical Jesus,*
Published 1910, London

اِسی طرح، سائنسی تہذیب نے ایک نیا فکر پیدا کیا جس کو مبنی برقطعیت فکر (exact thinking) کہا جاتا ہے۔ اِس فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ سبجیکٹیو طرزِ فکر (subjective thinking) غیر معقول قرار پا گیا اور آبجیکٹیو طرزِ فکر (objective thinking) کو درست سمجھا جانے لگا۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ وہ کتابیں غیر معتبر قرار پا گئیں جو صلیبی جنگوں کے بعد اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے غیر علمی انداز میں لکھی گئی تھیں۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل کتاب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

On Heroes, Hero-Worship (1841) by Thomas Carlyle

اِسی طرح، سائنسی تہذیب کے تحت فطرت کا جو مطالعہ شروع کیا گیا، اس کے نتیجے میں فطرت کے بہت سے راز دریافت ہوئے۔ رموزِ فطرت کی یہ دریافت اپنی حقیقت کے اعتبار سے،

آیات اللہ (signs of God) کے انکشاف کے ہم معنی تھی۔ اِن دریافتوں کے نتیجے میں یہ ممکن ہوگیا کہ اسلام کی صداقتوں کو وقت کے مسلّمہ علمی معیار کی سطح پر ثابت شدہ بنایا جاسکے۔ اِس سلسلے میں ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب— مذہب اور جدید چیلنج جو عربی میں 'الإسلام یتحدی' کے نام سے چھپی ہے۔ اِس کتاب کا انگریزی ایڈیشن گاڈ ارائزیز (*God Arises*) کے نام سے چھپ چکا ہے۔

اِسی طرح مغربی تہذیب کے تحت دنیا میں اور کئی چیزیں وجود میں آئیں جو علمی طور پر مفید ہونے کے علاوہ، خود اسلام کے لیے بے حد مفید تھیں۔ مثلاً فکری آزادی، مذہبی تنگ نظری کا خاتمہ، جمہوریت کا عالمی فروغ، عالمی سیاحت (world tourism)، جس کا مطلب یہ تھا کہ مدعو خود داعی کے پاس بڑی تعداد میں پہنچنے لگا، وغیرہ۔ اِسی طرح مغربی تہذیب کے تحت ایک دور وجود میں آیا جس کو دورِ مواصلات کہا جاتا ہے۔ اِس کے تحت پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا جیسی چیزیں وجود میں آئیں جو اسلام کی دعوت واشاعت کے اعتبار سے، بلاشبہہ ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مغربی تہذیب کے تحت موجودہ زمانے میں اِس طرح کی بہت سی مفید چیزیں وجود میں آئی ہیں۔ چوں کہ مغربی قومیں اور دوسری قومیں بھی اِن چیزوں کا اپنے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہیں، اس لیے مسلمان اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے، مگر اِس دنیا میں خود اللہ تعالی نے ہر عورت اور مرد کو آزادی عطا کی ہے۔ اِس دنیا کے جو فطری وسائل (means) ہیں، اُن کو ہر ایک اپنے حق میں استعمال کرتا ہے۔ اِسی طرح تہذیبی وسائل کو بھی ہر گروہ اپنے اپنے حق میں استعمال کرے گا۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اِس معاملے میں خدائی منصوبے کو سمجھیں اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کریں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ سورج صرف مسلم بستیوں میں چمکے اور غیر مسلم بستیوں میں اندھیرا چھایا رہے، اِسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ فطرت میں چھپی ہوئی نعمتوں کو مسلمان تو اپنے حق میں استعمال کریں اور غیر مسلم ان کو اپنے حق میں استعمال کرنے سے محروم رہیں۔

مغربی تہذیب کا مسئلہ

امت مسلمہ کی تاریخ میں بہت سے ایسے مسئلے پیش آئے جن کو فتنہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً باطنیت کا فتنہ،

وحدتِ وجود کا فتنہ، انکارِ حدیث کا فتنہ، قادیانیت کا فتنہ، وغیرہ- تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی ماضی میں اِس قسم کا کوئی فتنہ پیدا ہوا تو بہت سے علما اٹھے جنھوں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں اس کا بھرپور رد کیا- اس کے بعد یہ ہوا کہ بہت سے مسلمان جوان فتنوں سے متاثر ہوئے تھے، انھوں نے ان سے توبہ کی اور وہ امت مسلمہ کی مین اسٹریم (mainstream) میں شامل ہوگئے- تاریخ مزید بتاتی ہے کہ اِن موقعوں پر ایسا نہیں ہوا کہ ایک فتنہ دوبارہ ایک نئے فتنے کی شکل اختیار کرلے، یعنی جو لوگ ان فتنوں سے ذہنی طور پر متاثر ہوئے تھے، انھوں نے اپنی اصلاح کرلی اور اربابِ فتنہ سے الگ ہوکر وہ اسلامی زندگی گزارنے لگے-

موجودہ زمانے میں بھی اِسی قسم کا ایک ''فتنہ'' پیش آیا- یہ مغربی تہذیب کا فتنہ تھا- یہ فتنہ ابتدائی طور پر یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد شروع ہوا اور بیسویں صدی عیسوی میں اپنے عروج پر پہنچ گیا- اُس وقت بہت سے عرب اور غیر عرب مصلحین پیدا ہوئے جنھوں نے مغربی تہذیب کے خلاف زبان وقلم کے ذریعے جہاد شروع کیا- یہ جہاد بظاہر کامیاب رہا- بہت سے مسلم نوجوان جو مغربی تہذیب سے متاثر ہوئے تھے، وہ اس سے تائب ہوگئے-

اِس کامیابی کا عمومی طور پر اعتراف کیا گیا- حتی کہ ان مصلحین میں سے کئی افراد ایسے تھے جن کو بڑے بڑے القاب دئے گئے- مثلاً مفکرِ اسلام، معمارِ ملت، عہد ساز شخصیت، مجدّدِ دوراں، وغیرہ- مگر واقعات بتاتے ہیں کہ قدیم فتنوں کے مقابلے میں جدید فتنے کا معاملہ اپنے حقیقی نتیجہ (result) کے لحاظ سے بالکل مختلف ثابت ہوا، یعنی بظاہر نظری سطح پر خاتمہ کے نتیجے کے اعتبار سے وہ دوبارہ مزید اِضافے کے ساتھ زندہ ہوگیا- اِن مصلحین نے مسلمانوں کی جدید نسلوں کو یہ باور کرایا تھا کہ — مغربی تہذیب زہریلے پھل کا ایک درخت ہے- جدید تہذیب ایک مسلم دشمن تہذیب ہے- مغربی تہذیب کے تحت پیدا شدہ تعلیمی ادارے قتل گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں- مسلمانوں کا تعلق مغربی تہذیب سے بائیکاٹ کا ہونا چاہئے، نہ کہ اس سے تعاون کا-

ابتدائی طور پر مسلم نوجوانوں پر بظاہر ان باتوں کا اثر ہوا- مسلم نوجوان مغربی تہذیب کے

علم برداروں سے لڑنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کے تحت قائم شدہ تعلیمی اداروں کو چھوڑ دیا، انھوں نے مغربی اداروں میں جاب لینے سے انکار کر دیا، وغیرہ۔ مگر بعد کو آسمان نے یہ منظر دیکھا کہ انھیں مسلم نوجوانوں نے بڑے پیمانے پر یوٹرن (U turn) لیا۔ انھوں نے اور ان کی اولاد نے مغربی تہذیب کے تحت قائم شدہ اداروں میں ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ مغربی تہذیب کے اداروں کے کارکن بن گئے۔ وہ بہت بڑی تعداد میں مسلم ملکوں سے ہجرت کر کے مغربی ملکوں میں پہنچ گئے اور وہاں سٹل (settle) ہونے پر فخر کرنے لگے۔

قدیم فتنوں اور جدید تہذیب کے فتنہ میں نتیجہ (result) کے اعتبار سے یہ فرق کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قدیم طرز کے فتنے صرف اعتقادی فتنے تھے، مگر مغربی تہذیب کا معاملہ یہ تھا کہ دنیا کی مادی ترقی سے وہ براہِ راست جڑا ہوا تھا۔ مغربی تہذیب کے علم برداروں نے جو نئی دنیا بنائی، وہ مادی اعتبار سے ایک نہایت شاندار دنیا تھی۔ اس کے مکانات، اس کے شہر، اس کے دفاتر، اس کی سواریاں، اس کے سامانِ حیات، ہر چیز نہایت اعلیٰ معیار کی تھی۔ اِسی حقیقت کو موجودہ زمانے کے ایک مسلم شاعر نے طنزیہ انداز میں اس طرح بیان کیا تھا:

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے　　واں کنسٹر سب بلوری ہیں، یاں ایک پرانا مٹکا ہے

انسان اپنی نفسیات کے اعتبار سے ہمیشہ ترقی کا طالب ہوتا ہے۔ وہ اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے زیادہ ترقی یافتہ مستقبل دیکھنا چاہتا ہے۔ مغربی تہذیب میں یہ پہلو نہایت اعلیٰ درجے میں موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم مفکرین کی خلافِ مغرب مہم ابتداءً نظری طور پر کامیاب ہو کر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے مکمل طور پر ناکام ہوگئی۔ مسلم نوجوان ابتدائی طور پر رومانوی جذبات کے تحت جدید تہذیب کے خلاف ہوگئے، مگر بعد کو جب انھوں نے دیکھا کہ ساری ترقیاں مغربی تہذیب اور مغربی علوم سے وابستہ ہیں، تو وہ سب کچھ بھول کر اس کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ جن تعلیمی اداروں کو قتل گاہ سمجھ کر انھوں نے وقتی طور پر چھوڑ دیا تھا، وہ دوبارہ اُسی میں داخل ہوئے اور انھوں نے وہاں سے ڈگریاں حاصل کیں۔ جن مغربی قوموں کو انھوں نے مسلم دشمن قرار دیا، انھیں کے اداروں میں جاب لینے کو وہ اپنے لئے قابلِ فخر سمجھنے لگے۔

اُن کے بزرگوں نے جن مغربی ملکوں سے ہجرت کا فتوی دیا تھا، انھیں ملکوں میں واپس جا کر وہ پُرفخر طور پر آباد ہونے لگے، وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے دو حصے تھے — ایک، اس کی سائنس اور دوسرے، اس کا کلچر۔ مغربی سائنس حقائقِ فطرت کے انکشاف پر مبنی تھی۔ اُس کے اندر ذاتی طور پر غلطی کا کوئی پہلو شامل نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی سائنس، قرآن کی اِس آیت کی انفولڈنگ تھی: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45:13)۔ وہ قرآن کے الفاظ میں: وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ کا ٹکنالوجکل اظہار تھا۔ وہ آفاق وانفس کی آیات کی وہ تبیین تھی جس کی پیشگی اطلاع قرآن (41:53) میں دے دی گئی تھی۔

مغربی تہذیب کا دوسرا پہلو اس کا کلچر تھا۔ یہ کلچر براہِ راست طور پر سائنس کی پیداوار نہ تھا، بلکہ وہ قومی اور سماجی عوامل کی پیداوار تھا۔ قومی اور سماجی دائرے میں خالق نے ہر انسان کو آزادی دی ہے۔ اِس دائرے میں انسان کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی ملی ہوئی آزادی کا صحیح استعمال کرے یا وہ اس کا غلط استعمال کرے۔ مغربی کلچر کے جن پہلوؤں کو لے کر ہمارے علما نے اُس کے خلاف ہنگامہ آرائی کی، وہ دراصل آزادی کے غلط استعمال (misuse of freedom) کا نتیجہ تھا، نہ کہ حقیقۃً مغربی سائنس کا نتیجہ۔ اِس معاملے میں ہمارے مفکرین کو اصولِ تمیز (principle of differentiation) کو منطبق کرنا تھا، مگر وہ ایسا نہ کرسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امت کے افراد ایک فتنے کے استیصال کے نام پر ایک شدید تر فتنے کا شکار ہوگئے، یعنی دہرا پن۔ اس کا مزید نقصان یہ ہوا کہ وہ مغربی تہذیب کے پیدا کردہ مثبت مواقع کے استعمال سے محروم ہو کر رہ گئے۔

ماڈرن ایج اور اسلام

ماڈرن ایج (modern age) اور اسلام کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ماڈرن ایج نے نظریہ اور عمل کے سارے ڈھانچے کو بدل دیا ہے، اِس لیے اب ضرورت ہے کہ اسلام پر نظر ثانی کی جائے۔ اِس نقطۂ نظر کا ایک نمونہ اے اے اے فیضی (وفات: 1981) کی کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اِس کتاب کا ٹائٹل یہ ہے:

A Modern Approach to Islam

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ماڈرن ایج کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اسلام کو موجودہ زمانے میں سیاسی غلبہ حاصل نہیں ہے، اِس بنا پر سارے مسئلے پیدا ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اسلام کو پھر سے عالمی سطح پر سیاسی غلبے کے مقام تک پہنچایا جائے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب وغیرہ کا نقطۂ نظر یہی تھا۔ اِس نقطۂ نظر کے حامل افراد کا ماننا یہ ہے کہ مسلّح جہاد کے ذریعے اسلام کو دوبارہ غلبہ عطا کیا جائے، اور ساری دنیا میں خلافت کا نظام قائم کیا جائے۔ میرے نزدیک اِس قسم کی تمام باتیں اصل مسئلے کی نسبت سے غیر متعلق (irrelevant) ہیں۔ اِس معاملے میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ماڈرن ایج کو سمجھا جائے اور تجزیاتی مطالعے کے ذریعے اُس کے مقابلے میں اسلام کا موقف متعین کیا جائے۔ اِس کام میں ہمارے لیے رہ نما اصول، حدیث کے مطابق، یہ ہونا چاہیے کہ: **خُذ ما صَفا وَدَع ما كدر**۔ یعنی جو چیز حق کے مطابق ہو، اُس کو لے لو اور جو چیز حق کے مطابق نہ ہو اُس کو چھوڑ دو۔

میں نے اپنے مطالعے سے یہ سمجھا ہے کہ ماڈرن ایج بنیادی طور پر تین چیزوں کا نام ہے — (1) جدید سائنسی دریافتیں (2) جدید کلچر (3) جدید فلسفیانہ افکار۔ اب میں اِن تینوں کے بارے میں مختصر طور پر اپنا حاصلِ مطالعہ بیان کروں گا۔

1- جدید سائنسی دریافتیں کیا ہیں۔ وہ اصلاً مغربی تہذیب یا سیکولر تہذیب کا حصہ نہیں، وہ فطرت میں چھپے ہوئے قوانین کی دریافت ہیں۔ یہ قوانین خالقِ کائنات کے مقرر کردہ ہیں، یعنی اُسی

خدا کے مقرر کردہ جس نے قرآن کی صورت میں اپنا کلام بھیجا ہے۔ اِن سائنسی دریافتوں کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں، بلکہ وہ قرآن کی اِس آیت کا مصداق ہیں: سنُریهم اٰیاتِنا فی الآفاق وفی أنفسهم حتّیٰ یتبین لهم أنه الحق (41:53)

قدیم زمانے میں انسانی افکار پر توہمات کا غلبہ تھا۔ توہماتی عقائد یا قصے کہانیوں کے تحت ہر معاملے میں لوگوں نے بے بنیاد رائیں بنالی تھیں۔ سائنس نے جدید طریقے پر تحقیق کر کے چیزوں کی اصل حقیقت معلوم کی۔ اِن دریافت کردہ حقائق کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔

مثال کے طور پر قدیم زمانے میں پانی کو صرف سیّال برف سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں سائنس نے دریافت کیا کہ پانی دوگیسوں کے مجموعے سے بنتا ہے۔ پانی کا فارمولا یہ ہے (H_2O)۔ اِس دریافت کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ وہ اتنا ہی زیادہ اسلامی ہے جتنا کہ وہ سائنسی ہے۔ اِسی طرح شمسی نظام کے بارے میں پہلے زمین مرکزی (geo-centric) نظریہ رائج تھا۔ کوپرنکس کے زمانے میں جدید آلات کی مدد سے جو مطالعہ کیا گیا، اُس سے یہ ثابت ہوا کہ شمسی نظام زمین مرکزی نہیں ہے بلکہ وہ آفتاب مرکزی (heleo-centric) ہے۔ یعنی آفتاب مرکز میں ہے اور زمین اور دوسرے سیّارے اُس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس نظریے کا بھی اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ یہ نظریہ بھی اتنا ہی اسلامی ہے جتنا کہ وہ سائنسی ہے۔

یہی معاملہ سائنس کی اُن تمام دریافتوں کا ہے جو ثابت شدہ بن چکی ہیں۔ یہ تمام کی تمام دریافتیں خالقِ کائنات کے قانون کی دریافتیں ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ خالقِ کائنات کے تدبیرِ امر کی تفصیل ہیں (13:2)۔ کچھ لوگ اِس معاملے میں إسلامیّة المعرفة (Islamization of knowledge) کی بات کرتے ہیں، یعنی علم کو اسلامی بنانا۔ مگر جہاں تک قطعی علوم (exact sciences) کی بات ہے، اِس قسم کا نعرہ بالکل غیر متعلق ہے۔ کیوں کہ قطعی علوم میں اسلامائزیشن کا کوئی مطلب نہیں۔

2- دوسرا پہلو وہ ہے جو جدید کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید مغربی کلچر دو قسم کی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک وہ جو فطرت کے اصول پر مبنی ہے، اِس بنا پر وہ اسلام کے لیے بھی پوری طرح قابلِ قبول ہے۔

اِس کلچر کا دوسرا حصہ وہ ہے جو ذہنی بے راہ روی کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، اِس بنا پر وہ اسلام کے لیے قابلِ قبول نہیں۔

مثال کے طور پر جدید مغربی کلچر میں انسانی احترام کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ اِس بنا پر اُن کے یہاں نہایت اعلیٰ روایات قائم ہوئی ہیں۔ مثلاً ہر انسان کے لیے اظہار خیال کی کامل آزادی ہونا۔ ہر انسان کو خالص جوہر (merit) کی بنیاد پر مقام ملنا۔ تنقید (dissent) کو انسان کا غیر مشروط حق قرار دینا۔ محروم (disabled) افراد کو ہر اعتبار سے برابر کا درجہ عطا کرنا، وغیرہ۔ یہ قدریں (values) اسلام میں موجود تھیں، لیکن مغربی کلچر کا یہ کارنامہ ہے کہ اُس نے اِن قدروں کو باقاعدہ انسٹی ٹیوشن کا درجہ دے دیا۔ اِس قسم کی چیزیں اسلام میں بھی اتنا ہی اہم ہیں جتنا کہ وہ جدید تہذیب میں اہم سمجھی جاتی ہیں۔

البتہ جدید کلچر میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً عورتوں کے لیے عریانیت (nudity)، بے پردگی کا فیشن، باقاعدہ نکاح سے قبل لڑکوں اور لڑکیوں کا آزادانہ اختلاط، شراب کا عمومی رواج، انٹرٹین منٹ کا بے قید کلچر، وغیرہ۔ اس قسم کی تمام چیزیں اسلام کے مزاج کے خلاف ہیں۔ اِس لیے وہ کبھی بھی اسلام کے دائرے میں قبول نہیں کی جاسکتیں۔

3- تیسرا پہلو جدید دور کے فلسفیانہ افکار سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ زمانے میں فلسفہ اور افکار کے تحت کچھ نئے نظریات وجود میں آئے ہیں جن کو سائنسی افکار کہا جاتا ہے، مگر حقیقت میں اُن کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔ زیادہ صحیح الفاظ میں ان کو سائنس کی غلط توجیہہ وتعبیر کہا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر موجودہ زمانے میں سائنسی غور وفکر کے ذریعے معلوم ہوا کہ کائنات میں اسباب وعلل کا نظام ہے۔ اِس کو اہلِ سائنس کے درمیان قانونِ تعلیل (principle of causation) کہا جاتا ہے۔ اِس کو لے کر کچھ سیکولر ذہن کے لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ سائنس کی اِس تحقیق نے خدا کے وجود کی نفی کردی ہے۔ انھوں نے کہا کہ واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہوسکتے:

If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

یہ سائنس کے نام پر صرف ایک فلسفیانہ مغالطہ ہے، کیوں کہ نیچر کی دریافت صرف خدا کے طریقِ کار کی دریافت ہے، وہ کسی بھی اعتبار سے خدا کے وجود کی نفی نہیں۔ اِس فکر کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے اپنی کتاب مذہب اور جدید چیلنج (*God Arises*) میں لکھا ہے کہ — نیچر کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لیے ایک توجیہہ کی طالب ہے:

Nature does not explain, she herself is in need of an explanation.

یہی معاملہ عضویاتی ارتقا (organic evolution) کا ہے۔ سیکولر مفکرین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عضویاتی ارتقا کا نظریہ ایک سائنٹفک نظریہ ہے۔ چوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں خصوصی تخلیق کا تصور ہے، جب کہ عضویاتی ارتقا کا نظریہ مفروضہ ارتقائی پراسس کو خدا کا درجہ دے رہا ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ارتقا کے نظریے نے خدا کے تصور کی نفی کر دی ہے۔

مگر یہ سرتاسر بے بنیاد بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عضویاتی ارتقا کا نظریہ صرف ایک مفروضہ ہے، وہ کوئی حقیقی نظریہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ تحقیقات کے دوران یہ معلوم ہوا کہ زندگی کی بے شمار انواع جو زمین میں پائی جاتی ہیں، اُن کے اندر جسمانی مشابہت ہے۔ اِس مشابہت کو لے کر یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ ایک زندہ نوع سے دوسری نوع نکلی۔ مثلاً بکری ارتقا کرتے کرتے زرافہ بن گئی، یا بلی نے ارتقا کرتے کرتے شیر کی صورت اختیار کر لی، وغیرہ۔

اس نظریے کی بنیادی کمی یہ ہے کہ اُس نے انواع کے درمیان مشابہت کا ثبوت تو پیش کیا، لیکن وہ اِس کا کوئی بھی ثبوت پیش نہ کر سکا کہ ایک نوع کے بطن سے دوسری نوع برآمد ہوگئی۔ یہ نظریہ اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا بے بنیاد یہ کہنا کہ بیل گاڑی کے اندر سے بگھی نکل آئی، بگھی کے اندر سے موٹر کار برآمد ہوگئی، موٹر کار کے اندر سے ہوائی جہاز نکل آیا اور ہوائی جہاز کے اندر سے راکٹ پیدا ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عضویاتی ارتقا کا نظریہ ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ وہ نہ کوئی سائنٹفک نظریہ ہے اور نہ اُس کی وجہ سے اسلام کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہوا۔

میرے مطالعے کے مطابق، ماڈرن ایج مکمل طور پر ایک موافقِ اسلام ایج ہے۔ اصل یہ ہے کہ

خدا نے انسان کے لیے اِس دنیا میں دو سپورٹ سسٹم بنائے ہیں۔ ایک نیچرل سپورٹ سسٹم جو یکساں طور پر مسلسل صورت میں انسان کا مددگار بنا ہوا ہے۔ دوسرا، سویلائزیشنل سپورٹ سسٹم جو انسان کے ذریعے ارتقائی سفر طے کرتا ہوا انسان کا مددگار بنا ہوا ہے۔ نیچرل سپورٹ سسٹم براہِ راست طور پر خدا کی طرف سے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں سویلائزیشن سپورٹ سسٹم انسانی عمل اور انسانی تحقیق کے ذریعے اپنا تہذیبی سفر طے کر رہا ہے۔ ماڈرن ایج دراصل اِسی سویلائزیشن سپورٹ کا ایک اگلا مرحلہ ہے۔ وہ اِس لیے ظاہر ہوا ہے کہ انسان کے سفرِ حیات کو زیادہ کامیاب بنائے۔ یہ ماڈرن ایج انسان کے مادّی سفر میں بھی مددگار ہے اور انسان کے مذہبی اور روحانی سفر میں بھی۔

اِس دنیا کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر چیز میں مثبت کے ساتھ کچھ منفی پہلو بھی ملا ہوا ہوتا ہے۔ اِس قانونِ عام کے تحت، ماڈرن ایج میں بھی مثبت پہلو کے ساتھ کچھ منفی پہلو شامل ہے۔ بعض اسباب سے یہ حادثہ پیش آیا کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہ نماؤں سے ماڈرن ایج کا مثبت پہلو اوجھل ہو گیا۔ انھوں نے بس اُس کے منفی پہلو کو دیکھا اور وہ اُس کو دیکھ کر بھڑک اٹھے۔ اِس معاملے میں شدید طور پر دوبارہ جائزہ (reassessment) کی ضرورت ہے۔ اگر منصفانہ طور پر جائزہ لیا جائے تو یقیناً لوگ یہ معلوم کرلیں گے کہ ماڈرن ایج ایک اسلام دوست ایج (Islam-friendly age) ہے، نہ کہ اسلام دشمن ایج۔

یہ صحیح ہے کہ ماڈرن ایج کو پیدا کرنے میں تمام تر غیر مسلم قوموں نے کام کیا ہے۔ مگر حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنّ اللّٰہ لَیُؤیّد ھٰذا الدین بالرّجل الفاجر (صحیح البخاری، کتاب الجہاد، جلد 6، صفحہ 208)۔ اِس روایت میں اِس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ سویلائزیشنل سپورٹ کو ظہور میں لانے میں ہر آدمی کا کچھ نہ کچھ رول ہوگا۔ اِس میں صالح لوگ بھی اپنا رول ادا کریں گے اور اس کے ساتھ غیر صالح لوگ بھی۔ تاریخ اِس کی تصدیق کرتی ہے۔ مثلاً کمیونکیشن ایج جو دعوت الی اللہ کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے، اُس کو ظہور میں لانے کے لیے ہر طرح کے لوگوں نے لمبی مدت تک مسلسل کام کیا ہے۔ اس کے بعد ہی کمیونکیشن ایج واقعہ بن سکا۔

سائنس ایک موافقِ اسلام انقلاب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں ہوئی۔ آپ سے پہلے جو پیغمبر آئے، ان کو معجزے دیے گئے۔ یہ معجزات پیغمبروں کی اعتباریت (credibility) پر یقین کرنے کے لیے تصدیقِ مزید کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اُن کے معاصرین نے اِن معجزات کو جادو کہہ کر اُنھیں نظر انداز کردیا۔

اِس کا سبب کیا تھا۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ یہ معجزہ مدعو کو ایک شخص کا ذاتی کرشمہ نظر آیا، وہ مدعو کے دائرہ علم کے مطابق، فریقین کے درمیان ایک متفقہ بنیاد کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اِس اعتبار سے گویا کہ پیغمبر اپنے معاصرین کے نزدیک صرف ایک دعویٰ (claim) کرنے والا انسان تھا، اس کے دعوے کو خود اپنی معلوم بنیاد پر جانچے کی کوئی صورت اِن معاصرین کے پاس موجود نہ تھی۔

خدا یہ چاہتا تھا کہ مدعو کے لیے اِس قسم کا عذر پیش کرنے کا موقع نہ رہے۔ چناں چہ خدا نے چاہا کہ داعی اور مدعو کے درمیان وہ ایک مسلمہ بنیاد کو وجود میں لائے۔ یہی وہ خدائی منصوبہ تھا جس کو پیشین گوئی کے طور پر قرآن کی سورہ حم السجدہ میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے — مستقبل میں ہم اپنی نشانیاں ان کو دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر کامل طور پر کھل جائے کہ یہ (قرآن) حق ہے (41:53)۔

قرآن کی اِس آیت میں جن نشانیوں کے ظہور کی پیشین گوئی کی گئی تھی، وہ انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی میں پوری طرح وجود میں آچکی ہیں۔ موجودہ زمانے کے سائنسی انقلاب کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے اِن نشانیوں کو پوری طرح ظاہر کردیا ہے۔ یہ سائنسی شہادتیں دوبارہ دعوت الی اللہ کے حق میں تصدیقِ مزید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ موجودہ سائنسی انقلاب کے بعد تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان مشترک طور پر ایک مسلّمہ بنیاد (bilaterally accepted ground) وجود میں آچکی ہے، جس کو استعمال کرکے حق کی دعوت کو زیادہ موثر طور پر انجام دیا جاسکے۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ مصر میں آئے۔ انھوں نے وقت کے بادشاہ فرعون (Pharoah) کو توحید کا پیغام دیا۔ فرعون نے اُس کا مذاق اڑاتے ہوئے اپنے وزیر اعظم ہامان سے کہا کہ میرے لیے ایک اونچا مینار بناؤ، تاکہ میں اُس پر چڑھ کر دیکھوں کہ موسیٰ کا خدا کہاں ہے (40:36-37)۔ اِسی طرح نکیتا خروشچیف (Nikita Khrushchev) سابق سوویت یونین کے وزیر اعظم تھے۔ سوویت یونین نے 1957 میں پہلی بار اپنا مصنوعی سیارہ (Sputnik) زمین سے اوپر بھیجا۔ اس نے خلا میں پہنچ کر چاند کے گرد چکر لگائے اور چاند کے فوٹو لیے، اور پھر واپس زمین پر اتر آیا۔ اِس کے بعد روسی وزیر اعظم نے مذہب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا ہمارا سیارہ خلا میں گیا، لیکن اس کو وہاں نہ خدا دکھائی دیا اور نہ خدا کی جنت۔

اِس قسم کی بات کو رد کرنے کے لیے پہلے کوئی سائنٹفک بنیاد موجود نہ تھی، مگر اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اب ایک داعیِ حق کہہ سکتا ہے کہ کائنات کو دیکھنا انسان کے لیے اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ ممکن ہی نہیں۔ جدید محققین کے مطابق، انتہائی وسیع کائنات میں جو مادّہ ہے، اس کا صرف 4 فی صد حصہ ہمارے لیے قابلِ مشاہدہ (observable) ہے۔ بقیہ 96 فی صد حصہ اپنی موجودہ استعداد کے لحاظ سے ہمارے لیے قابلِ مشاہدہ نہیں، حتی کہ انتہائی طاقت ور دوربینوں کے ذریعہ بھی نہیں۔ اِسی لیے اس کو ڈارک میٹر (dark matter) کہا جاتا ہے، یعنی انسان کی نسبت سے ناقابل مشاہدہ میٹر۔

خلا کے بارے میں اِس سائنسی دریافت نے موجودہ زمانے کے داعیِ حق کو ایک نئے استدلال کی بنیاد فراہم کی ہے، وہ یہ کہ انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ خدا اور جنت کے بارے میں صرف بالواسطہ علم تک پہنچ سکتا ہے۔ اِس معاملے میں براہِ راست علم کا حصول انسان جیسی مخلوق کے لیے سرے سے ممکن ہی نہیں۔

قرآن کی سورہ حٰم السجدہ میں جو پیشین گوئی کی گئی تھی، اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اِن سائنسی دریافتوں نے موجودہ زمانے میں معرفتِ خداوندی کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ سائنس کیا ہے۔ سائنس نیچر کے مطالعے کا نام ہے، اور نیچر مصنوعاتِ خداوندی کا نام ہے۔ اِس معاملے میں انسان صانع کو براہِ راست

نہیں دیکھتا، البتہ وہ مصنوعات میں غور وفکر کرکے صانع کا اندازہ کرسکتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی میں سائنسی دریافتوں کے ظہور میں آنے سے پہلے، نیچر کے بارے میں انسان کا علم بہت محدود تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ انسان مصنوعاتِ خداوندی کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ ایسی حالت میں وہ صانع کی عظمت کا تصور بھی نہیں کر پاتا تھا۔ اہلِ سائنس نے تاریخ میں پہلی بار مصنوعاتِ خداوندی کا گہرا مطالعہ کیا۔ انھوں نے دوربین اور خوردبین جیسے بہت سے طریقے ایجاد کیے، جن کے ذریعے وہ مصنوعاتِ خداوندی کا مطالعہ زیادہ گہرائی کے ساتھ کرسکیں۔ یہ مطالعہ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissence) کے بعد کئی سو سال تک جاری رہا۔

اِس طرح سائنسی دریافتوں کے بعد پہلی بار ایک نیا امکان پیدا ہوا، یعنی انسان کا فریم ورک جو پہلے روایتی دور میں محدود تھا، وہ لامحدود حد تک وسیع ہوگیا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ انسان، کائنات کا وسیع تر مطالعہ کرکے زیادہ اعلیٰ درجے کی معرفت حاصل کرسکے۔ آدمی ہمیشہ اپنے فریم ورک کے دائرے میں سوچتا ہے (17: 84)۔ چناں چہ سائنسی فریم ورک نے پہلی بار انسان کے لیے اِس بات کو ممکن بنایا کہ وہ خالقِ کائنات کے بارے میں لامحدود حد تک وسیع سائنسی فریم ورک کے تحت سوچے اور معرفتِ اعلیٰ کے درجے تک پہنچ سکے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی لٹریری تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عظمتِ محمدی پر مسلم اہلِ قلم نے بہت سی کتابیں لکھیں، مگر عظمتِ خداوندی پر غالباً وہ کوئی ایک کتاب بھی نہ لکھ سکے۔ کیوں کہ عظمتِ محمدی کو جاننے کے لیے اُن کے پاس ایک عظیم تاریخ موجود تھی۔ یہ تاریخ اتنی شاندار تھی کہ غیر مسلم مورخین تک کو یہ ماننا پڑا کہ محمد نے جو عظیم تاریخ پیدا کی، ویسی تاریخ کوئی دوسرا انسان پیدا نہ کرسکا۔

مگر عظمتِ خداوندی کا معاملہ ایک مختلف معاملہ تھا۔ خدا کی ہستی ہمارے لیے ایک نا قابلِ مشاہدہ ہستی تھی۔ اِس لیے براہِ راست خدا کو دیکھ کر اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ خدا کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک ہی قابلِ عمل صورت تھی، وہ یہ کہ خدا کی عظمت کو اس کی تخلیق میں دیکھا جائے، یعنی نا قابلِ مشاہدہ صانع کی عظمت کا اندازہ اس کی قابلِ مشاہدہ مصنوعات کے ذریعہ کیا جائے

لیکن سائنس سے پہلے انسان کو مصنوعاتِ خداوندی کا تفصیلی علم حاصل نہ تھا۔ اِس محدود فریم ورک کی بنا پر اِس دور میں خدا زیادہ تر ایک پُراسرار عقیدہ (mysterious belief) کا مسئلہ بنا رہا، نہ کہ اتھاہ عظمت وجلال کا مسئلہ، جیسا کہ فی الواقع وہ ہے۔

قبل سائنس دور میں مسلم اہلِ قلم نے جو کتابیں لکھیں، ان میں غالباً ایک ہی قابلِ ذکر کتاب ہے جس کا ٹائٹل بظاہر خدا کو بنایا گیا ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ الدہلوی (وفات: 1762) کی کتاب ہے۔ اِس کتاب کا نام حجة اللّٰه البالغة ہے۔ اِس کتاب کے ٹائٹل سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب خدا کی عظمت پر لکھی گئی ہے، لیکن اِس کتاب کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اِس کتاب کا موضوع حجۃ الفقہ ہے، نہ کہ حجۃ اللہ۔ مصنف کے الفاظ میں یہ کتاب اسرارِ شریعت کے موضوع پر ہے، نہ کہ خدا کی عظمت کے موضوع پر۔ خلاصہ یہ کہ جدید سائنسی انقلاب ایک موافقِ اسلام انقلاب ہے۔ جدید سائنسی مطالعے کے ذریعے فطرت کی جو حقیقتیں دریافت ہوئی ہیں، وہ بیک وقت دو پہلوؤں سے اسلام کے لیے ایک عظیم تائید کی حیثیت رکھتی ہیں:

1 - فطرت کے بارے میں سائنسی دریافتوں کے ذریعے معرفت کے اعلیٰ دروازے کھلے ہیں۔ انسان کے لیے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ وہ تخلیق میں خالق کی عظیم نشانیوں کو جانے اور خالق کی ناقابلِ بیان عظمت کو محسوس کر سکے۔

2 - سائنسی دریافتوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے دعوتِ حق کے لیے ایک نیا زیادہ موثر امکان پیدا کر دیا ہے، وہ یہ کہ دعوت الی اللہ کے کام کو خود مدعو کے مسلّمات کی بنیاد پر کیا جا سکے۔ یہ ایک ایسا دعوتی امکان ہے جو تاریخ میں پہلی بار ظاہر ہوا ہے۔

اظہارِ دین

اللہ کا ایک خصوصی منصوبہ قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا (48:28) یعنی اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ اُس کو تمام ادیان پر غالب کردے اور اللہ کافی گواہ ہے۔ یہ آیت قرآن کی تین سورتوں میں آئی ہے۔ ایک سورہ میں مزید یہ الفاظ آئے ہیں: وَیَاۡبَی اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَهٗ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ (9:32)۔

قرآن کی اِس آیت میں 'ہدیٰ' سے مراد آئڈیالوجی (divine ideology) ہے اور 'دین' سے مراد اِس آئڈیالوجی پر مبنی طریقِ زندگی (way of life) ہے۔ اللہ نے ہر دور میں پیغمبروں کے ذریعے ہدایت اور دین بھیجا، لیکن اس کے بعد انسان اُس میں تبدیلی کرتا رہا، یہاں تک کہ دینِ خداوندی کا اصل ورزن (original version) باقی نہیں رہا، بلکہ دینِ خداوندی کے نام پر ایک خود ساختہ انسانی ورزن وجود میں آ گیا۔ اس کے بعد اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ابدی طور پر دینِ خداندی کا صحیح ورزن وجود میں آئے اور اس کو تاریخ میں پوری طرح محفوظ کردیا جائے۔

تمام ادیان پر اظہارِ دین کا مطلب کسی قسم کا سیاسی غلبہ نہیں ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ دینِ خداوندی کی تصویر بے آمیز صورت میں انسان کے سامنے آجائے۔ اِسی طرح اتمامِ نور کا مطلب بھی کسی سیاسی نظام کا نفاذ نہیں، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدائی دین کی تصویر کو بگاڑنا چاہتا ہے، مگر اللہ کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ وہ خدائی دین کو اس کی اصل صورت میں محفوظ کردے۔ اللہ نے انسان کو مکمل آزادی عطا کی ہے۔ اللہ نے اپنی سنت کے مطابق، انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے حفاظتِ دین کے اِس منصوبے کو انجام دیا۔

فکری بنیاد کی اہمیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں ہوا۔ آپ کو یہ موقع

ملا کہ آپ صحابہ کی صورت میں ایک طاقت ور ٹیم بنائیں ۔اِس طرح آپ نے اور آپ کے اصحاب نے غیر معمولی محنت کے ذریعے وہ کام انجام دیا جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں اظہارِ دین کہا گیا ہے، یعنی خدا کے دین کو اس کی اصل صورت میں مبرہن کر دینا۔مگر یہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔لوگوں کے درمیان اِس کی قبولیت کے لیے ضروری تھا کہ اس کے لیے موافق فکری بنیاد (intellectual base) موجود ہو۔ہزاروں سال کے مذہبی بگاڑ کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان یہ موافق فکری بنیاد موجود نہ تھی، اِس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے اپنے زمانے میں کامیابی کے ساتھ دینِ خداوندی کو اس کی اصل صورت میں قائم کیا،مگر ایک محدود مدت کے بعد خود امتِ مسلمہ کے درمیان مذہب کا قدیم تصور واپس آ گیا۔یہ محدود مدت امت کی ابتدائی تین نسلوں تک باقی رہی۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو ایک حدیث رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إن الناس دخلوا في دين الله أفواجاً وسيخرجون منه أفواجاً (مسند أحمد: 243/3) یعنی لوگ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہوئے اور عن قریب وہ فوج در فوج خدا کے دین سے نکل جائیں گے۔اِس حدیث رسول میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے، وہ محدود طور پر صرف مکہ یا عرب کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ وہ پوری تاریخ کے بارے میں ہے۔اصل یہ ہے کہ اسلام نے دینِ خداوندی کی جو تصویر پیش کی تھی، وہ ایک انقلابی تصویر تھی۔اُس زمانے میں مذہب کے بارے میں جو عمومی شاکلہ پایا جاتا تھا، وہ اس کے مطابق نہ تھا۔اس لیے ابتدائی تین نسلوں کے بعد قدیم مذہبی شاکلہ عملاً دوبارہ لوگوں کے درمیان واپس آ گیا۔دوبارہ ایسا ہوا کہ خدا کا دین اپنی اصل صورت کے بجائے ایک بدلی ہوئی صورت پر قائم ہو گیا۔اسلام کا نام اور اسلام کی اصطلاحیں ضرور باقی رہیں،لیکن اسلام کی حقیقت تقریباً غیر موجود ہوگئی۔یہی مطلب ہے اُس حدیث رسول کا جس میں بتایا گیا ہے کہ بعد کے زمانے میں اسلام کا صرف نام باقی رہے گا اور قرآن کا صرف رسم الخط (لا يبقى من الإسلام إلا اسمه، ولا يبقى من القرآن إلا رسمه)۔

چند مثالیں

اسلام سے پہلے خدا کا عقیدہ ایک رسمی قسم کا مبنی بر قلب (heart-based) عقیدہ تھا،

اسلام نے خدا کے عقیدہ کو ایک زندہ شعور کے طور پر مبنی بر ذہن (mind-based) عقیدے کی حیثیت سے زندہ کیا، لیکن وقت کا عمومی شاکلہ اِس کے موافق نہ تھا، اِس لیے بہت جلد ایسا ہوا کہ مسلمانوں کے درمیان خدا کا عقیدہ زندہ عقلی شعور کے طور پر باقی نہ رہا۔ وہ دوبارہ مبنی بر قلب قسم کا رسمی عقیدہ بن کر رہ گیا۔

اسلام سے پہلے ہر مذہب میں عبادت کا تصور موجود تھا، لیکن ان کی عبادت محض ایک مبنی بر فارم عمل بنی ہوئی تھی۔ اسلام نے دوبارہ عبادت کو مبنی بر اسپرٹ (spirit-based) عبادت کی حیثیت سے زندہ کیا، لیکن چند نسلوں کے بعد دوبارہ قدیم مزاج واپس آ گیا اور خدا کی عبادت محض کچھ رسمی اعمال کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ یہی معاملہ پیغمبر کے عقیدہ (رسالت) کا بھی تھا۔ پچھلی امتوں نے بعد کے زمانے میں اپنے پیغمبروں کو اتنا زیادہ بڑھایا کہ خدا اور پیغمبر میں صرف نام کا فرق باقی رہا۔ یہی وہ برائی ہے جس کو پیغمبر اسلام نے پیشگی طور پر اِن الفاظ میں بیان فرمایا تھا: لا تطرونی کما أطرت النصاری عیسی بن مریم (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3445)

بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے درمیان فضیلت کے نام پر ایسے عقیدے رائج ہوئے جس کے بعد عملاً پیغمبر اسلام کی تصویر بھی وہی بن گئی جو پچھلی امتوں کے یہاں رائج تھی، یعنی خدا اور پیغمبر کے درمیان صرف نام کا فرق باقی رہا۔

اِسی طرح پچھلے مذاہب میں مقدس جنگ (holy war) کا تصور تھا۔ اسلام نے اِس تصور کو ختم کیا۔ اسلام میں قتال اور جہاد کو ایک دوسرے الگ کر دیا گیا۔ قتال صرف دفاعی جنگ کے لیے مخصوص ہو گیا اور جہاد کو پر امن دعوتی جدوجہد (25:52) کے ہم معنی قرار دیا گیا۔ لیکن بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے درمیان قتال کو جہاد کا عنوان دے دیا گیا۔ اِس طرح مقدس جنگ کا تصور مسلمانوں کے درمیان دوبارہ لوٹ آیا۔

اِسی طرح اسلام میں اجتماعی نظام کو شوریٰ (42:38) کے تابع کیا گیا تھا، یعنی کسی خارجی معیار کے بجائے لوگوں کی عمومی رائے کی بنیاد پر اجتماعی نظام کا فیصلہ کرنا۔ لیکن بعد کے زمانے میں

قدیم خاندانی حکمرانی (dynasty) کا طریقہ واپس آ گیا۔ شخصی حکمرانی کا یہ ذہن بعد کے زمانے کے مسلمانوں پر اتنا زیادہ غالب ہوا کہ اگر کسی مسلم ملک میں بظاہر جمہوریت کو اختیار کیا گیا تو وہ بھی عملاً آمریت (dictatorship) بن کر رہ گئی۔

اِسی طرح اسلام میں قدیم تصور کے برعکس، مذہبی آزادی کو اختیار کیا گیا، لیکن چند نسلوں کے بعد عملاً اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اِس کے مظاہر آج بھی مسلمانوں کے اندر مختلف صورتوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً فرقہ وارانہ تشدد، تکفیر کے فتوے، مرتد اور شاتمِ رسول کے لیے سزائے قتل، وغیرہ۔ اِس قسم کے تمام مظاہر بلاشبہہ قدیم زمانے کے مذہبی جبر کی نئی صورتیں ہیں۔

متوازی عمل

امتِ مسلمہ کے بعد کے دور میں یہ تمام خرابیاں اِس لیے پیدا ہوئیں کہ اسلام کی انقلابی اصلاحات کے حق میں فکری بنیاد موجود نہ تھی۔ اسلام نے مذہب کو دوبارہ اس کی اصل خدائی صورت میں زندہ کیا، لیکن زمانی عامل (age factor) اِن اصلاحات کے موافق نہ تھا۔ قانونِ فطرت کے مطابق، فکری بنیاد اچانک وجود میں نہیں آتی، بلکہ وہ لمبے تدریجی عمل کے بعد وجود میں آتی ہے۔ یہ نہایت مشکل منصوبہ ہے، کیوں کہ انسانی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے اس کو وجود میں لانا پڑتا ہے۔ اِس لیے اللہ نے اِس منصوبے کو ظہور میں لانے کے لیے تاریخ میں ایک متوازی عمل (parallel process) جاری کیا۔ فکری بنیاد کو ظہور میں لانے کا یہ متوازی عمل تقریباً ہزار سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ وہ بیسویں صدی عیسوی میں اپنی تکمیل تک پہنچا۔ اِس عمل کا آغاز پیغمبر اور اُن کے اَتباع (followers) نے کیا اور آخر کار اس کی تکمیل ہزار سال بعد اہلِ مغرب کے ذریعے انجام پائی۔

استبدالِ قوم

قرآن میں فطرت کے جو قوانین بتائے گئے ہیں، اُن میں سے ایک قانون وہ ہے جس کو استبدال (replacement) کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (47:38) یعنی اگر تم پھر جاؤ تو اللہ

تمھاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے:

If you turn back, He will bring in your place another people, who will not be like you.

استبدالِ قوم کا یہ قانون فطرت کا ایک عمومی قانون ہے۔اس کا تعلق مذہبی قوم سے بھی ہے اور غیر مذہبی قوم سے بھی۔ اسلام کی انقلابی اصلاحات کے لیے جس فکری بنیاد کی ضرورت تھی، اس کو مسلمان پورے طور پر وجود میں نہ لا سکے۔ مسلمان بعد کے زمانے میں قدیم مذہبی تصورات کے زیر اثر آ چکے تھے۔ اِس بنا پر وہ اس مقصد کے لیے اہل نہ تھے۔ چناں چہ اللہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ اِس متوازی رول کا ذریعہ وہ ایک ایسی قوم کو بنائے جو اِس عمل کو اس کی تکمیل تک پہنچا سکے۔

اہلِ مغرب کا تائیدی رول

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی کے طور پر یہ بات بتا دی تھی کہ اللہ تعالی ایک سیکولر قوم سے دین کی تائید کا کام لے گا (إن اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر)۔ اہل مغرب کی تاریخ کا غیر جانب دارانہ مطالعہ بتاتا ہے کہ اہلِ مغرب نے جو تہذیب برپا کی اور جس کو مغربی تہذیب کہا جاتا ہے، وہ سیکولر مغرب کے ذریعے اِسی تائید دین کی مثال ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کے ذریعے جو نئے علوم اور نئے حالات پیدا ہوئے، وہ اپنے عملی نتیجے کے اعتبار سے، اسلام کے حق میں فکری بنیاد فراہم کرنے والے تھے، تاکہ رسول اور اصحابِ رسول کا جاری کردہ عمل اپنے تکمیلی مرحلے تک پہنچ سکے۔ اس تکمیلی عمل کے چند پہلو یہاں بیان کیے جاتے ہیں:

1۔ جدید تہذیب کے تحت جو میڈیکل سائنس وجود میں آئی، اس نے تاریخ میں پہلی بار اُس نظریے کو ختم کردیا جس کو سوچنے والا دل (thinking heart) کہا جاتا تھا۔ اب یہ پوری طرح ثابت ہوگیا ہے کہ دل انسانی جسم میں صرف گردشِ خون (circulation of blood) کا ذریعہ ہے۔ اِس معاملے میں جدید میڈیکل سائنس یہاں تک پہنچی ہے کہ اُس نے مصنوعی دل (artificial heart)

تیار کیا۔ ایسے مریض جن کے دل عملاً نان فنکشنل (non-functional) ہونے والے تھے، اُن کے جسم میں ڈاکٹروں نے مصنوعی دل نصب کر دیا۔ یہ مصنوعی دل عملاً فطری دل کا بدل بن گیا۔ ایسے مریضوں کا دل عملاً معطل تھا، اُن کے جسم میں دل کی جگہ ایک مادی ڈیوائس (material device) نصب کیا گیا، اس کے باوجود اُن کا دماغ پہلے کی طرح کام کر رہا تھا۔ اُن کا حافظہ، اُن کے سوچنے کی صلاحیت، کسی کمی کے بغیر، پہلے کی طرح برقرار تھی۔ اِس طرح تجرباتی طور پر ثابت ہو گیا کہ تفکیر کے عمل (thinking process) کا تعلق انسان کے دل سے نہیں ہے، بلکہ اس کے دماغ سے ہے۔

یہ ایک بہت بڑا واقعہ ہے جس سے قدیم زمانے کا انسان مکمل طور پر بے خبر تھا۔ اسلام میں معرفت کو قدیم تصور کے برعکس، دل کے بجائے دماغ پر مبنی قرار دیا گیا۔ قرآن میں دماغ (mind) کے لیے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً قلب، فواد، عقل، لُب، حجر، نُہی۔ واضح ہو کہ قلب کا لفظ عربی زبان میں عقل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے (لسان العرب: 687/1)۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں اِس سلسلے میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ سب تفکیری عضو (thinking organ) کے معنی میں ہیں، قرآن میں گردشِ خون کے ذریعے کے طور پر کسی عضو کا ذکر نہیں۔ پچھلے ہزار سال کے دوران مسلمانوں میں فکری ارتقا نہ ہو سکا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان فکری عمل کا سرچشمہ غلط طور پر دل کو قرار دیے ہوئے تھے۔ جدید دریافت نے یہ راستہ کھول دیا ہے کہ مسلمانوں میں فکری ارتقا کا عمل حقیقی سطح پر جاری ہو سکے۔

قدیم زمانے میں تمام مذاہب میں معرفت حق (realization of truth) کا منبع (source) دل کو سمجھا جاتا تھا۔ اِس لیے قدیم زمانے میں مراقبہ (meditation) کے طریقے رائج ہوئے، مگر اِن طریقوں کے ذریعے قدیم زمانے کے لوگوں کو کبھی حقیقی معنوں میں معرفتِ حق کا تجربہ نہیں ہوا، کیوں کہ دل صرف گردشِ خون کا ذریعہ تھا۔ معرفت صرف تفکیر اور تدبر کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے، جس کا مرکز انسان کا دماغ ہے۔ دل سے اِس کا کوئی تعلق نہیں۔

رسول اور اصحابِ رسول کے مختصر زمانے کے بعد خود امتِ مسلمہ میں یہی دل پر مبنی تصورِ معرفت دوبارہ لوٹ آیا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ہزار سال کے دوران امتِ مسلمہ حقیقی معرفت سے تقریباً محروم رہی۔

موجودہ زمانے میں جدید میڈیکل سائنس کے ذریعے جو نیا دور آیا، اُس نے پہلی بار یہ کیا کہ دل پر مبنی معرفت کے افسانہ (myth) کو ختم کردیا۔ اب تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوگیا کہ مبنی بر ذہن (mind-based) معرفت کو ڈیولپ کیا جائے اور معرفت الٰہی کے اعلیٰ درجات تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اِس اعتبار سے، جدید میڈیکل سائنس قدیم نظریے کی تصحیح کی حیثیت رکھتی ہے۔

2۔ قدیم زمانے میں ساری دنیا میں مطلق العنان بادشاہت (despotism) کا طریقہ رائج تھا۔ اِس سیاسی کلچر کے تحت ساری دنیا میں مذہبی جبر کا کلچر عام تھا۔ جدید مغربی تہذیب کے تحت پہلی بار ایسا ہوا کہ دنیا میں جمہوریت کا زمانہ آیا۔ جمہوریت ایک اعتبار سے، سیاسی طاقت کی عدم مرکزیت (decentralization) کا کلچر ہے۔ اِس کلچر کے تحت مذہب کے معاملے کو سیاسی اقتدار سے الگ کردیا گیا۔ اِس طرح تاریخ میں پہلی بار مذہبی آزادی کو ایک مسلّمہ بین اقوامی اصول (international norm) کے طور پر مان لیا گیا اور اقوامِ متحدہ (UNO) کے تحت تمام قوموں نے اس کی متفقہ تصدیق کردی۔ اسلام ایک دعوتی مشن ہے اور اسلام کے دعوتی مشن کی عالمی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ دنیا میں مذہبی آزادی کو ایک مسلّمہ بین اقوامی اصول کے طور پر مان لیا گیا ہو۔ یہ واقعہ پہلی بار مغربی تہذیب کے دور میں کامل طور پر انجام پایا ہے۔

3۔ قدیم زمانے میں مذہب کی بنیاد صرف عقیدہ (belief) ہوا کرتا تھا۔ انسان ایک عقلی وجود (rational being) ہے۔ ضرورت تھی کہ انسان کو ایسا مذہب دیا جائے جو اس کے عقلی ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔ لیکن اِس مقصد کے لیے عقلی ڈیٹا (rational data) درکار تھا جو کہ قدیم زمانے میں دستیاب نہ تھا۔ مغربی تہذیب کے تحت پیدا ہونے والی سائنس نے فطرت (nature) میں تحقیق کے ذریعے یہ عقلی ڈیٹا فراہم کیا۔ اِس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ دینِ خداوندی کے عقائد کو عقلی بنیاد (rational ground) پر قابلِ فہم (understandable) بنایا جاسکے۔ اِس حقیقت کا اعلان قرآن مجید میں پیشگی طور پر اِن الفاظ میں کیا گیا تھا: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔

قرآن کی اِس آیت میں 'آفاق اور انفس' سے مراد تمام وہ مادی اور غیر مادی تخلیقات ہیں جو وسیع کائنات میں پائی جاتی ہیں۔ اِس پورے مجموعے کو فطرت (nature) کہا جاتا ہے۔ فطرت کی اِس دنیا میں بے شمار ربانی نشانیاں (signs of God) موجود تھیں۔ ضرورت تھی کہ اِن نشانیوں کو دریافت کیا جائے، تاکہ امرِ حق خود انسانی مسلّمات کی بنیاد پر مدلل ہو سکے۔ خدائی نشانیوں کی انفولڈنگ کا یہ کام ہزاروں سال سے نہیں ہوا تھا۔ موجودہ زمانے میں مغربی تہذیب نے پہلی بار سائنسی تحقیقات کے ذریعے اِن نشانیوں کو کھولا اور اُن کو انسان کے لیے ایک معلوم واقعہ بنایا۔ یہ موافق دلائل فطرت (nature) میں آیاتِ الٰہی کے طور پر موجود تھے، وہ مخفی حالت میں تھے۔ مغربی سائنس نے قوانینِ فطرت کے نام سے جن حقائق کو دریافت کیا ہے، وہ دراصل یہی دلائل ہیں۔ اِس کے بعد یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کے علمِ کلام (theology) کو قیاسات کے بجائے برہانیات کی بنیاد پر قائم کی جائے۔

4۔ قرآن ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اترا۔ اُس وقت قرآن میں یہ کہا گیا تھا کہ: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (25:1)۔ اِس آیت کے مطابق، یہ مطلوب تھا کہ قرآن کی تعلیمات کو زمین پر بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ مگر قدیم زمانے میں عملاً ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ اِس عالمی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پوری دنیا کا جغرافیہ معلوم ہو۔ پرنٹنگ پریس اور کمیونکیشن کا دور دنیا میں آجائے، ساری دنیا میں بہ آسانی سفر کرنا ممکن ہو جائے، لوگوں کے درمیان کھلا پن (openness) کی فضا موجود ہو، ترقی یافتہ زبانیں دنیا میں پائی جاتی ہوں، وغیرہ۔

عالمی دعوت کو ممکن بنانے کے لیے یہ تمام چیزیں لازمی طور پر ضروری ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ اسباب موجود نہ تھے، اِس لیے قدیم زمانے میں اسلام کی عالمی اشاعت کا یہ نشانہ عملاً پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ انیسویں صدی کے بعد کے زمانے میں پہلی بار یہ اسباب حاصل ہوئے ہیں اور اِن اسباب کا حصول براہِ راست مغربی تہذیب کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔

5۔ قرآن اصلاً ایک کتابِ دعوت ہے، لیکن دعوت کی نکات کو مدلل کرنے کے لیے قرآن میں

بہت سے حوالے دئے گئے ہیں جن کا تعلق تاریخ یا عالمِ فطرت سے ہے۔ مگر ساتویں صدی کے ربع اول میں اِن حوالوں کی ضروری تفصیلات معلوم نہ تھیں۔ اِس بنا پر قرآن کے یہ حوالے عملاً صرف عقیدہ کا مسئلہ (matter of belief) بنے ہوئے تھے۔ اِس قسم کی مثالیں قرآن میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مثلاً قرآن میں کائنات کے آغاز کے لیے ایک حوالہ یہ ہے: أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا (21:30)۔ اِسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان جب بطنِ مادر میں ہوتا ہے تو وہ تین پردوں (في ظلمات ثلاث) کے درمیان ہوتا ہے (39:6)۔ اِسی طرح قرآن میں فرعون کے جسم کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (10:92)۔ قرآن میں کثرت سے اِس طرح کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اُن کے متعلق تاریخی اور سائنسی معلومات دریافت کی جائیں، تاکہ قرآن کے یہ بیانات انسان کے لیے پوری طرح قابلِ فہم ہوجائیں۔ یہ کام بھی پہلی بار مغربی علوم کے ذریعے انجام پایا ہے۔

6۔ قدیم زمانے میں مذہبی جبر عام تھا۔ اِس بنا پر دعوتِ حق کا کام معتدل انداز میں نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ صورتِ حال ایک سیاسی سبب کی بنا پر تھی۔ قدیم زمانے کے حکمراں اپنا حقِ حکمرانی (mandate) مذہب کی بنیاد پر حاصل کرتے تھے، اِس لیے وہ اِس کو برداشت نہیں کرتے تھے کہ اُن کے علاقے میں سلطنت کے مذہب کے سوا کوئی اور مذہب پایا جائے۔ مذکورہ آیت میں اظہارِ دین کا ایک پہلو یہ تھا کہ حقِ حکمرانی کے معاملے کو مذہب سے جدا کردیا جائے۔ دورِ اول میں جو اسلامی انقلاب آیا، اُس نے تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری کیا۔ یورپ کی جمہوریت اِسی عمل کی تکمیل ہے۔ مغربی جمہوریت نے یہ کیا کہ حقِ حکمرانی کے معاملے کو مذہب سے الگ کرکے اس کو عوامی رائے سے وابستہ کردیا۔ اِس کے نتیجے کے طور پر دنیا میں پہلی بار مذہبی امن کا دور آگیا۔ اِس دور کی باقاعدہ تکمیل اقوامِ متحدہ کی صورت میں ہوئی۔ جس کے تحت مذہب کے معاملے میں تشدد کو بطور اصول ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے گویا دورِ جدید میں حکمتِ حدیبیہ کی عالمی توسیع ہے جو اسلامی دعوت کے حق میں ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔

7۔ مغربی دنیا کے سیکولر اہلِ علم نے اسلام کا مطالعہ اپنے اصول کے مطابق، خالص موضوعی انداز میں کیا۔ اِس بنا پر وہ اسلام کے کئی ایسے پہلو کو دریافت کرسکے جو مسلم اہلِ علم سے اعتقادی مطالعے کی بنا پر مخفی تھے۔مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مشن کے سلسلے میں غیر معمولی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔اِس مقابلے میں پیغمبر اسلام کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔اِس کامیابی کو مسلم اہلِ علم عام طور پر ''فضیلت رسول'' کے خانے میں ڈالے ہوئے ہیں۔اِس کامیابی کو فضیلتِ رسول کے خانے میں ڈالنے کا نقصان یہ ہے کہ عام مسلمانوں کو اس سے کوئی سبق نہیں ملا۔اِس طریقِ مطالعہ سے عام مسلمانوں کو صرف فخر کی غذا ملی۔وہ اپنے پیغمبر کو ''فخرِ موجودات'' کہنے لگے۔

لیکن مغرب کے سیکولر اہلِ علم نے اِن واقعات کا تجزیہ غیر جانب دارانہ ذہن کے ساتھ کیا تو انھوں نے ایک ایسی حقیقت دریافت کی جس میں تمام مسلمانوں، بلکہ تمام انسانوں کے لیے کامیابی کا اعلیٰ اصول موجود تھا۔مثلاً ایک برٹش رائٹر (E.E. Kellet) نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرے کے تحت لکھا ہے کہ — انھوں نے مشکلات کا مقابلہ اِس عزم کے ساتھ کیا کہ وہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں:

> He faced adversity with the determination
> to wring success out of failure.

یہ صرف ایک تاریخی تجزیہ نہیں، اِس سے زندگی کا ایک اہم اصول دریافت ہوتا ہے، وہ یہ کہ انسان کو اُن کے خالق نے ایک انوکھی صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور وہ ہے اپنے مائنس کو اپنے پلس میں تبدیل کرلینا۔

انسانی شخصیت کا یہ امکان (potential) فطرت کا ایک عظیم عطیہ ہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل کے ذریعے اِس انسانی فطرت کا ایک کامیاب مظاہرہ کیا، مگر مسلمان اپنے عقیدت مندانہ مطالعے کی بنا پر اِس پہلو کو بطور سنتِ رسول اپنی زندگیوں میں شامل نہ کرسکے۔مغربی سیرت نگاروں نے سیرت نبوی کے اِس پہلو کو دریافت کرکے مسلمانوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اس کو اختیار کریں

اوراس کے ذریعے اپنے منصوبوں کوحقائق کی بنیاد پرقائم کرکے اس کوکامیاب بنائیں۔

شہادتِ اعظم

مغربی تہذیب کا دینِ خداوندی کے حق میں سب سے بڑا تائیدی رول یہ ہے کہ اس نے اہلِ اسلام کے لیے وہ ضروری اسباب فراہم کیے جن کواستعمال کرکے وہ دورِ آخر کے اُس اہم ترین رول کو کامیابی کے ساتھ ادا کرسکیں، جس کوحدیث میں شہادتِ اعظم کہا گیا ہے۔شہادتِ اعظم سے مراد دعوتِ اعظم ہے۔اِس دعوتِ اعظم کے دو پہلو ہیں — نظری اعتبار سے، اس کا اعلیٰ حجت (superior reason) پر قائم ہونا، اور وسعت کے اعتبار سے، اس کے دائرے کا عالمی (global) ہونا۔

صحیح مسلم میں ایک لمبی روایت آئی ہے۔اِس روایت میں دورِ آخر کے ایک اہم رول کا ذکر بطور پیشین گوئی کیا گیا ہے۔اِس کی بابت حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: هذا أعظم الناس شهادة عند رب العالمين (صحيح مسلم، رقم الحديث: 5230) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ رب العالمین کے نزدیک سب سے بڑی شہادت ہوگی۔

اِس حدیث پرغور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں 'شہادت' سے مراد جسمانی قتل نہیں ہے، بلکہ اُس سے مراد نظریاتی معنوں میں ایک عظیم دعوتی رول ہے جو دورِ آخر میں انجام پائے گا۔غالباً اِس سے مراد انسانی تاریخ کے آخری زمانے کا ایک فائنل دعوتی رول ہے۔اِس دعوتی رول کی صراحت اگرچہ حدیث میں موجود نہیں ہے، لیکن قرآن وحدیث میں ایسے اشارات موجود ہیں جن پرغور کرکے اِس رول کو متعین کیا جاسکتا ہے۔

1۔ شہادتِ اعظم کے نظری پہلو کو سمجھنے کے لیے قرآن کی اِس آیت سے رہنمائی ملتی ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔قرآن کی اِس آیت میں 'آیات' سے مراد تخلیق میں چھپی ہوئی نشانیاں ہیں۔ان نشانیوں کوموجودہ زمانے میں مغربی سائنس دانوں نے غیر معمولی تحقیق کے ذریعے دریافت کیا۔اِس طرح دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک نیا دور آگیا۔قبل از سائنس دور (pre-scientific ear) میں جو ایمان پیغمبروں کے

بتائے ہوئے عقیدہ (belief) کی حیثیت رکھتا تھا، وہ بعد از سائنس دور (post-scientific ear) میں خود انسان کے اپنے دریافت کردہ علوم کے تحت ایک ثابت شدہ حقیقت بن گیا۔

اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم زمانے میں کائنات ایک پر اسرار ظاہرہ بنی ہوئی تھی۔قدیم زمانے میں نہ عالمِ اکبر (macro world) کو دیکھنے کے لیے دوربین موجود تھی اور نہ عالمِ اصغر (micro world) کو دیکھنے کے لیے خوردبین دستیاب تھی۔موجودہ زمانے میں اعلیٰ سائنسی نوعیت کے مشاہدے اور تجربے کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ کائنات میں نہایت اعلیٰ درجے کی ذہین ڈیزائن موجود ہے۔ یہ دریافت اِس مذہبی تصور کو یقینی بنا دیتی ہے کہ یہ کائنات ایک باشعور خالق کی ایک باشعور تخلیق ہے۔ (ملاحظہ ہو:(*The Intelligent Universe* by Fred Hyle)

2۔ شہادت کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق عالمی دعوت (global dawah) سے ہے۔ اسلام اول دن سے سارے انسانوں کے لیے ایک دینِ رحمت کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن اسلام کے پیغام کو سارے انسانوں تک پہنچانا قدیم زمانے میں ذرائع کے اعتبار سے عملاً ممکن نہ تھا۔ موجودہ زمانے میں مغربی سائنس نے پہلی بار اُن تمام ذرائع کو انسان کی دسترس میں دے دیا جن کو استعمال کرکے اسلام کی عالمی دعوت کو ایک واقعہ بنایا جاسکتا ہے۔

اِس کی ایک مثال موجودہ زمانے میں اُس ذریعے کی ایجاد ہے جس کو الیکٹرانک کمیونکیشن کہا جاتا ہے۔ یہ دریافت اب نہایت ترقی یافتہ سائنس بن چکی ہے۔ اِس دریافت کا ایک جز موبائل فون ہے۔ اِس دریافت کے تحت موجودہ زمانے میں وہ آلہ تیار ہو گیا ہے جس کو سمارٹ فون (smart phone) کہا جاتا ہے۔ یہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ہر آدمی اس کو اپنی جیب میں رکھ سکتا ہے۔ اسمارٹ فون میں بظاہر لامحدود گنجائش (capacity) ہوتی ہے۔

موجودہ زمانے میں تمام بڑے بڑے ادارے اپنے کتابوں کو اپ لوڈ کرکے انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون پر ڈال رہے ہیں۔ اِس دریافت نے ایک نئے دعوتی امکان کو واقعہ بنا دیا ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ قرآن کے ترجمے مختلف زبانوں میں تیار کیے جائے۔ یہ ترجمے ایسی زبان میں ہوں جو

قاری کے لیے بہ آسانی قابلِ فہم ہوں۔ پھر قرآن کے اِن ترجموں کو انٹرنیٹ پر ڈال دیا جائے اِس کے بعد زمین پر بسنے والے ہر انسان کے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ وہ اپنی جیب سے اسمارٹ فون نکالے اور اس کے ایک سوئچ کو ٹچ کرے اور پورے قرآن کا ترجمہ اس کی اپنی قابلِ فہم زبان میں اس کے سامنے آجائے۔ دعوت کا یہ عالمی ذریعہ آج مغربی سائنس کی بنا پر عملاً ایک واقعہ بن چکا ہے۔

غالباً دورِ آخر کا یہی وہ دعوتی امکان ہے جس کا ذکر بطور پیشین گوئی ایک حدیثِ رسول (لا یبقی علی ظھر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا أدخله الله کلمة الإسلام بعز عزیز وذل ذلیل) میں کیا گیا ہے۔ اِس حدیث میں 'کلمۂ اسلام' سے مراد قرآن ہے۔ یہ ایک قابلِ غور بات ہے کہ حدیث میں 'إدخال الکلمة في کل القلوب' کا لفظ نہیں آیا ہے، بلکہ حدیث میں 'إدخال الکلمة في کل البیوت' کا لفظ آیا ہے۔ اِس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کہ کرۂ ارض پر بسنے والے تمام لوگ اسلام میں داخل ہوجائیں، بلکہ جو واقعہ ہوگا، وہ یہ کہ ہر چھوٹے بڑے گھر میں جہاں کوئی انسان رہتا ہے، وہاں قرآن داخل ہوجائے گا، خواہ انسان چاہے یا نہ چاہے۔ مذکورہ حدیث کے آخر میں 'عزت' اور ذلت' کے الفاظ اپنے لفظی معنی میں نہیں ہیں، بلکہ وہ اِسی معنی میں ہیں کہ آدمی چاہے یا نہ چاہے، ہر حال میں ایسا ہوگا کہ خدا کا کلام اس کے گھر میں داخل ہوجائے گا — انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون کی ایجاد کے بعد یہی واقعہ اپنی کامل صورت میں عملاً ظہور میں آگیا ہے۔

حضرت ابراہیم کی امامت

حضرت ابراہیم تقریباً چار ہزار سال پہلے عراق میں پیدا ہوئے۔ وہ تینوں سامی مذاہب — یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مشترک پیشوا مانے جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کے بارے میں قرآن میں عالمی امامت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے: **وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ‌ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا** (2:124) یعنی جب ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو ابراہیم نے اُن کو پورا کر دکھایا۔ اللہ نے کہا میں تم کو تمام انسانوں کا امام بناؤں گا۔

حضرت ابرہیم کا ذکر بائبل (عہد نامہ قدیم) میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ حضرت ابراہیم کی امامت کے بارے میں قرآن کی مذکورہ آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ بائبل میں بھی ان الفاظ میں آئی ہے — اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلے سے برکت پائیں گی:

All the nations of the earth shall be blessed in him. (Genesis 18:18)

قرآن اور بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو عالمی امامت کا درجہ دیا۔ یہ عالمی امامت کیا تھی، اس کے بارے میں یہودی علما، مسیحی علما اور مسلم علما تقریباً سب کے سب بے خبری میں مبتلا ہیں۔ وہ اِس کو صرف ایک پُراسرار (mysterious) مفہوم میں لیے ہوئے ہیں، حالاں کہ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ اس کی عظمت صرف اُس وقت واضح ہوتی ہے جب کہ اس کو تاریخ کی زبان میں بیان کیا جائے۔

منصوبہ تخلیق

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے بعد انسانی نسلوں کی ہدایت کے لیے اولاً پیغمبر بھیجنا شروع کیا۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت ابراہیم تک بڑی تعداد میں پیغمبر آئے، لیکن دنیا میں مطلوب حالت قائم نہ ہوسکی۔ وہ مطلوب حالت یہ تھی کہ ایک طرف، دینِ خداوندی کا مستند متن

محفوظ ہوجائے۔ اور دوسری طرف انسان کو دینِ خداوندی کے معاملے میں کامل آزادی حاصل ہو۔ دین کے معاملے میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ باقی نہ رہے۔مگر مختلف اسباب کے تحت ایسا ہوا کہ انسانی زندگی میں ایک برعکس حالت قائم ہوگئی۔ اِس کو ایک لفظ میں، استبدادیت (despotism) کہا جاسکتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں دنیا میں ہر جگہ انسانی زندگی میں استبدادی ماڈل (despotic model) رائج ہوگیا۔ اِس ماڈل کے تحت انسانی زندگی کے تمام معاملات مُستَبِد حکمراں (despotic rulers) کے تحت آگئے۔ یہ مستبد حکمراں اپنے مزاج کے تحت ہر نئی چیز کے دشمن ہوتے تھے۔ وہ ہر نئی تحریک کو پوری طاقت سے کچل دیتے تھے، تاکہ لوگوں کے اوپر ان کی حکمرانی غیر مشروط طور پر قائم رہے۔

اِسی نظام کا ایک ظاہرہ وہ تھا جس کو قرآن میں فتنہ (8:39) کہا گیا ہے۔ اِس ظاہرے کا سیکولر نام مذہبی جبر ہے۔ اِسی مذہبی جبر کی بنا پر قدیم زمانے میں لوگوں کو مذہب توحید اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی، کیوں کہ وہ حکمراں کے اختیار کردہ مذہب کے خلاف ہوتا تھا۔ اِسی بنا پر قدیم زمانے میں موحدین کو قتل کردیا گیا یا آگ میں جلا دیا گیا۔ اِسی بنا پر اصحاب کہف (Seven Sleepers) اپنی بستی کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے، وغیرہ۔ قدیم زمانے میں اِس قسم کے جو شدید واقعات پیش آئے، اس کا سبب کوئی سیاسی اختلاف نہ تھا، بلکہ اس کا سبب تمام تر صرف مذہبی اختلاف تھا۔

نیا عمل

حضرت ابراہیم کے زمانے میں اللہ نے تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری کیا۔ یہ عمل انسان کی آزادی کو منسوخ کیے بغیر کیا گیا۔ اِسی کے ساتھ اسباب کے ماحول کو پوری طرح برقرار رکھا گیا۔ اِس صورتِ حال کی بنا پر اِس خدائی عمل کے ساتھ ایک شبہہ کا عنصر (element of doubt) شامل ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب ثلاثہ کے علما خدا کے اِس منصوبے کو سمجھ نہ سکے۔ حضرت ابراہیم کی امامت کا معاملہ علماء مذاہب کے لیے ایک پراسرار معاملہ بنا رہا۔

مذاہبِ ثلاثہ کے علما اِس معاملے میں کنفیوژن کا شکار ہیں۔ وہ اِس واقعے کی کوئی ایسی توجیہہ دریافت نہ کرسکے جو اِس معاملے میں اُن کو یقین پر کھڑا کرنے والی ہو۔ انھوں نے اپنے

ذہنی سانچہ (mind-set) کے اعتبار سے، بعض توجیہات کیں، مگر انھوں نے دیکھا کہ اِن توجیہات کو تاریخ کی تصدیق حاصل نہیں ہورہی ہے، اس لیے وہ اِس معاملے میں کنفیوژن کا شکار ہو کر رہ گئے۔

مثلاً کچھ لوگوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم کے ذریعہ دنیا کو توحید کی مستند آئڈیالوجی ملی۔ مگر یہ بات حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہے، کیوں کہ دنیا کو توحید کی آئڈیالوجی قرآن کے ذریعے حاصل ہوئی، نہ کہ صُحفِ ابراہیم (87:19) کے ذریعے، جو کہ عملاً اب گم شدہ صحائف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ حضرت ابراہیم کے ذریعے ساری دنیا میں خدائی حکومت قائم ہوئی، مگر تاریخ میں ایسے کسی واقعے کا ذکر نہیں جب کہ ساری دنیا میں خدائی حکومت قائم ہوا اور حضرت ابراہیم اس میں صدر کی حیثیت رکھتے ہوں، وغیرہ۔ اِس قسم کی تمام توجیہات لوگوں کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں، اُن کا خدا کے نقشۂ تخلیق سے کوئی تعلق نہیں۔

اِس معاملے میں خدا کا منصوبہ کیا تھا، اس کو قرآن اور حدیث کے مطالعے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کی سورہ المائدہ میں ایک آیت آئی ہے جس کو اکمالِ دین (5:3) کی آیت کہا جاتا ہے۔ اِس آیت میں اکمالِ دین سے مراد شرعی احکام کی فہرست کا مکمل کرنا نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد اہلِ دین کے لیے خوف کی حالت کا خاتمہ ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کو آیت میں اِن الفاظ میں کہا گیا ہے: اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (5:3) یعنی آج منکرین تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے، پس تم اُن سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں کسی وقتی واقعے کا ذکر نہیں ہے، اِس میں ایک تاریخی حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ آیت حجۃ الوداع (10 ہجری) کے موقع پر نازل ہوئی۔ اِس آیت کا نزول دراصل تاریخ کے ایک دور کے خاتمے اور تاریخ کے دوسرے دور کے آغاز کا اعلان تھا۔ یہ اعلان اب پوری طرح واقعہ بن چکا ہے۔ اگرچہ اہلِ مذاہب اپنے خود ساختہ ذہن کی بنا پر اِس حقیقت سے بے خبر رہے۔

اسباب اور انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے جو خدائی منصوبہ بندی کی گئی، اس کا خاص نشانہ

یہ تھا کہ دنیا میں مذہبی جبر کا مکمل خاتمہ ہو جائے، ہر انسان کو یہ موقع ہو کہ وہ مذہب کے معاملے میں اپنے انتخاب (choice) کے لیے مکمل طور پر آزاد ہو جائے۔ یہ منصوبہ بندی مکمل طور پر ایک غیر سیاسی منصوبہ بندی تھی۔ اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا، نہ نظری اعتبار سے اور نہ عملی اعتبار سے۔

حضرت ابراہیم کے ذریعے جو منصوبہ بندی کی گئی، اس کے دو پہلو تھے — ایک یہ تھا کہ مطلوب صورتِ حال کا ایک ابتدائی نمونہ (prototype) تیار کرنا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ میں ایسا عمل (process) جاری کرنا جو آخر کار ایک نئے دور کو وجود میں لائے، جب کہ مذکورہ ابتدائی اور وقتی نمونہ ایک عالمی انقلاب کی صورت اختیار کر لے اور اِس طرح تمام دنیا کے انسانوں کے لیے عمومی طور پر اور مستقل طور پر یہ امکان کھل جائے کہ وہ کسی بھی جبر کے بغیر ہر قسم کی مذہبی سرگرمیوں کے لیے آزاد ہوں۔ اپنے ذاتی عقیدے کے معاملے میں بھی اور دوسروں کے درمیان اپنے عقیدے کی اشاعت کے معاملے میں بھی۔

وہ چیز جس کو اوپر ابتدائی نمونہ (prototype) کہا گیا ہے، اس کی مثال حضرت یوسف کے ذریعے قائم کی گئی۔ حضرت یوسف، حضرت ابراہیم کے گریٹ گرینڈسن (great grandson) تھے۔ وہ فلسطین اور شام کے درمیان ایک گاؤں (کنعان) میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں مصر ایک ترقی یافتہ ملک تھا۔ یہاں ایک خاندان حکومت کرتا تھا، جس کو ہکساس بادشاہ (Hyksos Kings) کہا جاتا ہے۔ حضرت یوسف کے زمانے میں یہاں جو بادشاہ حکومت کر رہا تھا، اس کا نام یہ تھا — اپوفس (Apophis)۔ یہ بادشاہ استثنائی طور پر ایک منفرد مزاج کا آدمی تھا۔ وہ شخصی طور پر ایسی صفات کا حامل تھا جو مطلوب منصوبے کے لیے ایک موزوں کردار کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدائی منصوبے کے تحت حضرت یوسف کو کنعان سے نکال کر قدیم مصر کی راجدھانی ممفس (Memphis) پہنچایا گیا۔ یہاں ایسے اسباب پیدا ہوئے جن کے تحت حضرت یوسف اُس وقت کے مصری بادشاہ کے دربار میں پہنچے۔ بادشاہ حضرت یوسف کی صلاحیت سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ اُس نے اپنے ایک فیصلے کے تحت، حضرت یوسف کو مصر کے خزائن (وسائل ارض) کا انچارج بنا دیا (12:55)۔

حضرت یوسف کا یہ قصہ قرآن اور بائبل دونوں میں یکساں طور پر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں بائبل کا بیان یہ ہے کہ بادشاہ نے کہا— میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب میں بزرگ تر ہوں گا:

Only in regard to the throne, I will be greater than you. (Genesis 41:40)

حضرت یوسف کے ذریعے مصر میں جو مثال قائم ہوئی، وہ دراصل اُس عمومی اور عالمی حالت کا ایک ابتدائی نمونہ تھا جو حضرت ابراہیم کے جاری کردہ تاریخی عمل کے نتیجے میں بعد کو زیادہ بڑے پیمانے پر قائم ہونے والا تھا۔ حضرت یوسف کے ذریعے قدیم مصر میں یہ مثال قائم ہوئی کہ اگر حاکم کے محدود سیاسی اقتدار کو تسلیم کرلیا جائے اور اُس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے تو کس طرح ایک انسان کے لیے ہر قسم کے مذہبی دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ گویا سیاسی ادارہ (political institution) اور غیر سیاسی اداروں (non-political institutions) کے درمیان علاحدگی کا معاملہ تھا۔ یہ علاحدگی اللہ کے منصوبے کے عین مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس معاملے کو قرآن میں احسن القصص (12:3) کہا گیا ہے، یعنی بہترین قصہ (best story)۔

قرآن کی اِس آیت میں ''بہترین قصہ'' سے مراد دراصل بہترین ماڈل (best model) ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کی اجتماعی زندگی کا بہترین ماڈل وہی ہے جس کا ایک ابتدائی نمونہ حضرت یوسف کے ذریعے ساڑھے تین ہزار سال پہلے قدیم مصر میں قائم کیا گیا۔ اِس معاملے کو دوسرے الفاظ میں، اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ قدیم مستبدانہ ماڈل (despotic model) کی جگہ جمہوری ماڈل (democratic model) کو دنیا میں رائج کرنا۔ کچھ لوگ جمہوری نظام کو لادینی نظام کہتے ہیں، مگر یہ درست نہیں۔ جدید جمہوری نظام دراصل سیکولرزم کے اصول پر قائم ہے۔ اس کے مطابق، جمہوریت عدم مداخلت کی پالیسی (policy of non-interference) کا دوسرا نام ہے، یعنی سیاسی اقتدار کے ادارے کا اِس پر راضی ہوجانا کہ وہ اپنے حدود کو انتظامیہ (administration) تک محدود رکھے گا۔ انتظامِ ملکی سے باہر جو ادارے ہیں، وہ اپنے دائرے میں

مکمل طور پر آزاد ہوں گے۔ مثلاً تعلیم، صحافت، اشاعتی ادارے، اقتصادی سرگرمیاں، مذہب، دعوت وتبلیغ، وغیرہ۔ اِس میں وہ تمام پُرامن سرگرمیاں شامل ہیں جن کو موجودہ زمانے میں غیر سیاسی سرگرمیاں (non-political activities) یا این جی اوز (NGOs) کی سرگرمیاں کہا جاتا ہے۔

نئی نسل کی تیاری

اِس سلسلے میں دوسری زیادہ بڑی منصوبہ بندی جو حضرت ابراہیم کے ذریعے چار ہزار سال پہلے شروع کی گئی، اس کا مرکز قدیم مکہ تھا۔ حضرت ابراہیم نے اپنی ایک دعا میں یہ الفاظ کہے تھے: رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا (14:35)۔ اِن الفاظ میں دراصل اُس دور کا ذکر تھا جس کو ماقبل ابراہیم دور (pre-Abraham age) کہا جا سکتا ہے۔ اِس قدیم دور میں شرک تمام انسانی آبادیوں میں ایک عمومی کلچر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، حتی کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہوگیا۔ مزید یہ کہ مشرکانہ کلچر کو قدیم زمانے کی حکومتوں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

اِس حکومتی حمایت کی بنا پر ایک شدید تر صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ وہ تھا— اعتقادی شرک کے ساتھ اس میں حکومتی تشدد کا شامل ہوجانا۔ اعتقادی شرک اور سیاسی اقتدار کے اِس اتحاد کی بنا پر وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جس کو مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔

اِس نظامِ جبر کو ختم کرکے نظامِ آزادی کو دنیا میں لانا ایک لمبا تاریخی منصوبہ تھا۔ اِس کے لیے صرف آئڈیالوجی کافی نہیں تھی، اِس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک مطلوب ٹیم وجود میں آئے۔ یہ ٹیم ایک آئیڈیالوجی کے تحت متحد ہو، تمام ضروری شرطوں کو اختیار کرتے ہوئے یہ ٹیم ایک ہمہ گیر جدوجہد کرے، وہ انسانی تاریخ میں ایک نئے انقلابی عمل (revolutionary process) کا آغاز کرے، انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے وہ اپنا سفر شروع کرے اور پھر اللہ کی خصوصی تدبیر (management) کے ذریعے وہ اپنے منتہا (culmination) تک پہنچ جائے۔ اٹھارھویں صدی میں جو سیاسی انقلاب آگیا اور جس کے نتیجے میں جمہوری ماڈل دنیا میں رائج ہوا، وہ حضرت ابراہیم کے ذریعے جاری کردہ اِسی عمل کی تکمیل کی حیثیت رکھتا تھا۔

رسول اور اصحابِ رسول کی مثال

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات 632 عیسوی میں ہوئی۔اُس وقت سارا عرب اسلام کے ماتحت آچکا تھا۔پیغمبر اسلام اِس عرب ریاست کے سربراہ تھے۔آپ نے ایک با اختیار صدر مملکت کی حیثیت سے یہ اعلان کیا کہ: لا فضل لعربي على عجمي، ولا لعجمي على عربي، ولا لأحمر على أسود، ولا لأسود على أحمر، إلا بالتقوى (مسند أحمد، رقم الحدیث: 24204) یعنی کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت ہے۔کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت نہیں، اور نہ کسی سیاہ فام کو کسی سفید فام پر کوئی فضیلت ہے، سوا تقوی کے۔یہ تاریخ میں حصولِ جمہوریت کا پہلا باضابطہ اعلان تھا۔اِس ریاستی اعلان کا مطلب یہ تھا کہ نظریاتی اعتبار سے، اب غیر جمہوری دور کا خاتمہ ہوگیا اور جمہوری دور کا اصولی طور پر آغاز ہوگیا۔اِس طرح تاریخ میں ایک نیا عمل شروع ہوا جو انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے بتدریج بعد کی تاریخ میں جاری رہا۔

اِسی اعلانِ جمہوریت کا ایک عملی مظاہرہ وہ تھا جو اِس اعلان کے تقریباً 10 سال بعد حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانے میں پیش آیا۔اُس وقت حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں مصر کا ملک مدینہ کی ریاست میں شامل ہو چکا تھا۔اُس وقت مصر میں ایک واقعہ ہوا، وہ یہ کہ ایک عرب مسلمان اور ایک مصری مسیحی کے درمیان ایک مسئلے پر نزاع ہوئی۔عرب مسلمان جو گورنر کا بیٹا تھا، اس نے مسیحی کو کوڑا مار دیا۔یہ مسیحی مصر سے چل کر مدینہ آیا۔اُس نے خلیفہ عمر فاروق سے شکایت کی۔خلیفہ نے گورنر اور اس کے بیٹے دونوں کو مدینہ بلوایا۔جب وہ لوگ آگئے تو خلیفہ نے مصر کے مسیحی کو ایک کوڑا دیا اور کہا کہ گورنر کے بیٹے کو مارو۔مسیحی نے کوڑا اپنے ہاتھ میں لیا اور گورنر کے بیٹے کو مارنا شروع کیا۔جب وہ اچھی طرح مار چکا تو اس کے بعد خلیفہ نے مذکورہ عرب مسلمان کے باپ عمرو بن العاص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا (سيرة عمر بن الخطاب، علي محمد الصلابي، 306/1) یعنی اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، جب کہ ان کی ماؤں نے اُن کو آزاد پیدا کیا تھا۔

جس وقت یہ واقعہ ہوا، اُس وقت خلافت ایک ایمپائر بن چکی تھی جس کے حدودِ مملکت ایشیا سے

افریقہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں خلیفہ کے الفاظ محض ایک شخص کے الفاظ نہ تھے، بلکہ وہ وقت کی سب سے بڑی سلطنت کی طرف سے گویا بین اقوامی پالیسی کا اعلان تھا۔ یہ پالیسی تاریخ میں سفر کرتی رہی۔ انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے وہ تاریخ کو ایک نیا شیپ (shape) دیتی رہی، یہاں تک کہ یہ عمل یورپ تک پہنچ گیا۔ فرانس کے مشہور جمہوری مفکر روسو (J. J. Rousseau) کی کتاب سوشل کنٹریکٹ (*Social Contract*) 1762 میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب میں جمہوریت (democracy) کی آئڈیالوجی کو پیش کیا گیا تھا۔ روسو نے اپنی کتاب کا آغاز جس جملے سے کیا، وہ گویا خلیفہ عمر فاروق کے مذکورہ قول کا اعادہ تھا۔ روسو کی کتاب کا ابتدائی جملہ یہ تھا — انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chains.

جمہوریت کی یہ تحریک 1789 میں ایک باقاعدہ سیاسی واقعہ بن گئی، جب کہ یورپ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کو انقلاب فرانس (French Revolution) کہا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس نے اصولی طور پر بادشاہت (kingship) کے نظام کا خاتمہ کر دیا اور جمہوریت کو ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے بالفعل قائم کر دیا۔ یہ تاریخی عمل 1948 میں آخری طور پر مکمل ہو گیا، جب کہ اقوامِ متحدہ (UNO) کا باضابطہ قیام عمل میں آیا اور دنیا کی تمام قومیں باضابطہ طور پر اقوامِ متحدہ کی ممبر بن گئیں۔ اِس ادارے کے تحت دنیا کی تمام قوموں نے اِس عہد نامے پر دستخط کر دئے۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ استبدادی ماڈل اب آخری طور پر غیر مطلوب ماڈل قرار پا گیا اور جمہوری ماڈل کو عملاً مسلمہ ماڈل کی حیثیت دے دی گئی۔

جمہوری ماڈل

جمہوریت کی تعریف (definition) عام طور پر اِس طرح کی جاتی ہے — عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لیے:

Government of the people, by the people, for the people

یہ تعریف جمہوریت کے صرف ظاہری ڈھانچے کو بتاتی ہے۔ اِس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جمہوریت کے

حقیقی فوائد کیا ہیں اور انسانی زندگی کے حق میں اس کے دوررس نتائج کیا پیدا ہوئے۔ جمہوریت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، اُس سے بہت زیادہ ہے جیسا کہ وہ مذکورہ تعریف کے مطابق، نظر آتی ہے۔

جمہوریت کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس نے اُن تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیا جو قدیم غیر جمہوری نظام کے تحت انسان پر عائد تھیں۔ جمہوریت نے کامل معنوں میں، انسان کو فکر وخیال کی آزادی دے دی۔ انسان اپنے فطری وجود کے اعتبار سے، امکانات کی ایک کائنات اپنے اندر رکھتا ہے۔ اِن انسانی امکانیات (potentials) کو انفولڈ (unfold) کرنے کے لیے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ ہے کامل آزادی۔ قدیم زمانے میں اِس انسانی آزادی پر پابندی لگی ہوئی تھی، اِس کا یہ نتیجہ تھا کہ قدیم زمانے میں انسان کوئی بڑی ترقی نہ کرسکا، نہ مذہبی اعتبار سے اور نہ سیکولر اعتبار سے۔

موجودہ زمانے میں جمہوریت کا دور آیا تو اسی کے ساتھ کامل آزادی کا دور آ گیا۔ اِس آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی تمام فطری صلاحیتیں انفولڈ ہونے لگیں۔ وہ تمام ترقیاں جن کے مجموعے کو تہذیب (civilization) کہا جاتا ہے، وہ دراصل اِسی انفولڈنگ (unfolding) کا نتیجہ ہیں۔ اِسی کے نتیجے میں یہ ہوا کہ دنیا میں مذہبی آزادی کا دور آیا۔ فطرت کے اندر چھپی ہوئی سائنسی حقیقتوں کی دریافت ہوئی۔ انسان کو پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی دولت ملی۔ تاریخ میں پہلی بار وہ انقلاب آیا جس کو عالمی کمیونکیشن (global communication) کہا جاتا ہے، وغیرہ۔

جدید تہذیب کی یہ تمام ترقیاں اسلام کے عین موافق تھیں۔ انھوں نے دینِ خداوندی کی اشاعت کے ایسے دروازے کھول دئے جو اِس سے پہلے کبھی نہیں کھلے تھے۔ جدید تہذیب نے اِس کو ممکن بنایا کہ اسلام کی حقیقتوں کو علمِ انسانی کی اعلیٰ سطح پر ثابت شدہ بنایا جاسکے۔ اِن نئی دریافتوں کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ انسان اعلیٰ سطح کی معرفت کا تجربہ کر سکے۔ اِسی کے ذریعے یہ ممکن ہوا کہ اللہ کے پیغام کی اشاعت کا کام کسی رکاوٹ کے بغیر عالمی سطح پر انجام دیا جاسکے۔ اِسی جدید تہذیب کی بنا پر تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ عالمی سطح پر ایک دعوہ ایمپائر (Dawah empire) قائم کیا جاسکے، وغیرہ۔

یہ سب کچھ جو دورِ جدید میں ہوا، وہ اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے مطابق ہوا۔

وہ منصوبہ یہ ہے کہ انسان کی آزادی کو ہر حال میں باقی رکھا جائے۔ جو کام بھی کیا جائے، وہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے کیا جائے۔ خدا کے اِسی تخلیقی منصوبے کی بنا پر ایسا ہوا کہ تہذیبی ترقیوں کے ساتھ انسان کے لیے یہ موقع باقی رہا کہ وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے، خواہ اس کے نتیجے میں فساد کی صورتیں پیدا ہوجائیں۔ یہ دوطرفہ صورتِ حال موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی بصیرت کا امتحان تھی۔ یہاں ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے رہنما اُس صلاحیت کا ثبوت دیں جس کو خدا کی کتاب میں فرقان (9:29) کہا گیا ہے، یعنی ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کرکے دیکھنا۔

اِس موقع پر مسلم رہنماؤں کو یہ کرنا تھا کہ وہ مغربی تہذیب اور اہلِ مغرب کی قومی سیاست دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھیں۔ مغربی تہذیب، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، مغربی تہذیب نہیں ہے، بلکہ وہ خدائی تہذیب (divine civilization) ہے۔ وہ فطرت میں چھپے ہوئے خدائی قوانین کی دریافت کے ذریعے وجود میں آئی ہے۔ وہ قوانینِ فطرت کا انسانی سطح پر ظہور ہے۔ فطرت کے قوانین جب انسانی ٹکنالوجی میں ڈھل جائیں تو اسی کا نام تہذیب ہوتا ہے۔ جدید تہذیب کو سمجھنے کے لیے اُسی طرح اس کو مغرب کے قومی پہلو سے الگ کرکے دیکھنا چاہئے، جس طرح اسلام کو مسلمانوں کے قومی پہلو سے الگ کرکے دیکھا جاتا ہے۔

دورِ جدید کے مسلم رہنما اگر اِس بصیرت کے حامل ہوتے کہ وہ جدید تہذیب اور مغربی قوم، دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھتے تو یقیناً وہ پالیتے کہ جدید تہذیب اُن کے لیے ایک خدائی نعمت ہے، وہ حضرت یوسف کے 'احسن القصص' کا عالمی اظہار ہے، وہ حضرت ابراہیم کے جاری کردہ عمل (process) کا براہِ راست حصہ ہے، وہ پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کے ذریعے لائے جانے والے انقلاب کا تکمیلی مرحلہ ہے۔ جدید تہذیب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے وہ عالمی مواقع آخری حد تک کھول دئے ہیں، جب کہ پیغمبر اسلام کی ایک پیشین گوئی کو واقعہ بنایا جاسکے۔ آپ کی اِس پیشین گوئی کو مختصر طور پر اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے — ادخال الکلمة في کل البیوت۔

اوپر کے صفحات میں تاریخ کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ

خدائی منصوبہ کیا تھا جس کو قرآن میں امامتِ ابراہیم کہا گیا تھا اور جس کے بارے میں بائبل میں یہ الفاظ آئے تھے کہ — زمین کی سب قومیں اس کے وسیلے سے برکت پائیں گی۔

اِس خدائی اعلان کا مطلب یہ تھا کہ انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اللہ تاریخ میں ایک ایسا عمل (process) جاری کرے گا جو آخرکار اِس انجام تک پہنچے گا کہ انسانی زندگی میں سیاسی جبر کا فتنہ کامل طور پر ختم ہو جائے اور جمہوریت کے تحت ایک ایسا سیاسی نظام بنے گا جس میں دوبارہ زیادہ بڑے پیمانے پر اور عالمی سطح پر وہ حالت قائم ہو جائے گی جو حضرت یوسف کے زمانے میں قدیم مصر میں وقتی طور پر اور محدود طور پر قائم ہوئی تھی، یعنی سیاسی حکمراں کا اقتدار ''تخت'' تک محدود رہے گا۔ ''تخت'' کے سوا تمام غیر سیاسی شعبے مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گے۔ ہر انسان کو یہ موقع ہوگا کہ وہ کامل معنوں میں مذہبی آزادی کی فضا میں جیے۔ وہ اپنے چوائس (choice) کے مطابق، جس مذہبی عقیدے کو چاہے، اختیار کرے، وہ عبادت کے جس طریقے کو چاہے، اس کے مطابق، عبادت کرے۔ مذہب کی تبلیغ واشاعت پر کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، انسان کو مکمل معنوں میں مذہبی آزادی حاصل ہو، اِس واحد شرط کے سوا کوئی اور شرط اس کے لیے موجود نہ ہو کہ وہ دوسرے انسانوں کو کسی بھی قسم کی عملی جراحت (physical injury) نہیں پہنچائے گا۔ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے یہی واحد ممکن ماڈل تھا جس کو اللہ کے منصوبے کے تحت بروئے کار لایا گیا۔

اِس مذہبی آزادی میں یہ بات بھی اپنے آپ شامل ہے کہ تمام مواقعِ کار جو سیکولر لوگوں کو حاصل ہوں گے، وہ سب کے سب مکمل طور پر اہلِ مذہب کو بھی حاصل ہوں گے۔ مواقع کے استعمال میں مذہبی انسان اور غیر مذہبی انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

ایک مسئلے کی وضاحت

انسانی زندگی کی تشکیل کا جو نقشہ اوپر بیان کیا گیا ہے، بظاہر اس میں حکومت یا سیاسی اقتدار کا معاملہ شامل نہیں ہے، لیکن بالواسطہ طور پر وہ یقیناً اس میں شامل ہے۔ اِس فرق کا سبب یہ ہے کہ اگر حکومت کے معاملے کو مذکورہ نقشہ میں شامل کیا جائے تو پورا خدائی منصوبہ تخلیق عملاً معطّل ہو کر

رہ جائے گا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں شعبوں میں کوئی مثبت کام نہ ہو سکے گا، نہ عبادت اور دعوت کے شعبے میں اور نہ سیاست اور حکومت کے شعبے میں۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں شعبوں کی حیثیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ عقیدہ اور عبادت اور دعوت کا معاملہ اُس میدان سے تعلق رکھتا ہے جہاں آدمی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ پُرامن طور پر اپنی تمام سرگرمیوں کو کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رکھ سکے۔ اِس کے برعکس، سیاست کا دائرہ ایک ایسا دائرہ ہے جہاں داخل ہوتے ہی فوراً دوسرے فریق سے نزاع پیدا ہوجاتی ہے۔ سیاست کے دائرے میں ہمیشہ کوئی فرد یا گروہ اتھارٹی کی پوزیشن میں ہوتا ہے، اِس لیے سیاست کے دائرے میں داخل ہونا عملاً پولٹکل اتھارٹی سے ٹکراؤ کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ یہ ٹکراؤ اِس ماحول کو ختم کر دیتا ہے جب کہ ایک شخص عقیدہ اور عبادت اور دعوت کے میدان میں موجود مواقع کو استعمال (avail) کر سکے۔

خدا کے منصوبۂ تخلیق میں اِس مسئلے کا حل یہ مقرر کیا گیا کہ سیاسی اقتدار کے شعبے کو عقیدہ سے وابستہ کرنے کے بجائے اس کو سماجی حالات (social conditions) سے وابستہ کر دیا جائے، یعنی کسی وقت سماج کے جو حالات ہوں اور انسانوں کے درمیان جس سیاسی ڈھانچے پر اتفاق ہوسکتا ہے، اس کو اختیار کرلیا جائے۔ یہ صورتِ حال جاری رہے گی، یہاں تک کہ سماج کے حالات بدل جائیں اور سیاسی ڈھانچے کے بارے میں کوئی دوسرا نقشہ لوگوں کے لیے قابل قبول بن جائے۔

اِس حکمت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (42:38) یعنی ان کا معاملہ اُن کے آپس کے مشورے کے تابع ہے۔ اِس آیت میں 'امر' سے مراد اقتدار کا معاملہ ہے۔ اِس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ سیاسی اقتدار کا معاملہ کسی مخصوص عقیدے کے تابع نہ ہو، بلکہ وہ لوگوں کی آزاد رائے کے تابع ہو۔ آج کل کی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی ادارے کا معاملہ عوامی الیکشن کے تابع ہے۔ فری اینڈ فیر الیکشن (free and fair election) کے ذریعے جو لوگ منتخب ہوں گے، اُن کو حق ہوگا کہ وہ اُس وقت تک حکومت کا نظام چلائیں جب تک لوگوں کی رائے بدل نہ جائے اور سماجی حالات کا یہ تقاضا ہو کہ اقتدار کی زمام کچھ دوسرے لوگوں کے

حوالے کی جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: كما تكونون ؛ كذلك يؤمر عليكم(البيهقي ، رقم الحديث : 7391) یعنی جیسے تم ہوگے، ویسے تمھارے حکمراں ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ حکمراں کا تعین کسی مخصوص عقیدے کی بنیاد پر نہیں ہوگا، بلکہ اس کا تعین لوگوں کی رائے (vote) کے ذریعے کیا جائے گا۔

یہ ایک قسم کے سماجی بندوبست (social settlement) کا معاملہ ہے۔ اِس کا فائدہ یہ ہے کہ زندگی کے دونوں شعبوں (سیاسی اور غیر سیاسی) میں امن کا قیام ممکن ہوجاتا ہے۔ عقیدہ اور عبادت اور دعوت کے میدان میں لوگوں کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ پُرامن طور پر اپنی تمام سرگرمیوں کو جاری رکھیں، وہ اپنے حق میں مواقع کا بھرپور استعمال کریں۔ دوسری طرف، سماج کے ہر گروہ کو یہ موقع حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ سماج کے اندر اپنے افکار کی پرامن اشاعت کرسکے اور پھر اگلے الیکشن کے موقع پر، حسبِ حالات، وہ اپنی پرامن کوششوں کا فائدہ اٹھائے — انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے سماجی بندوبست کا اِس سے بہتر کوئی نظام ممکن نہیں۔

خاتمہ کلام

جیسا کہ عرض کیا گیا، اللہ تعالی کا یہ منصوبہ تھا کہ انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ میں ایک ایسا عمل (process) جاری کیا جائے جس کے نتیجے میں سیاست کے جبری ماڈل (despotic model) کا خاتمہ ہوجائے اور اس کے بجائے سیاست کا جمہوری ماڈل (democratic model) عمومی طور پر رائج ہوجائے۔ اِس مطلوب ماڈل کا ایک ابتدائی نمونہ (prototype) حضرت یوسف کے ذریعہ قدیم مصر میں محدود طور پر قائم کیا گیا تھا۔ اِسی کے ساتھ حضرت ابراہیم کے ذریعے ایک وسیع تر عمل جاری کیا گیا جو مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اپنے منتہا تک پہنچا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی مذکورہ ابراہیمی عمل کی تکمیل کی صدی ہے۔ اب ہم اکیسویں صدی میں ہیں اور یہ عمل اب اِس حد تک مکمل ہو چکا ہے کہ آج تمام مواقع دعوت الی اللہ کے حق میں پوری طرح کھل چکے ہیں۔ اب ہر اعتبار سے، وہ وسائل اور مواقع حاصل ہو چکے ہیں، جب کہ کسی رکاوٹ کے بغیر

فکری سطح پر اللہ کے دین کا عالمی اظہار اپنی مطلوب صورت میں کیا جا سکے۔

مگر اسلام کی تاریخ کا شاید یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ اِس دور میں جو بڑے بڑے مسلم ذہن پیدا ہوئے، وہ اِس واقعے سے بالکل بے خبر رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اِس دور میں پیدا شدہ عظیم مواقع کو استعمال بھی نہ کر سکے۔ اِس المیہ کا سبب بنیادی طور پر صرف ایک تھا، اور وہ ایک اتفاقی مطابقت (coincidence) ہے۔ اِس اتفاقی مطابقت کا یہ نتیجہ تھا کہ تاریخ کا عظیم ترین امکان غیر استعمال شدہ امکان (unavailed opportunity) بن کر رہ گیا۔

اِس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مذکورہ ابراہیمی عمل کی تکمیل ہوئی تو یہ اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ عین اُس زمانے میں ایک حادثہ پیش آ گیا۔ وہ حادثہ یہ تھا کہ اِسی زمانے میں مغربی قوموں نے بڑی بڑی مسلم سلطنتوں کو توڑ دیا اور پوری مسلم دنیا میں اپنا سیاسی اور تہذیبی دبدبہ قائم کر لیا۔

یہ حادثہ مسلمانوں کی قومی نفسیات کے لیے ایک ایٹمی دھماکے سے بھی زیادہ بڑے دھماکے کی حیثیت رکھتا تھا۔ چناں چہ اِس دور کے تمام مسلمان، غالباً کسی استثنا کے بغیر، شدید طور پر منفی ردعمل کا شکار ہو گئے۔ وہ مغربی قوموں سے نفرت کرنے لگے۔ انھوں نے مغربی قوموں کے خلاف فکری یا عملی جنگ چھیڑ دی۔ یہ ردعمل اتنا شدید تھا کہ مغربی قوموں کو نقصان پہنچانے کے لیے وہ خود کش بم باری (suicide bombing) کو بھی اپنے لیے جائز سمجھنے لگے۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں پیدا ہونے والا مسلم لٹریچر، تقریباً سب کا سب، اِسی نفرت کی نفسیات سے بھرا ہوا ہے۔ اِس لٹریچر کے مطابق، موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا جو ذہن بنا، وہ یہ تھا گویا کہ ساری مغربی دنیا صرف ایک کام میں مشغول ہے — مسلمانوں کے خلاف سازش اور دشمنی۔ اِس معاملے کی ایک علامتی مثال ایک عرب عالم کی کتاب ہے، جس کا ٹائٹل یہ ہے:

أجنحة المكر الثلاثة وخوافيها: التبشير، الإستشراق، الإستعمار (صفحات: 776)

عبد الرحمن حسن حبنكة الميداني (دار القلم، دمشق: 2000)

اجتماعی توبہ کی ضرورت

یہ صورتِ حال بلاشبہہ توبہ کی متقاضی ہے، یعنی منفی سوچ کو ترک کر کے مثبت سوچ کی طرف واپس جانا۔ اب تمام مسلمانوں کے لیے اُس عمل کا وقت آ گیا ہے جس کا حکم قرآن میں اِن الفاظ میں دیا گیا تھا: وَتُوبُوٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (24:31) یعنی اے ایمان والو، تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔

قرآن کی اِس آیت میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد اجتماعی توبہ (collective repentance) ہے۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ مذکورہ قسم کا منفی ذہن تمام مسلمانوں کا قومی ذہن بن گیا ہے۔ مسلمانوں کی تمام قومی پالیسیاں اِسی منفی ذہن کے مطابق بنتی ہیں۔ اِس معاملے میں مسلمان اتنا زیادہ متحد الخیال ہیں جیسے کہ اِس معاملے میں تمام مسلمانوں کا اجماع (consensus) ہو گیا ہو۔ اِس وقت سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اِس عمومی قومی ذہن کو بدلا جائے۔ یہی موجودہ مسلمانوں کی اصلاح کا نقطہ آغاز ہے۔ اِس ذہن کے باقی رہتے ہوئے مسلمانوں کے درمیان کوئی بھی نتیجہ خیز اصلاحی کام نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ کا ربانی سفر

قرآن کی ایک آیت، معمولی لفظی فرق کے ساتھ، دو سورتوں میں آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (61:8) یعنی وہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کی روشنی کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

قرآن کی اِس آیت کا خطاب محدود طور پر صرف قدیم مکہ یا قدیم مدینہ کے مخالفین سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق پوری انسانی تاریخ کے ربانی سفر سے ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے پچھلے ہزاروں سال کے دوران مختلف مقامات پر اپنے پیغمبر بھیجے، لیکن مخالفین نے اُن کے مشن کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ اب اللہ نے تاریخ میں مداخلت کرتے ہوئے اِس مشن کا چارج خود لے لیا ہے۔ یہی مداخلت اِس بات کی ضمانت ہے کہ خدا کا یہ مشن اپنی آخری تکمیل تک پہنچے، کوئی بھی طاقت اس کے سفر کو روکنے میں کامیاب نہ ہو۔

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے ساتویں صدی عیسوی میں جو انقلاب آیا، وہ اِسی فیصلۂ الٰہی کا نتیجہ تھا۔ اِس انقلاب کا سب سے زیادہ انوکھا پہلو یہ تھا کہ وہ تقریباً 35 سال (644-610) کے اندر مکمل ہوگیا۔ انقلاب کا یہ پہلو بے حد اہم ہے۔ تاریخ میں دوسرے جو انقلابات پیش آئے، وہ سب اپنی نوعیت کے اعتبار سے، سیاسی انقلابات (political revolutions) تھے، مگر اسلامی انقلاب اِس کے برعکس، ایک نظریاتی انقلاب (ideological revolution) تھا۔ اِس بنا پر ضروری تھا کہ وہ پہلی نسل (first generation) کے اندر مکمل ہوجائے۔ سیاسی انقلاب کو کئی نسلوں میں مکمل کیا جاسکتا ہے، لیکن نظریاتی انقلاب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ یا تو پہلی نسل میں مکمل ہوگا، یا وہ سرے سے مکمل ہی نہ ہوگا۔

بنیادی طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے دو دور تھے — ایک تھا، فاؤنڈیشن پیریڈ (foundation period) اور دوسرا تھا، توسیعی پیریڈ (expansion period)۔ توسیعی پیریڈ کی

تکمیل بعد کے دور میں بھی ممکن ہے، لیکن فاؤنڈیشن پیریڈ کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلی نسل میں اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔

انسان کی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے پہلی نسل میں فاؤنڈیشن پیریڈ کی تکمیل اِس عالمِ اسباب میں کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ یہ صرف اللہ کے لیے ممکن تھا اور اللہ نے خصوصی مداخلت کرکے ایسے حالات پیدا کیے کہ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے یہ ممکن ہوجائے کہ وہ پہلی نسل میں اِس انقلاب کو مکمل کرسکیں۔ یہ ایک ایسا استثنائی واقعہ تھا کہ پوری انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ مورخین، اسلامی انقلاب کے اِس استثنائی پہلو کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن وہ اِس کی توجیہہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ مورخین مادی اسباب کی روشنی میں واقعات کی توجیہ کرتے ہیں، جب کہ یہ واقعہ خدا کی برتر مداخلت کا نتیجہ تھا اور خدا کی برتر مداخلت ایک ایسا عامل (factor) ہے جس سے مورخین شعوری طور پر واقف نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ کو جو انقلاب لانا مطلوب تھا، اس کو قرآن میں اتمامِ نور (61:8) کہا گیا ہے۔ ضروری تھا کہ یہ واقعہ پہلی نسل کے اندر مکمل ہوجائے۔ کیوں کہ فطرت کے قانون کے تحت ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ بعد کی نسلوں میں زوال شروع ہوجاتا ہے اور زوال یافتہ افراد اتمامِ نور کا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔ اِس لیے اللہ تعالی نے خصوصی منصوبے کے تحت ایک محدود مدت میں بہت سے انتظامات کیے، تاکہ پہلی نسل میں انقلاب کی تکمیل کو یقینی بنایا جاسکے۔

اِس مقصد کے لیے مختلف تدبیریں کی گئیں۔ مثلاً کعبہ کو تمام عرب قبائل کے بتوں کا مرکز بنا دیا گیا، تاکہ تمام قبائل کے افراد مکہ میں حاصل ہوجائیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال (570ء) میں یمن کے حاکم ابرہہ نے ہاتھیوں کی فوج کے ذریعے مکہ پر حملہ کیا تھا، تاکہ کعبہ کو ڈھا دیا جائے۔ اگر ابرہہ کا منصوبہ کامیاب ہوجاتا تو کعبہ کا وجود مٹ جاتا اور پیغمبر اسلام کو یہ موقع حاصل نہ ہوتا کہ وہ مکہ میں تمام عرب قبائل کے افراد کو یکجا طور پر پاسکیں۔ اُس زمانے میں قبیلہ قریش کو پورے عرب کی ذہنی قیادت (intellectual leadership) کا مقام حاصل تھا۔ مکہ میں ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ وہاں کے تمام اعلی ذہن پیغمبر اسلام کے ساتھی بن گئے۔ پھر مدینہ کے دونوں قبائل (اوس وخزرج) کے

درمیان خوں ریز جنگ ہوئی۔ اِس کے نتیجے میں دونوں قبائل بے حد کمزور ہو گئے۔ اس طرح پیغمبر اسلام کو یہ موقع ملا کہ وہ دس سال کے اندر پورے مدینے کو اسلام کے فولڈ میں لاسکیں۔ تمام قبائل کے بتوں کا مرکز بن جانے کی بنا پر عرب کے قبائل کعبہ کو پورے عرب کا مذہبی اور سیاسی مرکز سمجھتے تھے۔ چناں چہ جب مکہ فتح ہوا تو نہایت تیزی سے تمام عرب قبائل نے پیغمبر اسلام کی قیادت کو قبول کرلیا۔

اسی طرح اُس زمانے میں عرب کی سرحدوں پر ایک بڑا واقعہ پیش آیا۔ اِس واقعے کا ذکر قرآن کی سورہ الروم (30) کے آغاز میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ اُس زمانے میں عرب کی سرحدوں پر دو بڑے ایمپائر قائم تھے۔ ایک، ساسانی ایمپائر اور دوسرے، بازنتینی ایمپائر۔ عین اُس زمانے میں دونوں کے درمیان فوجی ٹکراؤ ہوا۔ پہلے ساسانی ایمپائر نے رومی ایمپائر کو تباہ کیا۔ اس کے بعد رومی بادشاہ نے اپنی طاقت کو دوبارہ مجتمع کر کے ساسانی ایمپائر پر حملہ کیا اور اس کو تباہ کر دیا۔ چناں چہ دونوں ایمپائر بہت زیادہ کمزور ہو گئے۔ اس طرح اصحابِ رسول کو یہ موقع مل گیا کہ وہ نہایت آسانی سے ایشیا اور افریقہ کے درمیان پھیلے ہوئے اِس پورے علاقے کو اسلامی علاقے میں شامل کرسکیں۔

تاریخِ اسلام: ایک مطالعہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ آپ کی مسلسل جدوجہد سے وہاں ایک ٹیم بنی جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کی کوششوں سے ساتویں صدی کے نصف اول میں ایک انقلاب آیا۔ مورخین اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا انقلاب تھا۔ مثلاً حال میں برطانیہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے موضوع پر ایک انگریزی کتاب چھپی ہے۔ اُس کا نام یہ ہے:

The Prophet Muhammad: A Biography by Barnaby Rogerson, Little , Brown, UK 2003, p. 240

برطانی مصنف راجرسن نے اپنی اِس کتاب میں لکھا ہے کہ — پیغمبر اسلام کو جو عظیم کامیابی حاصل ہوئی، اس کے لحاظ سے وہ بلاشبہہ تاریخ کے سپر ہیرو (superhero) تھے۔ تاہم پیغمبر اسلام کی

غیر معمولی کامیابی کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی یہ کامیابی محض اتفاقی (mere accidental) تھی (صفحہ 4)۔

سیکولر مبصرین عام طور پر اِس طرح کے الفاظ بولتے ہیں۔جس واقعہ کی توجیہ وہ معلوم اسباب کے تحت نہ کرسکیں، اُس کو وہ ''اتفاق'' کا نتیجہ قرار دے دیتے ہیں۔مگر اتنا بڑا واقعہ جو پوری تاریخ میں واحد استثنا کی حیثیت رکھتا ہو، وہ محض اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک خدائی منصوبہ (divine plan) تھا، جو رسول اوراصحابِ رسول کے ذریعے انجام پایا۔اِس کا ظہور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم کے زمانے میں ہوا اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی۔

اللہ کا یہ منصوبہ تھا کہ توحید کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کیا جائے۔اِس مقصد کے لیے قدیم دور میں اللہ نے بہت سے پیغمبر بھیجے۔مگر اِن پیغمبروں کے ذریعے کوئی ٹیم نہیں بنی۔اِس لیے قدیم زمانے میں مطلوب انقلاب برپا نہ ہوسکا۔اس کے بعد اللہ تعالی نے حضرت ابراہیم کے ذریعے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ اِس منصوبے کے تحت حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بچے اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسا دیا۔اِس واقعے کی طرف قرآن میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (14:37)۔

اِس صحرائی ماحول میں لمبی مدت تک توالد وتناسل کے ذریعے ایک جان دار قوم تیار ہوئی۔اِسی قوم کے اندر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی۔پھر اِسی قوم کے اندر کام کرکے وہ ٹیم بنی جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔یہ پورا معاملہ ایک خدائی منصوبے کے تحت وجود میں آیا۔مکہ میں مقدس کعبہ کی تعمیر اِسی منصوبے کا ایک حصہ تھی۔بعد کو سارے عرب میں شرک پھیل گیا۔یہ قبائلی دور تھا۔ہر قبیلے کا ایک الگ بت تھا۔چناں چہ یہاں ایسے اسباب پیش آئے کہ کعبہ 360 بتوں کا مرکز بن گیا۔

یہ قدیم تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔اِس سبب سے یہ ممکن ہوگیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مشن کی اشاعت کے لیے سارے عرب میں سفر نہ کرنا پڑے، بلکہ مکہ ہی میں آپ کو

تمام قبائل کے نمائندے حاصل ہو جائیں۔ کیوں کہ کعبہ میں تمام قبائل کے بتوں کی موجودگی کی بنا پر ایسا ہوتا تھا کہ مکہ میں مسلسل طور پر وہ چیز ہوتی رہتی تھی جس کو آج کل کی زبان میں کُل عرب اجتماع (all Arab assembly) کہا جاسکتا ہے۔

اِس کے بعد بار بار ایسے واقعات پیش آئے جن کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل کرسکیں۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت پر غور کیجئے۔ غزوۂ بدر کی نسبت سے، قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: لِيَقۡطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوٓاْ أَوۡ يَكۡبِتَهُمۡ (3:127) یعنی تاکہ اللہ اہلِ کفر کے ایک حصے کو کاٹ لے یا وہ اُن کو ذلیل کردے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں "طَرَف" کا لفظ حصۂ بہتر (better part) کے معنی میں ہے، یعنی اہلِ کفر کے بہتر حصے کو کاٹ کر جدا کر دینا اور 'یکبتھم' کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بقیہ حصہ کو ہلاک کرکے ختم کردینا۔ ٹھیک یہی واقعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آیا۔ پہلے مکی دور کی تیرہ سالہ دعوتی جدوجہد کے دوران مکہ کے صالح افراد کو ایمان کی توفیق ملی اور وہ اسلام قبول کرکے پیغمبر اسلام کے ساتھی بن گئے۔ 'قطعِ طرف' کا یہی واقعہ ہے جس کا ذکر حضرت خالد بن الولید نے اِن الفاظ میں کیا تھا: دخل الناس في الإسلام، فلم يبق أحد به طَعْم (البيهقي: 4/345) یعنی مکہ کے بہترین افراد اسلام میں داخل ہوگئے۔ اب مکہ میں کوئی باذوق آدمی (man of taste) باقی نہیں رہا۔ 'یکبتھم' کا لفظی مطلب ہے ذلیل کرنا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ مکہ کے مخالفین جو چڑھائی کرکے ایک ہزار کی تعداد میں مدینہ آئے تھے، اُن کے 70 طاقت ور افراد قتل ہوگئے اور اُن کو ذلیل وخوار ہو کر مکہ واپس جانا پڑا۔

عرب کا اسلامائزیشن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو کامیابی حاصل ہوئی، اس میں ایک بڑا دخل اُس واقعے کا ہے جس کو اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک انوکھی تدبیر تھی جس کو پوری تاریخ میں کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ مکمل طور پر ایک اجتہادی تدبیر تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مشن 610 عیسوی میں شروع کیا۔ یہ زمانہ جارحانہ شرک

اور مذہبی عدم رواداری (religious intolerance) کا زمانہ تھا۔ اِس بنا پر وہاں فریقِ ثانی کی طرف سے مسلسل طور پر ٹکراؤ اور جنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اِس طرح کے ماحول میں دعوتِ توحید کا کام پوری طرح نہیں ہوسکتا تھا۔ توحید کی آئڈیالوجی پیغمبر اسلام کے مشن کی سب سے بڑی طاقت تھی، مگر طرفین کے درمیان تشدد کے ماحول کی بنا پر یہ موقع نہ تھا کہ یہ طاقت پوری طرح ظاہر ہو اور لوگوں کو مسخر کرے۔

اُس وقت اللہ کی خصوصی توفیق سے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی تدبیر کی جس کی کوئی نظیر تاریخ میں موجود نہ تھی۔ وہ تدبیر یہ تھی کہ فریقِ ثانی کے تمام مطالبات کو یک طرفہ طور پر مان لیا جائے، تاکہ فریقین کے درمیان معتدل ماحول قائم ہوجائے اور کسی رکاوٹ کے بغیر دعوتِ توحید کا کام انجام پاسکے۔ یہ تدبیر بلاشبہہ ایک عظیم تدبیر تھی، اِسی لیے اُس کو قرآن میں فتحِ مبین (48:1) کہا گیا ہے۔

صلح حدیبیہ کی اِس تدبیر سے دو بڑے فائدے حاصل ہوئے۔ ایک، یہ کہ صلح حدیبیہ سے پہلے فریقین کا مقابلہ میدانِ جنگ میں ہوتا تھا، اور جنگ کا طریقہ صرف مسئلے کو بڑھاتا ہے، وہ مسئلے کو کم نہیں کرتا۔ صلح حدیبیہ کا یہ فائدہ ہوا کہ طرفین کا مقابلہ عقل اور فطرت کے میدان میں ہونے لگا، اور جب عقل اور فطرت کے میدان میں مقابلہ ہو تو توحید کی آئڈیالوجی ہمیشہ غالب رہے گی۔ وہ عقل کو ایڈریس کرے گی اور انسان کی فطرت مسخر ہوتی چلی جائے گی۔ اِسی کا یہ نتیجہ تاریخ نے دیکھا کہ معاہدہ حدیبیہ کے بعد صرف دو سال کے اندر پیغمبر اسلام کے پیروؤں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ صرف تعداد ہی مکہ کی پر امن فتح کے لیے کافی ہوگئی۔

صلح حدیبیہ کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ قریشِ مکہ کی طرف سے جنگ کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے مشن کو پورے عرب میں پھیلاسکیں۔ اِس سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ پیغمبر اسلام کا دعوتی پیغام تمام عرب قبائل میں پھیل گیا تھا۔ عمومی طور پر لوگوں کے دلوں میں توحید کے لیے نرم گوشہ (soft corner) پیدا ہوچکا تھا، لیکن قریش سے حالتِ جنگ قائم ہونے کی بنا پر پیغمبر اسلام کو یہ موقع نہیں مل رہا تھا کہ آپ کھلے طور پر اِس دعوتی امکان کو استعمال کریں۔ اب آپ نے

یہ کیا کہ مدینہ سے تمام عرب قبائل کی طرف وفود بھیجنے شروع کیے۔ وفود کا یہ طریقہ بھی قدیم زمانے میں ایک نیا طریقہ تھا۔ یہ طریقہ کامیاب ہوا اور بہت کم مدت میں پورا عرب اسلامائز ہوگیا۔

پیغمبر اسلام کا مشن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم انسان کی لمبی تاریخ کی ایک درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ سے پہلے کثیر تعداد میں خدا کے پیغمبر آئے۔ اِن پیغمبروں کے زمانے میں بلاشبہ توحید کا فکری اظہار رہا، لیکن توحید کی بنیاد پر عملاً کوئی فکری انقلاب برپا نہ ہوسکا۔ اِسی بنا پر پچھلے پیغمبروں کا لایا ہوا دین محفوظ بھی نہ رہا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے اللہ نے ایک نئی منصوبہ بندی کی۔ وہ منصوبہ بندی یہ تھی کہ صحرائی ماحول میں ایک نئی نسل پیدا کی جائے جس کے افراد اپنی اصل فطرت پر قائم ہوں۔ اِسی نسل میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا اور آپ کی دعوتی جدوجہد کے ذریعے اِسی نسل کے اندر سے وہ افراد پیدا ہوئے جن کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے تاریخ میں جو انقلاب آیا، اُس کے دو پہلو تھے — ایک، یہ کہ اس کے ذریعے خدا کی کتاب محفوظ ہوگئی۔ پیغمبر کے ذریعے انسانی زندگی کا ایک مستند ماڈل (authentic model) تیار ہوگیا۔ خدا کے دین کی ایک مستند تاریخ بن گئی، جب کہ اِس سے پہلے خدا کے دین کی کوئی مستند تاریخ نہیں بنی تھی، وغیرہ۔

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے جو عظیم انقلاب آیا، اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس کے ذریعے تاریخ میں ایک نیا طاقت ور عمل (strong porcess) جاری ہوا جو آخر کار اُن تمام ترقیوں تک پہنچا جن کو عام طور پر اہلِ مغرب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ تمام ترقیاں خدا کے دین کے موافق ترقیاں تھیں۔ اِن ترقیوں کے ذریعے انسان کو شکر کا اعلیٰ فریم ورک ملا۔ اِن ترقیوں کے ذریعے معرفت کے آفاقی دروازے کھلے۔ اِن ترقیوں کے ذریعے حق کی عالمی اشاعت کے ذرائع حاصل ہوئے، وغیرہ۔

غیر خدا پرست انسان کی تائید

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اظہارِ دین اور اتمامِ نور کا جو خدائی منصوبہ تھا، وہ ایک عظیم عالمی منصوبہ تھا۔ وہ اتنا بڑا منصوبہ تھا کہ صرف اہلِ ایمان کی مدد سے وہ انجام نہیں پا سکتا تھا۔ اللہ تعالی نے اِس انقلاب کو یقینی بنانے کے لیے یہ کیا کہ اہلِ ایمان کے علاوہ، دوسرے گروہوں سے تائید (support) کا کام لیا۔ اسلام کی تاریخ میں اِس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ یہاں وضاحت کے لیے صرف دو مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت 610 عیسوی میں مکہ میں ہوئی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، یہاں تائید کا ایک انوکھا معاملہ پیش آیا۔ مکہ میں قریش کے نام سے ایک قبیلہ تھا جو کعبہ کا متولی تھا۔ اُس نے اپنی سیادت کی توسیع کے لیے یہ کیا کہ عرب کی سرزمین میں موجود تمام قبائل کے بت لا کر کعبہ کی عمارت میں رکھ دیے۔ اِس طرح دھیرے دھیرے کعبہ تمام عرب قبائل کا ایک عبادتی مرکز بن گیا۔ ہر قبیلے کے لوگ اپنے بت کی زیارت اور پرستش کے لیے مکہ آنے لگے۔ اِس طرح مکہ نے تمام عرب قبائل کے لیے مقامِ اجتماع کی حیثیت اختیار کر لی۔ تمام عرب قبائل کے لوگ مسلسل طور پر مکہ آنے لگے۔ اِس طرح پیغمبر اسلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ مکہ میں رہتے ہوئے تمام عرب قبائل میں اپنا مشن پھیلا سکیں — قریش اُس وقت ایک مشرک قبیلے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اِس کے باوجود اللہ تعالی نے اُن سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے موحدانہ مشن کی تائید کا کام لیا۔

اہلِ مغرب کے ذریعے تائید

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں غیر اہلِ ایمان کی تائید کا دوسرا بڑا واقعہ وہ ہے جو بعد کے زمانے میں پیش آیا۔ یہ اہلِ مغرب کے ذریعے تائید فراہم کرنے کا واقعہ تھا۔ یہ واقعہ مغرب کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد پیش آیا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ (14:34)۔ اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کو اس کی ضرورت کی تمام چیزیں دے دی ہیں۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ

قدیم زمانے میں انسان کو یہ اشیاءِ ضرورت صرف محدود طور پر حاصل ہوئی تھیں۔ جو چیزیں دنیا میں فطری طور پر آغازِ تخلیق سے پائی جاتی تھیں، صرف اُن چیزوں تک انسان کی رسائی ہوسکی۔ مثلاً سواری کے لیے گھوڑا، وغیرہ۔ دوسری چیزیں وہ تھیں جن کے حصول کے لیے ٹکنالوجی کی دریافت ضروری تھی۔ قدیم زمانے میں انسان اِس ٹکنالوجی کو دریافت نہ کرسکا، اِس لیے وہ اِس دوسری قسم کی اشیاءِ ضرورت کو حاصل کرنے سے محروم رہا۔

یہ ٹکنالوجی صرف مغربی تہذیب کے ذریعے دریافت ہوئی اور پھر ضرورت کی بے شمار نئی چیزیں انسان کے لیے قابلِ حصول ہوگئیں۔ یہ اشیاءِ ضرورت صرف اشیاءِ ضرورت نہ تھیں، بلکہ وہ شکر خداوندی کے نئے اور عظیم تر آئٹم کی حیثیت رکھتی تھیں۔

اِسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کا مشن سارے اہلِ عالم کے لیے ہے (25:1)۔ لیکن پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے زمانے میں مشن کا یہ عالمی ابلاغ عملاً ممکن نہ ہوسکا۔ کیوں کہ اس کے لیے عالمی کمیونکیشن کی ضرورت تھی اور قدیم زمانے میں یہ عالمی کمیونکیشن وجود میں نہیں آیا تھا۔ عالمی کمیونکیشن کے ذرائع موجودہ زمانے میں پہلی بار اہلِ مغرب نے دریافت کیے۔ یہ اہلِ مغرب کی طرف سے پیغمبرانہ مشن کی خصوصی تائید کا ایک معاملہ تھا۔

اِسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آفاق اور انفس میں اللہ کی آیات (signs) چھپی ہوئی ہیں۔ یہ آیات ظاہر ہوکر انسان کے لیے تبیینِ حق کا ذریعہ بنیں گی۔ یہ گویا کائناتی سطح پر اعلیٰ معرفت کے ظہور کی پیشگی خبر تھی، مگر قدیم زمانے میں اس کا ظہور نہ ہوسکا۔ اِس کا ظہور پہلی بار موجودہ زمانے میں اہلِ مغرب کی سائنسی دریافتوں کے ذریعے ہوا۔ یہ بھی غیر اہلِ ایمان کی طرف سے پیغمبر اسلام کے مشن کی تائید کا ایک اہم معاملہ تھا۔

یہ خارجی تائید اپنے طریقے کے اعتبار سے، عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں آؤٹ سورسنگ (outsourcing) کہا جاتا ہے۔ پیغمبرانہ مشن کے لیے یہ خارجی تائید کوئی اتفاقی معاملہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک ایسا معاملہ تھا جو اللہ کی طرف سے پیشگی طور پر مقدر کردیا گیا تھا۔ اس حقیقت کو

ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3062)- اِس حدیث میں موید کے لیے ’فاجر‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے- فاجر کا مطلب ہے — بدکردار (sinner)- اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے پیغمبر کے مشن کی خارجی تائید کا جو کام ہے، وہ صرف مخلصین اور مومنین کے ذریعے نہیں ہوگا، بلکہ وہ ایسے افراد کے ذریعے بھی ہوگا جو اخلاقی اعتبار سے بدکردار اور گناہ گار ہوں گے-

مذکورہ دونوں واقعات پیغمبرانہ مشن کے لیے عظیم تائیدی واقعات تھے، مگر یہ دونوں واقعات اہلِ ایمان کی تائید سے پیش نہیں آئے، بلکہ وہ ایسے لوگوں کے ذریعے پیش آئے جو فقہ اسلامی کی اصطلاح میں ”مشرک اور فاجر“ تھے- فاجر شخص کے ذریعے تائیدِ دین کے یہ واقعات صرف تائید کے واقعات نہیں ہیں، بلکہ اِسی کے ساتھ وہ دلیلِ نبوت بھی ہیں-

اہلِ مغرب اور مغربی تہذیب

موجودہ زمانے میں مسلم مصنفین نے ہزاروں کی تعداد میں ایسی کتابیں اور مقالات شائع کیے ہیں جن کا موضوع اہلِ مغرب یا مغربی تہذیب ہوتا ہے- اِس قسم کی تحریریں عربی، اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں چھپی ہیں اور اُن کو کسی بھی مسلم کتب خانے میں دیکھا جاسکتا ہے- مثال کے طور پر چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

جاهلية القرن العشرين، محمد قطب،

دار الشروق، القاهرة 1993، عدد الصفحات: 292

عالمِ اسلام دجالی تہذیب کی زد میں، محمد موسی بھٹو، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، صفحات: 188

Islam at the Crossroads, Leopold Muhammad Asad

اِس قسم کی کتابوں میں مغرب اور مغربی تہذیب کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ تمام تر منفی تصویر ہے- اِس قسم کی کتابوں کا مشترک خلاصہ یہ ہے کہ مغرب اخلاقی پستی کی آخری حد تک پہنچ چکا ہے- اِن تحریروں کے مطابق، مغرب نام ہے — مادیت اور اباحیت اور ہوس پرستی اور لادینیت کا- گویا اہلِ مغرب کا کیس

وہی ہے جس کو حدیث میں 'الرجل الفاجر' کہا گیا ہے، یعنی بدکردار اور گناہ گار۔

اب بالفرض اگر یہ درست ہو کہ اہلِ مغرب کا کیس ''فاجر'' انسان کا کیس ہے، تب بھی مسلم مقررین اور محررین اِس معاملے میں کامل طور پر غلط قرار پائیں گے۔ کیوں کہ اِس معاملے کا دوسرا معلوم پہلو یہ ہے کہ یہی اہلِ مغرب ہیں جنھوں نے بے پناہ محنت کے بعد اُن تمام تائیدی چیزوں کو دریافت (discover) کیا جن کا ذکر بطور پیشین گوئی قرآن میں کیا گیا تھا۔ گویا کہ یہی وہ مویّد لوگ ہیں جو حدیث کی مذکورہ پیشین گوئی کا مصداق ہیں۔ ایسی حالت میں مسلم مقررین اور محررین کا فرض تھا کہ وہ کہتے کہ اہلِ مغرب کے ''فاجر'' ہونے کے باوجود ہمیں اُن کے اِس کنٹری بیوشن کا اعتراف کرنا ہے، کیوں کہ یہی لوگ ہیں جنھوں نے تائید دین کے وہ تمام اسباب مہیا کیے ہیں جو آج ہمارے لیے دینِ خداوندی کی نسبت سے بے حد ضروری ہیں۔ یہ اسباب ہمارے لیے شکر اور معرفت کا اعلیٰ آئٹم ہیں اور اِسی کے توسط سے پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ دعوت الی اللہ کے کام کو عالمی سطح پر انجام دیا جا سکے۔

تاریخ کا مثبت تصور

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے عام طور پر تاریخ کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ ان کو پوری تاریخ فساد اور خوں ریزی کا ایک جنگل معلوم ہوتی ہے۔ آدم کی تخلیق کے وقت فرشتوں نے بھی یہ شبہہ ظاہر کیا تھا (2:30)۔

اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرے کے ذریعے فرشتوں کو بتایا کہ تم پورے انسانی مجموعے کے اعتبار سے تاریخ کو دیکھ رہے ہو، اِس لیے تاریخ تم کو فساد اور خوں ریزی کا جنگل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تم تاریخ کو افراد کے اعتبار سے دیکھو، پھر تم کو نظر آئے گا کہ تاریخ کے ہر دور میں بہترین افراد پیدا ہورہے ہیں۔ یہی استثنائی افراد تاریخ کا حاصل ہیں۔

تاریخ کے مطالعے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مطالعہ کرنے والا یہ کرے کہ وہ انسان کی طرف سے آزادی کے غلط استعمال کو الگ کرکے تاریخ کا مشاہدہ کرے۔ خالق نے چوں کہ انسان کو آزادی دی ہے، اِس لیے آزادی کو غلط استعمال کرنے کے نتیجے میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

یہی وہ چیز ہے جس کو فلاسفہ عمومی حیثیت دے کر، پرابلم آف اول (problem of evil) کہتے ہیں۔ مگر انسان کی آزادی مصلحتِ امتحان کی بنا پر ہے، اِس لیے تاریخ کے مطالعے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آزادی کے غلط استعمال کے پہلو کو الگ کرکے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ حکمت تاریخ کے ہر دور کے لیے ضروری ہے، سیکولر تاریخ کے دور کے لیے بھی اور اسلامی تاریخ کے دور کے لیے بھی۔

تاریخ میں خدائی مداخلت

1۔ ہاجرہ اور اسماعیل کے ذریعے عرب کے صحرا میں ایک نئی نسل بنانا بعد کو اِسی نسل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پیدا ہوئے۔

2۔ کعبہ کا تمام قبائل کے بتوں کا مرکز بن جانا۔ اِس طرح مکہ میں آل عرب اجتماعات (All Arab Assembly) کا وقوع ممکن ہوجانا۔

3۔ یمن کے حاکم ابرہہ کا کعبہ پر حملہ، مگر اس کی ناکامی کی بنا پر کعبہ کی اجتماعی حیثیت کا محفوظ رہنا۔

4۔ مکہ میں تیرہ سالہ دعوتی جدوجہد کے ذریعے تمام صالح افراد کا اسلام میں داخل ہوجانا۔ اِنھیں منتخب افراد کو قرآن میں خیر امت (3:110) کہا گیا ہے۔

5۔ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ بدر کا پیش آنا اور اِس غزوہ میں فرشتوں کی مدد کے ذریعہ تمام سرکش افراد کا قتل کیا جانا۔

6۔ ہجرت سے پانچ سال پہلے جنگِ بُعاث میں دو قبیلوں کے درمیان جنگ ہونا، اِس جنگ میں قبائلی سرداروں کا زور ٹوٹ جانا۔

7۔ حدیبیہ (6 ہجری) کی یک طرفہ صلح کے بعد سارے عرب میں امن قائم ہونا اور سارے عرب میں اسلام کی اشاعت۔

8۔ فتح مکہ کے بعد عرب قبائل میں اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا ہونا، اس کے بعد عام الوفود کے ذریعے تمام قبائل کو تیزی سے اسلام میں داخل کرلینا۔

9۔ بازنطینی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کے درمیان جنگی ٹکراؤ ہونا اور اِس دوطرفہ جنگ میں

دونوں کا آخری حد تک کمزور ہو جانا۔

10۔ صلیبی جنگوں کے بعد مخصوص اسباب کے تحت، اہلِ مغرب کا سائنسی مطالعے کی طرف راغب ہونا اور اسلام کے موافق ،فطرت کے حقائق کا انکشاف۔

اوپر دس ایسے عوامل (factors) کو دکھایا گیا ہے جنھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں سپورٹنگ فیکٹرس (supporting factors) کا رول انجام دیا۔ یہ تمام اسباب غیر عادی (unusual) قسم کے تھے جو بلاشبہہ پیغمبر کے اپنے اختیار سے باہر تھے، حتی کہ بظاہر پیغمبر اسلام نے ان کی بابت سوچا بھی نہ تھا۔ اِن عوامل کی مدد کے بغیر یہ ممکن نہ تھا کہ پیغمبر اسلام اپنے مشن میں ایسی غیر معمولی کامیابی حاصل کرسکیں۔ یہ ناقابلِ توجیہہ واقعہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ پیغمبر اسلام کو اپنے مشن میں اللہ کی خصوصی مدد حاصل تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے تین مرحلے تھے — پہلا مرحلہ مردانِ کار یا ٹیم کی تیاری کا مرحلہ تھا۔ یہ پہلا مرحلہ آپ کی پیدائش سے پہلے لمبی مدت میں بنو اسماعیل کی صورت میں تشکیل پایا۔ دوسرا مرحلہ مختصر مرحلہ ہے جو پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کی زندگی میں پورا ہوا۔ تیسرا مرحلہ دوبارہ لمبی مدت کا مرحلہ تھا جو کہ مغربی تہذیب کی صورت میں اپنی تکمیل تک پہنچا۔

نورِ ہدایت کا اتمام

پیغمبرانہ مشن کے سلسلے میں ایک منصوبۂ الٰہی کو اظہارِ دین کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اظہارِ دین اور اتمامِ نور کی آیت قرآن کی تین سورتوں میں آئی ہے۔ سورہ الصّف کے الفاظ یہ ہیں:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

(61:8-9) یعنی وہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھادیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اللہ ہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، تاکہ وہ اُس کو سب دینوں پر غالب کردے، خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

قرآن کی اِس آیت میں اظہارِ دین سے کچھ لوگ سیاسی غلبہ مراد لیتے ہیں، مگر آیت کے الفاظ سے اِس مفہوم کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کی آیت میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ **لیظھرہ علی الدین کلّہ** ہے، نہ کہ **لیظھرہ علی الأرض کلّھا**، یعنی اِس آیت میں جس غلبہ کا ذکر ہے، وہ زمین پر ہونے والا غلبہ نہیں ہے، بلکہ وہ دین یا اَدیان پر ہونے والا غلبہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اِس سے مراد فکری اور نظریاتی غلبہ ہے، نہ کہ سیاسی اور حکومتی غلبہ۔ دوسرے لفظوں میں، اِس سے مراد غلبہ بہ مقابلہ آئڈیالوجی ہے، نہ کہ غلبہ بہ مقابلہ سیاسی اقتدار۔ اِسی طرح قرآن کی مذکورہ آیت میں 'متمّ نورہ' کا لفظ آیا ہے۔ قرآن میں 'متمّ حکمہ' کا لفظ نہیں آیا ہے، یعنی اِس سے مراد نور کا اتمام ہے، نہ کہ حکومت کا اتمام۔ اِس اتمام کا مطلب یہ نہیں کہ ابھی مسلمانوں کی حکومت مکہ مدینہ میں قائم ہوئی ہے، آئندہ ان کی حکومت سارے عالم میں قائم ہوجائے گی۔

پیغمبر کا مشن اصلاً ایک غیر سیاسی مشن (non-political mission) ہوتا ہے۔ پیغمبر کے مشن کو بتانے کے لیے قرآن میں جو الفاظ آئے ہیں، اُن میں سے کوئی بھی لفظ سیاسی لفظ نہیں۔ مثلاً انذار، تبشیر، ابلاغ، دعوت، شہادت، وغیرہ۔ ایسی حالت میں پیغمبر کے مشن کے اظہار یا اتمام کو بتانے کے لیے وہی تعبیر درست ہوسکتی ہے جو پیغمبرانہ مشن کی روح کے مطابق ہو، اور وہ بلاشبہہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے عالمی سطح پر خدا کے پیغام کی توسیع واشاعت۔

پیغمبر کے مشن کی سیاسی تعبیر کرنا یا اس کو حکومت کی اصطلاحات میں بیان کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کی تردید کے ہم معنی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اور دوسرے انسانوں کے درمیان جو مساوات (equation) ہے، وہ حاکم اور محکوم کی مساوات ہے، جب کہ صحیح تصور کے مطابق، اہلِ ایمان اور دوسرے انسانوں کے درمیان جو مساوات ہے، وہ داعی اور مدعو کی مساوات ہے، نہ کہ حاکم اور محکوم کی مساوات۔ اِس تصور کے مطابق، پیغمبر کے مشن کا اظہار اور اتمام بہ اعتبارِ ''نور'' متعین کیا جائے گا، نہ کہ بہ اعتبارِ حکومت، اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر کے مشن کے ساتھ ایسے اسباب ووسائل جمع ہوں جو پیغمبر کے مشن کی عمومی اشاعت میں تائید کا کام دیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبرانہ مشن کی اشاعت کے لیے صرف

روایتی وسائل موجود تھے۔ اِس لیے ایسا ہوا کہ اگر چہ پیغمبر کا مشن ایک عالمی مشن تھا، لیکن وہ وسائل کی محدودیت کی بنا پر اپنے ابتدائی دور میں پورے عالم تک پہنچ نہ سکا۔

قرآن کی مذکورہ آیت (61:8) ایک اعتبار سے پیشین گوئی ہے۔ اِس آیت میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ مستقبل میں ایسے حالات پیدا کرے گا، جب کہ تبلیغِ قرآن کا عالمی نشانہ پورا کیا جاسکے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے زمانے میں جو انقلاب آیا، اس کے ذریعے دراصل تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کرنا تھا۔ یہ پراسس نہایت طاقت ورصورت میں جاری ہوا، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں وہ اپنے نقطۂ انتہا (culmination) تک پہنچ گیا۔

موجودہ زمانے کو ایج آف کمیونکیشن (age of communication) کہا جاتا ہے۔ یہ ایج آف کمیونکیشن کیا ہے۔ یہ دراصل دعوت بذریعہ روایتی ذرائع کو دعوت بذریعہ ٹکنالوجی کے دور میں پہنچانا ہے۔ موجودہ زمانے میں کمیونکیشن کے جو ذرائع پیدا ہوئے ہیں، انھوں نے دعوت بذریعہ روایتی ذرائع کو دعوت بذریعہ کمیونکیشن کے دور میں پہنچادیا ہے۔ اب یہ پوری طرح ممکن ہوگیا ہے کہ پیغمبرانہ دعوت کی اشاعت عالمی سطح پر انجام دی جائے۔ جدید ٹکنالوجی اور دوسرے معاون حالات کے نتیجے میں آج یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی سیاسی اقتدار یا کسی پولٹکل ایمپائر کے بغیر غیر سیاسی دائرے میں اسلامی دعوت کا ایک عالمی ایمپائر قائم کیا جاسکے۔ اِس ایمپائر کو غیر سیاسی دعوہ ایمپائر (non-political dawah empire) کہا جاسکتا ہے۔ جدید کمیونکیشن اور پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کو استعمال کرکے عالمی دعوت کی اُس پیشین گوئی کو واقعہ بنایا جاسکے جس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (25:1)۔

ربانی تہذیب کا ظہور

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے تاریخ میں جو انقلاب آیا، وہ محدود طور پر صرف ایک سیاسی واقعہ نہ تھا۔ اُس کا تعلق پوری تاریخ بشری سے تھا۔ جس چیز کو قرآن میں ''اتمامِ نور'' کہا گیا ہے، وہ دوسرے لفظوں میں تہذیبِ ربانی (divine civilization) کو قائم کرنے کا معاملہ تھا۔ اللہ کو یہ

مطلوب تھا کہ اس کی کتاب (قرآن) محفوظ ہو جائے۔ تاریخ میں ایسے انقلابات ظہور میں آئیں جن کے نتیجے میں دنیا میں پرنٹنگ پریس کا دور آئے۔ فطرت میں چھپے ہوئے راز منکشف ہوں، تاکہ انسان کو علمی سطح پر خالق کی معرفت حاصل ہو۔ کمیونکیشن کے ذرائع دریافت ہو کر انسان کے استعمال میں آسکیں۔ اِسی طرح یہ ہو کہ دنیا میں مذہبی آزادی کا دور آئے۔ دینِ حق کی عالمی اشاعت ممکن ہو جائے۔ معرفت کے تمام چھپے ہوئے خزانوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو جائے، وغیرہ۔

اِس پورے معاملے کو تہذیب ربانی کے ظہور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے یہی انقلابی واقعہ پیش آیا اور فطرت کے قانون کے مطابق، مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اکیسویں صدی تک پہنچا جو اس کی تکمیل کا مرحلہ ہے۔ تاہم تکمیل کا یہ مرحلہ بہ اعتبار امکان ہے، نہ کہ بہ اعتبار واقعہ۔ ربانی تہذیب کیا ہے، وہ خدا کا قائم کردہ ایک بامعنی تسلسل ہے جو کسی انقطاع کے بغیر تاریخِ انسانی میں مسلسل طور پر جاری ہے۔

اب اہلِ اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ تاریخ کے اشارے کو سمجھیں، وہ پیدا شدہ مواقع کو استعمال کر کے دینِ توحید کو پرامن انداز میں تمام عالم تک پہنچا دیں۔ یہی پیغمبرانہ مشن کی وہ تکمیل ہے جس کی پیشین گوئی حدیثِ رسول میں کی گئی تھی۔ اِس عالمی رول کو ادا کرنے کی صرف ایک ہی شرط ہے، وہ یہ کہ اہلِ اسلام قوموں کے خلاف، نفرت اور تشدد کے کلچر کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں اور کسی شرط کے بغیر پرامن دعوتی کلچر کو اختیار کر لیں۔

اسلام کی دریافت

قرآن کی سورہ المائدہ میں ایک آیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دورِ آخر میں نازل ہوئی۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (5:3) یعنی آج منکر تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے، پس تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کرلیا۔

قرآن کی اِس آیت میں اکمالِ دین یا تکمیلِ دین (completion of religion) سے مراد فہرستِ احکام کی تکمیل نہیں ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اسلام حکومتی معنوں میں غالب ہوگیا ہے۔ اِس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام کی راہ کے موانع (obstacles) ختم ہوگئے۔ خود آیت کے الفاظ سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ کیوں کہ آیت میں اکمالِ دین کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ اب خشیتِ انسانی (human fear) کا دور ختم ہوگیا۔ اب خدا کے دین کے حق میں ایسے اسباب جمع ہوگئے ہیں جو اُس کو اِس سے محفوظ کر دیتے ہیں کہ وہ ماضی کی طرح انسانی رکاوٹوں اور مذہبی جبر کا شکار رہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں ہزاروں سال کے درمیان مسلسل پیغمبر آتے رہے (23:44)۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، کسی بھی پیغمبر کی تعلیمات محفوظ نہ رہ سکیں، حتی کہ اِن پیغمبروں کا مدوّن تاریخ (recorded history) میں کوئی ریفرنس بھی موجود نہیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ پیغمبروں کے مشن کو محفوظ رکھنے کے لیے جو تائیدی عناصر (supporting elements) درکار تھے، وہ ان کو حاصل نہ ہوسکے۔ پیغمبر آخر الزماں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کے ساتھ اللہ تعالی نے اِن تائیدات کو جمع کر دیا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوا کہ آپ کی تعلیمات ابدی طور پر محفوظ ہوجائیں۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں

اِسی معاملے کو اِن الفاظ میں بیان فرمایا کہ اب خدا کا دین خشیتِ انسانی کے دور سے باہر آ گیا ہے۔

پچھلے پیغمبروں کی تعلیمات کے محفوظ نہ ہونے کا سبب کیا تھا، اس کا سبب یہ تھا کہ حفاظت کا یہ کام اسباب کے ذریعے ہوسکتا تھا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کے ساتھ یہ اسباب جمع نہیں ہوئے۔ مثلاً کسی پیغمبر کا کام یا تو شخصی اعلان تک محدود رہا، یا یہ ہوا کہ صرف چند افراد اُن کا ساتھ دینے والے بنے، اور صرف چند افراد حفاظتِ دین کے لیے کافی نہیں۔ اللہ تعالی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے ساتھ ایک خصوصی معاملہ یہ کیا کہ پیشگی طور پر ایک موافق نسل تیار کی۔ نسل سازی کا یہ کام حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کے ذریعے عرب کے صحرا میں کیا گیا۔

عرب کے صحرا میں نسل سازی کا یہ مشن تقریباً ڈھائی ہزار سال تک چلتا رہا، اس کے بعد ایک نئی نسل تیار ہوئی جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ اِسی نسل میں 570 عیسوی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ اِس نسل کے درمیان آپ نے پیغمبر کی حیثیت سے تقریباً 23 سال تک کام کیا۔ ان میں سے عورتوں اور مردوں کی ایک بڑی تعداد آپ کے دین میں داخل ہوگئی۔ اِس طرح وہ گروہ بنا جس کو اصحاب کہا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق، اصحابِ رسول (عورت اور مرد) کی تعداد تقریباً 2 لاکھ تھی۔ اصحابِ رسول کی اِسی جماعت کے ذریعے وہ موافق اسباب فراہم ہوئے جن کو ہم نے تائیدی عناصر (supporting elements) کا نام دیا ہے۔

اصحابِ رسول کا رول

اصحابِ رسول کی یہی جماعت ہے جس نے پہلی بار اِس کو ممکن بنایا کہ خدا کے دین کا ایک محفوظ ایڈیشن تیار ہو گیا۔ اِس سلسلے میں اصحابِ رسول کے رول کے مختلف پہلو ہیں۔ اِس کا ایک پہلو یہ ہے کہ پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ایک تاریخی شخصیت بن جائے۔ قدیم دور میں جو پیغمبر آئے، اُن کی تعداد روایات میں تقریباً ایک لاکھ 24 ہزار بتائی گئی ہے، لیکن معروف تاریخی معیار کے مطابق، اِن میں سے کسی بھی پیغمبر کی حیثیت ''تاریخی پیغمبر'' کی نہیں ہے، حتی کہ حضرت مسیح جو پیغمبر اسلام سے قریب تر زمانے میں آئے، ان کے بارے میں بھی برٹرینڈ رسل (وفات: 1970) نے

لکھا ہے کہ — تاریخی طور پر یہ امر سخت مشتبہ ہے کہ مسیح کا کبھی وجود بھی تھا:

Historically, it is quite doubtful whether Christ ever existed at all. (*Why I Am Not A Christian,* 1967, Touchstone, UK, p. 266)

تاریخ میں پیغمبروں کا اندراج نہ ہونے کا سبب کیا تھا۔ اِس کا سبب تاریخ نگاری کا قدیم ذوق تھا۔ ابن خلدون (وفات: 1406) سے پہلے، تاریخ کو بادشاہوں کی تاریخ کے ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ قدیم پیغمبروں کے ساتھ چوں کہ حکومت اور سیاست کے واقعات جمع نہیں ہوئے، اِس لیے ان کو تاریخی طور پر ناقابلِ ذکر سمجھ لیا گیا۔

اِس صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالی نے گویا مورخین (historians) کی ایک نئی نسل (generation) تیار کی۔ یہ صحابہ اور تابعین تھے جنھوں نے اِس معاملے میں عملاً وہ رول انجام دیا جس کو اِس سے پہلے پروفیشنل مورخین انجام دیتے تھے۔ صحابہ اور تابعین نے پیغمبر اسلام اور آپ کی تعلیمات سے متعلق تمام واقعات کا مستند ریکارڈ تیار کیا، پہلے حافظے کی صورت میں اور پھر تحریر کی صورت میں۔ یہی وہ محفوظ ریکارڈ ہے جس کو آج قرآن اور حدیث اور سیرت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ ریکارڈ پہلے صحابہ کے ذریعے تیار ہوا، پھر تابعین اور تبع تابعین کے ذریعے اس کا تسلسل جاری رہا۔ اِسی طرح امت کی بعد کی نسلوں نے اِس کام کی تدوین میں مزید کارنامے انجام دیے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں پریس کا دور آگیا۔ اب پیغمبر اسلام اور آپ کے متعلق تمام معلومات کا تاریخی ریکارڈ مطبوعہ کتابوں کی صورت میں محفوظ ہوگیا۔ اِس طرح ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام کو استثنائی طور پر ایک مستند تاریخی پیغمبر کا درجہ حاصل ہوگیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس حیثیت کا اعتراف خود سیکولر مورخین نے کھلے طور پر کیا ہے۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مستشرق ارنسٹ رینان (Joseph Ernest Renan) جس کی وفات 1892 میں ہوئی، اس نے 1851 میں ایک مقالہ شائع کیا۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Muhammad and the Origins of Islam.

اِس مقالے میں ارنسٹ رینان نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ — بڑے مذاہب کے دوسرے بانیوں کے برعکس، پیغمبر محمد واحد شخص ہیں جو کہ تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے:

Unlike the other founders of major religions, the Prophet Muhammad was born in the full light of history.

پیغمبر اسلام کا مشن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی مشن کیا تھا، اس کو قرآن کی دو آیتوں میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: يُرِيدُونَ لِيُطْفِـُٔوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ، هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (61:8-9) یعنی وہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونک سے بجھا دیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کو ضرور مکمل کرے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اللہ ہی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، تا کہ وہ اس کو تمام دین پر غالب کردے، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

قرآن کی اِن آیتوں میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں: ہدیٰ اور دین۔ اِسی کے ساتھ اِن میں دو اور لفظ استعمال کیے گئے ہیں: اتمام اور اظہار۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اتمام کا تعلق ہدیٰ سے ہے اور اظہار کا تعلق دین سے۔ اِس میں دراصل اللہ کے دو مطلوب کا ذکر ہے۔ ایک ہے، نورِ ہدایت کا اتمام، اور دوسرا ہے، دینِ خداوندی کا اظہار و غلبہ۔

نورِ ہدایت کیا ہے، وہ اصلاً دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ دو چیزیں قرآن اور سنتِ رسول ہیں۔ قرآن، اللہ کے دین کا نظریاتی متن (ideological text) ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ قرآن کا مستند ہدایت نامہ اپنی کامل صورت میں محفوظ ہوجائے، تا کہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے وہ خدائی ہدایت کو جاننے کا مستند ذریعہ ہو۔ اِس مطلوب الٰہی کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (15:9) یعنی قرآن کو ہم نے

اتارا ہےاور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قرآن کی حفاظت مکمل طور پر ایک پر امن کام تھا۔ اللہ تعالی نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ قرآن کامل طور پر ایک محفوظ کتاب بن جائے، تاکہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے لیے خدا کی ہدایت کو معلوم کرنے کا مستند ماخذ بن سکے۔ یہ کام مکمل طور پر انجام پا گیا۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج پریس کے دور میں قرآن کے چھپے ہوئے نسخے تمام دنیا میں اس طرح موجود ہیں کہ ہر عورت اور مرد جب چاہے، اس کو حاصل کر سکے۔

حفاظتِ قرآن کے اِس واقعے کا اعتراف سیکولر محققین نے بھی کھلے طور پر کیا ہے۔ مثال کے طور پر اسکاٹش مستشرق سر ولیم میور (Sir W. Muir) جس کی وفات 1905 میں ہوئی، اس نے قرآن کی بابت لکھا ہے کہ — غالباً دنیا میں کوئی دوسری کتاب ایسی موجود نہیں جو کہ 12 صدیوں تک اپنی کامل حفاظت کو برقرار رکھے:

There is probably, in the world, no book which has remained for 12 centuries with so pure a text.

(*The Life of Muhammad from Original Sources,* p. xxiii)

قرآن کے بعد، خدا کے نورِ ہدایت کا دوسرا جزء وہ ہے جس کو قرآن میں پیغمبر خدا کا اسوہ حسنہ (33:21) کہا گیا ہے، یعنی عملی اعتبار سے خدا پرستانہ زندگی گزارنے کا مستند نمونہ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک پُراز واقعات زندگی (eventful life) تھی۔ آپ کی زندگی میں ہر طرح کے حالات پیش آئے۔ آپ نے ہر صورت حال میں خدا پرستانہ زندگی کا عملی نمونہ قائم کیا۔ آپ کے اِس اعلی نمونے کو قرآن میں خلقِ عظیم (68:4) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کے یہ نمونے حدیث اور سیرت کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

اسلام کا یہ پہلو اتنا زیادہ واضح ہے کہ سیکولر مورخین نے بھی کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی ایک مثال برٹش اسکالر ڈیوڈ جارج ہاگرتھ (David George Hogarth) ہے، جس کی وفات 1927 میں ہوئی۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ —

پیغمبر اسلام کا روزمرہ کا سلوک خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس نے ایسی حیثیت اختیار کر لی جس کی اب تک لاکھوں لوگ اہتمام کے ساتھ پیروی کر رہے ہیں۔ انسانی نسل کے کسی طبقے کا کوئی آدمی یہ درجہ حاصل نہ کرسکا کہ ایک معیاری انسان کی حیثیت سے اِس طرح اس کا کامل اتباع کیا جائے:

Serious or trivial, his daily behaviour has instituted a course which millions observe at this day with conscious mimicry. No one regarded by any section of the human race as perfect man has been imitated so minutely. (*Arabia,* p. 52)

ہُدیٰ سے مراد نظریاتی ماڈل ہے۔ خدا کی ہدایت کا یہ نظریاتی ماڈل قرآن اور سنتِ رسول کی شکل میں مستند طور پر محفوظ ہوگیا ہے۔ یہ نظریاتی ماڈل اب ہمیشہ کے لیے پیغمبر کا بدل ہے۔

اظہارِ دین

قرآن کی مذکورہ آیتوں میں دو چیزوں کا ذکر ہے — ہدیٰ اور دین۔ دونوں کی حیثیت ایسے مطلوب کی ہے جن کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے ذریعے حاصل کرنا مقدر تھا۔ لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہدیٰ سے مراد ایک نظریاتی مطلوب ہے، اور دین سے مراد ایک عملی مطلوب۔ جب قرآن کا متن محفوظ ہوگیا اور پیغمبر اسلام کا ماڈل حدیث اور سیرت کی کتابوں کے ذریعے مستند طور پر مدوّن ہوگیا تو اس کے بعد وہ مطلوب آخری طور پر حاصل ہوگیا جس کو آیت میں ہدیٰ کے لفظ میں بیان کیا گیا تھا۔ اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے سے اپنی ہدایت کا مستند ماخذ تیار کر دیا۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اِس خدائی ماخذ سے اپنے لیے ہدایت حاصل کرتا ہے یا ہدایت حاصل نہیں کرتا۔

اظہارِ دین کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ اِس معاملے میں اظہار، یعنی غلبہ مطلوب ہے، نہ کہ صرف نظریاتی معیار کا وجود میں آنا۔ اِس لیے اظہارِ دین سے ایک ایسا مطلوب مراد لیا جائے گا جو بالفعل وقوع میں آیا۔ بالفعل وقوع میں آنے سے کم درجے کی کوئی چیز اس کی تفسیر نہیں بن سکتی۔ اِس آیت میں اظہارِ دین سے حکومتی نظام یا قانونی نظام مراد نہیں لیا جاسکتا۔ اِس لیے کہ تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ

پیغمبراسلام کے زمانے میں یا آپ کے بعد کامل معنوں میں ایسا کوئی نظام نہیں بنا اور نہ بن سکتا ہے، اِس لیے کہ اِس دنیا کو اللہ تعالی نے انسانی آزادی کے اصول پر بنایا ہے(18:29)۔ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ یہاں معیاری معنوں میں کوئی کامل نظام بنایا جاسکے۔ امتحان کی مصلحت کے تحت دی ہوئی انسانی آزادی اس طرح کے معیاری نظام کو قائم کرنے میں حتمی طور پر مانع ہے۔اِس دنیا میں جب آئڈیل کا حصول ممکن نہیں تو آئڈیل کے حصول کو نشانہ بنانا بھی درست نہیں ہوسکتا۔

ایسی حالت میں، اظہارِ دین کی آیت میں دین کے اظہار کی ایسی تفسیر کرنی پڑے گی جو عملی طور پر وقوع میں آئی ہو۔اِس اعتبار سے غور کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اِس آیت میں دین سے مراد شرعی دین نہیں ہے، بلکہ فطری دین ہے، اور اظہارِ دین کا مطلب ہے انسانی زندگی میں خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، حالتِ فطری کا قائم ہوجانا۔ دین کا یہ مفہوم قرآن کی ایک اور آیت میں موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: أَفَغَيْرَ دِينِ اللّٰهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (3:83)۔ اِس آیت میں دین سے مراد دینِ شرعی نہیں ہے، بلکہ دینِ فطری ہے، یعنی وہ دین جس پر تمام کائنات بالفعل قائم ہے۔ یہ دین فطری کیا ہے، وہ قرآن کی اِس آیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے: الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ (67:2)۔

اصل یہ ہے کہ اللہ نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کو پیدا کرکے سیارہ ارض پر بسایا۔ انسان کو زمین پر بسانا بطور امتحان (test) تھا، تاکہ امتحانی حالات سے گزار کر احسن العمل افراد کا انتخاب کیا جائے، یعنی ایسے عورت اور مرد کا انتخاب جنھوں نے کامل آزادی کے باوجود اپنے آپ کو پوری طرح حدودِ الٰہی کا پابند بنایا، جنھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال (misuse) نہیں کیا۔ یہی منتخب افراد وہ لوگ ہیں جن کو پوری تاریخ سے لے کر ابدی جنتوں میں بسایا جائے گا۔ زمین پر یہ آزادانہ ماحول اللہ کو لازمی طور پر مطلوب ہے۔ آزادی کے اِس نظام کو کوئی بھی شخص یا گروہ اگر منسوخ (abolish) کرے تو اللہ ہرگز اس کو قبول نہیں کرے گا، وہ ایسے افراد یا گروہ کا لازماً خاتمہ کردے گا۔

بادشاہت کے نظام کا خاتمہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت 610 عیسوی میں ہوئی۔ اُس وقت یہ حال تھا کہ ساری دنیا میں کچھ انسانوں نے بادشاہت کا نظام قائم کر دیا تھا۔ یہ شاہی نظام عملاً جبریت (despotism) کے ہم معنی تھا۔ اِس نظام نے انسانوں سے اُس آزادی کو چھین لیا تھا جو اللہ نے ان کو عطا کی تھی۔ یہ صورتِ حال اللہ کو مطلوب نہیں تھی، کیوں کہ وہ اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) کی منسوخی کے ہم معنی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ اِس جابرانہ نظام سے ٹکرا کر اس کو ختم کر دیں، تاکہ دنیا میں دوبارہ اللہ کی مطلوب حالتِ فطری قائم ہو جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اُس زمانے میں ایک طرف عرب میں ملکی سطح پر قبائلی نظام تھا۔ اِس قبائلی نظام نے بھی عملاً انسانی آزادی کو ختم کر رکھا تھا۔ اِس صورتِ حال کا اشارہ قرآن کی مختلف آیتوں میں کیا گیا ہے۔ مثلاً: أَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ (96:9) یعنی کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو منع کرتا ہے، ایک بندے کو جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو۔

پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کا پہلا ٹکراؤ اس قبائلی نظام سے ہوا۔ اِس کے نتیجے میں محدود نوعیت کی کچھ جنگیں (limited wars) پیش آئیں۔ آخر کار 8 ہجری میں مکہ فتح ہوا، جو عرب کے قبائلی نظام کا مرکز تھا۔ فتح مکہ کے بعد سارے عرب میں قبائل کا زور ٹوٹ گیا اور آزادی کی حالت قائم ہوگئی۔ فتح مکہ کے بعد اصحاب رسول کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اِس غلبہ کا مرکز مدینہ تھا۔ یہ غلبہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے حکومت قائم ہونے کے ہم معنی نہ تھا، بلکہ وہ صرف یہ تھا کہ انتظامیہ (administration) قبائلی سرداروں کے ہاتھ سے نکل کر اصحابِ رسول کے ہاتھ میں آ گیا۔

اِس اعتبار سے دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ عرب کے باہر اُس وقت دو بڑی شہنشاہتیں قائم تھیں۔ ایک، ساسانی ایمپائر (Sassanid empire) اور دوسرے، بازنتینی ایمپائر (Byzantine empire)۔ ساسانی ایمپائر کا دارالسلطنت عراق کا قدیم شہر ساسانیان (Ctesiphon) تھا اور بازنتینی ایمپائر کا دار السلطنت ترکی کا شہر قسطنطنیہ (Constantinople) تھا۔

ساسانی ایمپائر دراصل اُس وقت کے رومن ایمپائر کا مشرقی بازو تھا۔ یہ دونوں ایمپائر عرب کے قریب واقع تھے اور وہ اُس وقت کی دنیا میں بادشاہت پر مبنی جبری نظام کے نمائندے بنے ہوئے تھے۔ اِن دونوں ایمپائر نے اللہ کی دی ہوئی آزادی کو عملاً منسوخ کر رکھا تھا، جو کہ اللہ کو کسی حال میں مطلوب نہ تھا۔ بازنطینی سلطنت کا اقتدار 15 ملکوں پر تھا۔ اس کا خاتمہ 678 عیسوی میں ہوا۔ اور ساسانی سلطنت کا اقتدار 13 ملکوں پر تھا۔ اس کا خاتمہ 651 عیسوی میں ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن حکمرانوں کو اپنے نمائندوں کے ذریعے خطوط بھیجے۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ حکمراں پر امن طور پر اپنے جابرانہ نظام کو ختم کرنے کے لیے تیار ہوجائیں، مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ساسانی حکمراں نے آپ کے مکتوب کو اتنا حقیر سمجھا کہ اس نے اس کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے بعد پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کا دونوں سے ٹکراؤ پیش آیا۔ اِس ٹکراؤ میں اللہ کی مدد پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کے ساتھ تھی، چناں چہ وہ پوری طرح کامیاب ہوئے۔

یہ ایک عظیم تاریخی واقعہ تھا، جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ چناں چہ اللہ نے ایک اسرائیلی پیغمبر حبقّوق کے ذریعے اس کی پیشگی خبر دے دی تھی جو موجودہ بائبل میں بدستور موجود ہے۔ اِس پیشگی خبر کے الفاظ یہ ہیں — وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں:

He stood and measured the earth; He looked and startled the nations. And the everlasting mountains were scattered, the perpetual hills bowed. His ways are everlasting (Habakkuk 3:6)

مذکورہ بیان میں ''وہ'' سے مراد پیغمبر اسلام ہیں، اور ''پہاڑیوں'' سے مراد سیاسی پہاڑیاں ہیں، یعنی ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر۔ ''اس کی راہیں ازلی ہیں'' سے مراد ہے خدا کے دین کا ابدی طور پر محفوظ ہوجانا۔ بائبل کی یہ پیشین گوئی پیغمبر اسلام کے ذریعے کامل طور پر پوری ہوئی۔

نئے دور کا آغاز

جبر پر مبنی مذکورہ دونوں سیاسی ایمپائر کا خاتمہ ساتویں صدی عیسوی میں ہوا۔ یہ دونوں ایمپائر

آزادانہ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ جب یہ دونوں ایمپائر ختم ہوئے تو دنیا میں آزادی کا ایک نیا دور آیا۔ اِس نئے دور کے حالات نہ صرف مسلم مورخین کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ سیکولر مورخین نے بھی کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔

اِنھیں سیکولر مورخین میں سے ایک فرانسیسی مورخ ہنری پرین (Henri Pirenne) ہے، جس کی وفات 1935 میں ہوئی۔ ہنری پرین نے اپنے مطالعے کے نتیجے میں کھلے طور پر اِس تاریخی حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ ہنری پرین نے لکھا ہے کہ ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر نے دنیا میں مطلق شہنشاہیت (monarchical absolutism) کا نظام قائم کر رکھا تھا۔ اصحابِ رسول نے اپنی غیر معمولی قربانی کے ذریعے اِس نظام کو توڑ دیا۔ اِس واقعے کے نتیجے میں تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ ہنری پرین کے الفاظ میں — اسلام نے زمین کے نقشے کو بدل دیا۔ تاریخ کے روایتی نظام کا خاتمہ ہوگیا:

Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown. (*History of Western Europe*, p. 46)

ساتویں صدی عیسوی میں جب سیاسی جبر کے نظام کا خاتمہ کیا گیا تو اس کے بعد دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا۔ یہ انقلاب فوری نتیجے کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ ایک پراسس (process) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس کے بعد انسانی زندگی میں پہلی بار ایک نیا تاریخی عمل (historical process) شروع ہوا۔ یہ تاریخی پراسس برابر چلتا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنے آخری نقطہ انتہا (culmination) تک پہنچ گیا۔ یہ آخری نقطہ انتہا وہی ہے جس کو عام طور پر مغربی تہذیب (western civilization) کہا جاتا ہے۔ اِس تاریخی عمل کے دو بڑے دھارے تھے — ایک، وہ جس کو جدید اصطلاح میں، جمہوریت (democracy) کہا جاسکتا ہے۔ اور دوسرا، وہ جس کو جدید ٹکنالوجی پر مبنی صنعت کہنا درست ہوگا۔

عام طور پر مسلم علما مغربی تہذیب کے بعض ناپسندیدہ پہلو کو دیکھ کر اس کے بارے میں منفی ہوگئے ہیں، مگر یہ ناپسندیدہ پہلو دراصل مغربی تہذیب کا کلچرل پہلو ہے، وہی اصل مغربی تہذیب نہیں ہے۔ اصل مغربی تہذیب اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہی چیز ہے جس کو ہم نے خدا کے دین کے حق میں تائیدی عنصر کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

جمہوریت کا دور

اہلِ علم کے درمیان عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) کے اعتبار سے جو ترقیاں ہوئی ہیں، اُن سب کی بنیاد جمہوریت ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دراصل انقلاب فرانس (1789) تھا جس کے بعد دنیا میں جمہوریت کا دور آیا، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انقلاب فرانس (French Revolution) ایک تاریخی عمل کا نقطہ انتہا تھا۔ یہ تاریخی عمل انقلاب فرانس سے بہت پہلے عرب میں اسلامی انقلاب کے بعد شروع ہوا۔

قرآن میں اِس معاملے میں یہ اصولی حکم اِن الفاظ میں دیا گیا تھا: أَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) یعنی وہ اپنا کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں:

Their affairs are decided by mutual consultation.

وہ چیز جس کو موجودہ زمانے میں نظام جمہوریت کہا جاتا ہے، اُسی کو قرآن میں نظامِ شوری کہا گیا ہے۔ شوری کا یہ تصور اسلام کے اجتماعی نظام کی بنیاد ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کا جو اجتماعی نظام بنا، اس کو عام طور پر خلافت کہا جاتا ہے۔ اِس خلافت کا اگر دوسرا نام تجویز کرنا ہو تو یقیناً وہ جمہوری خلافت ہوگا۔ اِس معاملے کی ایک مثال خلیفہ ثانی عمر فاروق (وفات: 644ء) کا ایک واقعہ ہے۔ اِس واقعے کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''خلیفہ دوم عمر فاروق کے زمانے میں عمرو بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ انھوں نے ایک بار گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اِس دور میں گورنر کے بیٹے کا گھوڑا بھی شریک تھا، مگر جب دوڑ ہوئی تو ایک مصری (غیر مسلم) کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ مصری نے فتح کے جوش میں کوئی ایسا جملہ کہا جو گورنر کے صاحب زادے (محمد بن عمرو بن العاص) کو برا معلوم ہوا اور انھوں نے مذکورہ مصری کو کوڑے سے مار دیا۔ مارتے ہوئے ان کی زبان سے نکلا: خذها وأنا ابن الأكرمين (یہ لو، اور میں شریفوں کی اولاد ہوں)۔ حضرت انس بن مالک اِس قصے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ مصری اِس کے بعد مصر سے چل کر مدینہ پہنچا اور خلیفہ عمر

فاروق سے شکایت کی کہ گورنر کے لڑکے نے اس طرح اس کو کوڑے سے مارا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو، اور فوراً اپنے ایک خاص آدمی کو مصر بھیجا کہ عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے محمد بن عمرو جس حال میں ہوں، اسی حال میں ان کو لے کر مدینہ آؤ۔ چناں چہ وہ لوگ مدینہ لائے گئے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو خلیفہ عمر نے فرمایا: أين المصري، دونك الدرة فاضرب بها ابنَ الأكرمين (مصری کہاں ہے۔ یہ کوڑا لو اور اس سے شریف زادہ کو مارو)۔ اس کے بعد مصری نے کوڑا لیا اور گورنر مصر کے سامنے ان کے صاحب زادہ کو مارنا شروع کیا۔ وہ مارتا رہا، یہاں تک کہ ان کو زخمی کر دیا۔ خلیفہ عمر درمیان میں کہتے جاتے تھے کہ شریف زادہ کو مارو۔ جب وہ خوب مار چکا تو خلیفہ عمر فاروق نے کہا کہ ان کے والد عمرو بن العاص کے سر پر بھی ایک کوڑا مارو، کیوں کہ خدا کی قسم، ان کے بیٹے نے صرف اپنے باپ کی بڑائی کے زور پر تم کو مارا (فو الله ما ضربك ابنه إلا بفضل سلطانه)۔ مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین، جس نے مجھ کو مارا تھا، اس کو میں نے مار لیا۔ اِس سے زیادہ کی مجھے حاجت نہیں۔ خلیفہ عمر نے کہا: خدا کی قسم، اگر تم ان کو بھی مارتے تو ہم تمھارے اور ان کے درمیان حائل نہ ہوتے، یہاں تک کہ تم خود ہی ان کو چھوڑ دو۔ پھر آپ نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر فرمایا: یا عمرو، متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحراراً (اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالاں کہ اُن کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا)''۔

سيرة عمر بن الخطاب، علي محمد الصلاّبي (1/306)

ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی انقلاب کے تحت پیدا ہونے والا یہ جمہوری پراسس (democratic process) تاریخ میں سفر کرتا رہا۔ آخری کار وہ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے مغربی یورپ پہنچا۔ خلیفہ عمر فاروق کے مذکورہ واقعے کے تقریباً 11 سو سال بعد فرانس کے جمہوری مفکر روسو (Jean Jacques Rosseau) نے اپنی مشہور کتاب سوشل کنٹریکٹ (*Contract Social*) 1762 میں شائع کی۔ اِس کتاب کا پہلا جملہ خلیفہ عمر فاروق کے قول کی بازگشت تھا۔ کتاب کا وہ پہلا

جملہ یہ تھا — انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chains.

پیغمبر اسلام کی وفات کے تقریباً 30 سال بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ شورائی خلافت اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے، ایک خاندانی خلافت بن گئی، لیکن اسلامی انقلاب کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ اِس ظاہری تبدیلی کے باوجود خلافت کا جمہوری مزاج بدستور باقی رہا۔ اِس معاملے کی بہت سی مثالیں تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بطور مثال یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

ہارون رشید کا ایک واقعہ

ہارون رشید عباسی دور کا پانچواں خلیفہ ہے۔ وہ 766 میں پیدا ہوا اور 809 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک واقعہ اِن الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: وذُكر أن يهودياً كانت له حاجة عندهارون الرشيد، فاختلف إلى بابه سنةً ، فلم يقض حاجته، فوقف يوماً على الباب- فلما خرج هارون سعى حتى وقف بين يديه وقال: اتق الله يا أمير المؤمنين، فنزل هارون عن دابته وخرّ ساجداً- فلما رفع راسه أمر بحاجته فقضيت- فلما رجع قيل له: يا أمير المؤمنين، نزلت عن دابتك لقول يهوديّ- قال: لا، ولكن تذكرتُ قولَ الله تعالى: وإذا قيل له اتق الله أخذته العزة بالإثم، فحسبه جهنم، ولبئس المهاد- (تفسير القرطبي، 19/3) یعنی کہا جاتا ہے کہ ایک یہودی تھا جس کو ہارون رشید سے ایک کام تھا۔ وہ شخص اِس کام کے لیے خلیفہ کے دروازے پر ایک سال تک جاتا رہا، مگر خلیفہ نے اس کی ضرورت پوری نہ کی، پھر ایک دن وہ یہودی، خلیفہ کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ جب ہارون رشید باہر نکلا تو وہ شخص تیزی سے آکر خلیفہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور کہا — اے امیر المومنین، اللہ سے ڈریئے۔ یہ سن کر ہارون رشید اپنی سواری سے اترا اور سجدے میں گر پڑا۔ پھر ہارون رشید نے سجدے سے سر اٹھایا اور اس نے حکم دیا اور یہودی کی ضرورت پوری کردی گئی۔ پھر جب ہارون رشید لوٹا تو اس سے کہا گیا کہ اے امیر المومنین، کیا آپ ایک یہودی کے قول پر اپنی سواری سے اتر گئے۔ ہارون رشید نے کہا کہ نہیں، بلکہ مجھے اللہ تعالی کا یہ قول یاد آیا: وإذا قيل له اتق الله أخذته

العزۃ بالإثم فحسبہ جھنم، و لبئس المھاد (2:206)

ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی انقلاب آیا، اس کے بعد تاریخ میں جو پراسس جاری ہوا، اس کا دوسرا پہلو وہ تھا جس کو ہم نے جدید ٹکنالوجی پر مبنی صنعت کہا ہے- یہ دوسرا پراسس خاص طور پر عباسی عہد (750-1258) میں بغداد میں شروع ہوا، پھر وہ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا اسپین پہنچا- اسپین میں اس نے غیر معمولی ترقی حاصل کی- اسپین کی مسلم خلافت 711 میں شروع ہوئی اور 1492 میں ختم ہوئی- اِس مدت میں جو سائنسی ترقیاں ہوئیں، وہی مغرب کے صنعتی انقلاب کی بنیاد بنیں- مسلم خلافت کے زمانے میں سائنس میں جو ترقی ہوئی، اس کے بغیر مغرب میں سائنس کی ترقی ممکن نہ ہوتی- مورخین نے اس واقعے کا کھلے طور پر اعتراف کیا ہے- اس کی ایک مثال رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) کی ہے- وہ فرانس میں پیدا ہوا اور لندن میں اس کی وفات ہوئی- بریفالٹ نے مغرب کی نشاۃِ ثانیہ سے پہلے عربوں کے سائنسی رول کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — یہ بہت زیادہ قابلِ قیاس بات ہے کہ عربوں کے رول کے بغیر یورپ کی جدید صنعتی تہذیب ہرگز کبھی وجود میں نہ آتی:

'It is highly probable that but for the Arabs modern European civilization would never have arisen at all'. Robert Briffault (1876-1948)

(*The Making of Humanity*, p.190, published in 1919; publisher: G. Allen & Unwin Ltd, UK, pp. 371)

اس طرح کی رائیں کئی اور مغربی اسکالروں نے دی ہیں- مثلاً برٹرنڈ رسل، فیلڈنگ گیرسن (Fielding Garrison) برناڈ لوئی (Bernard Lewis)، وِل ڈیورنٹ (Will Durant)، وغیرہ- یہاں وِل ڈیورنٹ کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

Muslim scientists helped in laying the foundations for an experimental science with their contributions to the scientific method and their empirical, experimental and quantitative approach to scientific study. (*The Age of Faith*, by Will Durant (1980), 4/162

یعنی مسلم سائنس دانوں نے سائنٹفک طریقِ عمل میں اپنے کنٹری بیوشن اور اپنے تجرباتی اور کمیاتی منہج کے ذریعے سائنسی مطالعے کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔

اسلامی تحریک اکیسویں صدی میں

قرآن کی مذکورہ آیات (61:8-9) سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کو رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے جو انقلاب مطلوب تھا، اُس انقلاب کے دو حصے تھے — ایک، اتمامِ نور، اور دوسرے، اظہارِ دین۔ اب اکیسویں صدی میں یہ دونوں مطلوب چیزیں پوری طرح واقعہ بن چکی ہیں۔ اِس طرح اب اسلامی تحریک اپنے فائنل دور میں پہنچ چکی ہے۔ اب فائنل رول اہلِ ایمان کو ادا کرنا ہے۔ اب اہلِ ایمان کا کام ہے کہ وہ اِس تاریخی انقلاب کو سمجھیں اور اس کے ذریعے پیدا ہونے والے امکانات (opportunities) کو بھر پور طور پر استعمال کریں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اِس مطلوب خداوندی کا ایک پہلو وہ تھا جس کو قرآن میں، اتمامِ نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اتمامِ نور سے مراد ایک ایسا واقعہ ہے جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے، پوری طرح ایک پرامن اور غیر سیاسی واقعہ ہے، اور وہ ہے خدا کے دین کے مستند ایڈیشن کا پوری طرح محفوظ ہو جانا۔ یہ واقعہ اِس طرح انجام پا چکا ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن) کا متن (text) کامل طور پر محفوظ ہو چکا ہے۔ اِسی کے ساتھ پرنٹنگ پریس کا دور دنیا میں آ گیا ہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہو گیا ہے کہ قرآن کا متن اور اس کے ترجمے تیار کر کے ہر زبان میں شائع کیے جائیں اور اس کو تمام اقوامِ عالم تک پہنچا دیا جائے۔

اِس سلسلے میں دوسرا مطلوب وہ ہے جس کو قرآن میں اظہارِ دین کہا گیا ہے، یعنی دین کو غلبہ کی حیثیت مل جانا۔ یہ دوسرا مطلوب بھی اکیسویں صدی میں پوری طرح حاصل ہو گیا ہے۔ اب اہلِ ایمان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اظہارِ دین کے ذریعے حاصل ہونے والے مواقع کو بھر پور استعمال کریں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اظہارِ دین سے مقصود یہ تھا کہ دنیا میں وہ حالتِ فطری قائم ہو جائے۔ یہ واقعہ بھی پوری طرح انجام پا چکا ہے۔ اب دنیا میں پوری طرح مذہبی آزادی آ چکی ہے۔ کسی بھی رکاوٹ کے بغیر دنیا کے کسی ملک میں دعوتی مشن کو جاری کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ اِس انقلاب کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ انسانی تاریخ میں تلوار کا

دورختم ہوگیا-اب صرف پُرامن عمل کا دور ہے-تاریخ کا یہ دور عین دعوتی مشن کے حق میں ہے-

اظہارِ دین، یعنی دنیا میں حالتِ فطری کے قائم ہونے کی بنا پر بہت سے موافق حالات وجود میں آئے ہیں-اِن میں سے دو بے حد اہم ہیں-ایک ہے، کائنات میں چھپی ہوئی اللہ کی نشانیوں کا دریافت ہوجانا-اور دوسرا ہے، جدید مواصلات (modern communication) جس نے تاریخ میں پہلی بار اُس عالمی مشن کو مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَاً (25:1)

آیاتِ الٰہی کا ظہور

آیات اللہ یا آیاتِ معرفت کا ظہور پیشگی طور پر مقدر تھا-قرآن میں اِس کی پیشین گوئی اِن الفاظ میں کی گئی تھی: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)- قرآن کی اِس آیت میں جس چیز کو آفاق وانفس میں نشانیوں کا ظہور بتایا گیا ہے، وہ دراصل دورِ جدید میں نظریاتی سائنس کے ذریعے دریافت ہونے والے حقائقِ فطرت ہیں-اِن حقائق نے دورِ جدید میں معرفتِ خداوندی کے نئے دروازے کھول دئے ہیں-اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اللہ کا کوئی بندہ تخلیقاتِ الٰہیہ میں کمالاتِ الٰہیہ کو دیکھے اور معرفتِ خداوندی کا اعلیٰ درجہ حاصل کرے- نیز اِسی کے ذریعے یہ بھی ممکن ہوگیا ہے کہ اِن حقائق فطرت کو دعوت الی اللہ کے عمل میں جدید دلائل کے طور پر استعمال کیا جائے-اِس طرح دعوت کے عمل کو خود انسان کے علمی مسلّمہ کے مطابق، ثابت شدہ بنا دیا جائے-

اِس سائنسی انقلاب کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو موجودہ زمانے میں دورِ مواصلات (age of communication) کہا جاتا ہے-اِس دورِ مواصلات نے تاریخ میں پہلی بار اِس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ دعوت الی اللہ کے اُس عالمی نشانے کو پورا کیا جاسکے جس کی پیشین گوئی ایک حدیث رسول میں اِن الفاظ میں کی گئی تھی: لا یبقی علی ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام، بعزّ عزيز وذلّ ذليل (زمین کی پشت پر کوئی چھوٹا یا بڑا گھر باقی نہیں رہے گا، جہاں اللہ اسلام کا کلمہ نہ پہنچا دے، عزت والے کو عزت کے ساتھ اور ذلت والے کو

ذلت کے ساتھ، یعنی چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے (willingly or unwillingly)۔

دنیا میں حالتِ فطری کے قائم ہونے سے موجودہ زمانے میں جو نئے مواقع کھلے ہیں، وہ سارے انسانوں کے لیے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اِن مواقع پر کسی ایک گروہ کی اجارہ داری (monopoly) قائم ہوجائے۔ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، آزادی (freedom) ہر انسان کا فطری حق ہے، مومن کا بھی اور غیر مومن کا بھی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ آزادی صرف اہلِ ایمان کو حاصل ہواور دوسرے لوگوں کے لیے وہ منسوخ قرار پائے۔ دوسرے لوگ بھی اپنی آزادی کو کھلے طور پر استعمال کریں گے۔ اگر کسی کے استعمالِ آزادی سے اہلِ ایمان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو یہ اہلِ ایمان کا اپنا مسئلہ ہے، وہ دوسروں کا مسئلہ نہیں۔ دوسروں پر صرف یہ پابندی لگائی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی آزادی کو اِس طرح استعمال نہ کریں کہ وہ دوسروں کے لیے جسمانی جراحت (physical injury) کا سبب بن جائے۔ اِس ایک پابندی کے سوا، کوئی اور پابندی نہ مطلوب ہے اور نہ ممکن۔

خلاصہ کلام

ایک اسلامی اسکالر کا مقالہ نظر سے گزرا۔ اِس مقالے میں انھوں نے لکھا تھا کہ اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ بنیادی طور پر دو ہے— توحید اور عدل۔ توحید (Monotheism) سے مراد ان کے نزدیک انفرادی عقیدہ تھا، اور عدل (justice) سے مراد عدل پر مبنی اجتماعی نظام۔ انھیں دو تصورات کے تحت انھوں نے پورے اسلام کی تشریح کی تھی۔

مگر میرے مطالعہ کے مطابق، اسلام کا یہ تصور درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید اور عدل دونوں ہی انفرادی نوعیت کے احکام ہیں۔ توحید سے مراد ہے ایک انسان کا انفرادی عقیدہ، اور عدل سے مراد ہے، ایک انسان کا انفرادی سلوک۔ قرآن کے مطابق، اللہ تعالی نے انسان کو معرفت کے لیے پیدا کیا ہے (51:56)۔ انسان کو اللہ تعالی نے عقل دی۔ اب انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ عقل کو استعمال کرکے اپنے خالق کو دریافت کرے۔ یہی دریافت، خدا پرستانہ زندگی کا آغاز ہے۔ اِس دریافت کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ جب کسی شخص کو حقیقی معنوں میں یہ دریافت ہوتی ہے تو

اس کے بعد فطری طور پراس کی پوری زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔اس کی پوری شخصیت ایک نئ شخصیت بن جاتی ہے، وہ پورے معنوں میں ایک ربانی انسان بن جاتا ہے۔

اسی قسم کا ربانی انسان تخلیق کا اصل مقصود ہے۔اِسی قسم کے ربانی افراد، نہ کہ ربانی معاشرہ، خدا کے تخلیقی منصوبے کا اصل مقصود ہیں۔ موجودہ دنیا میں ایسے افراد پوری انسانی تاریخ سے منتخب کیے جائیں گے اور پھر اِن منتخب افراد کی بنیاد پر آخرت کی دنیا میں ایک اعلیٰ ربانی معاشرہ وجود میں آئے گا۔یہی وہ افراد ہیں جو خدا کی ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔

خالق نے اِس دنیا میں انسان کو کامل آزادی دی ہے۔یہ آزادی برائے امتحان ہے، نہ کہ برائے استحقاق۔انسان کو یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے۔یہ آزادی قیامت سے پہلے منسوخ ہونے والی نہیں۔اِس آزادی کی بنا پر ایسا ہے کہ اِس دنیا میں اعلیٰ افراد تو بنتے ہیں، لیکن اعلیٰ معاشرہ یا اعلیٰ نوعیت کا اجتماعی نظام کبھی نہیں بنتا۔انسانی زندگی کی یہ نوعیت قیامت تک بدستور باقی رہے گی۔قیامت کے بعد ایک نئ کامل دنیا بنے گی۔وہاں پوری تاریخ کے منتخب افراد بسائے جائیں گے اور جو لوگ اپنی آزادی کا صحیح استعمال نہ کرسکے، اُن کو جمع کرکے کائناتی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے گا— خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، انسانی زندگی کی حقیقت یہی ہے۔انسانی زندگی کی بامعنی تعبیر صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ اِس خدائی منصوبے کو ذہن میں رکھ کر اس کی تعبیر کی جائے، انسانی تاریخ کو بامعنی تعبیر دینے کا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔

ہدایت اور اظہارِ دین

قرآن کی سورہ الفتح کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا :

God is One Who has sent His Messenger with guidance and the true religion, so that God may have it prevail over all religions, God suffices as a witness. (48:28)

1۔ آیت کا اسلوب بتاتا ہے کہ اِس آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ کوئی انسانی واقعہ نہیں، بلکہ وہ ایک حتمی فیصلہ ہے، یعنی اللہ نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ لازماً ایسا ہو۔ مزید یہ کہ قرآن کی یہ آیت اُس فیصلہ خداوندی کے بارے میں ہے جس کا تعلق خاتم النبیین سے ہے اور چوں کہ خاتم النبیین کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے، اِس لیے اِس فیصلے کا انطباق بھی لازماً قیامت تک جاری رہے گا۔ اِس آیت میں پیغمبر یا امتِ مسلمہ کے مشن کو نہیں بتایا گیا ہے، بلکہ اس میں اللہ کے ایک فیصلے کو بتایا گیا ہے، جو پوری انسانی تاریخ میں لازماً ایک واقعہ بنے گا۔

2۔ دوسری چیز ہدایت ہے۔ ہدایت سے مراد اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی الہامی ہدایت ہے۔ اِس الہامی ہدایت کے بارے میں اللہ کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ ہر اعتبار سے محفوظ رہے، اس کا عربی متن، اس کی زبان، اس کا لہجہ، حتی کہ اس کا طرزِ کتابت، وغیرہ۔ قرآن ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اترا۔ اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ کتاب (قرآن) ہر اعتبار سے محفوظ ہے۔ پرنٹنگ پریس اور ریکارڈنگ کا دور بتاتا ہے کہ اب قرآن کی یہ حفاظت مزید اضافے کے ساتھ یقینی بن چکی ہے۔

3۔ اظہارِ دین سے مراد خود دین کا اظہار ہے، نہ کہ دین کے سوا کسی اور چیز کا اظہار۔ اِس آیت میں اظہارِ دین سے مراد سیاسی اقتدار یا اجتماعی نظام نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین بحیثیت دینِ حق اپنے نظریاتی غلبہ کو ہمیشہ برقرار رکھے گا۔ یہ غلبہ بہ اعتبار حجت (دلیل) ہوگا، نہ کہ بہ اعتبار نظام۔ دینِ حق کے نظریاتی غلبہ کو ہمیشہ برقرار رکھنا تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ ہے، کیوں کہ

اِس مقصد کو اِس طرح حاصل کرنا ہے کہ انسان کی آزادی پوری طرح برقرار رہے اور اِس کے ساتھ دین کا نظریاتی غلبہ بھی مسلسل طور پر قائم رہے۔ اِس نوعیت کا پیچیدہ منصوبہ کسی بھی انسان کے بس میں نہیں۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے انسانی تاریخ کو اِس طرح مینیج (manage) کرنا ہے کہ تاریخ کا آزادانہ سفر بھی جاری رہے اور یہ مقصد بھی حسب منشا حاصل ہوجائے۔

اِس مقصد کے لیے اللہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب بھی کچھ لوگ بطور خود دینِ حق کا کوئی غلط ایڈیشن (false edition) تیار کریں تو اس کے بعد خود تاریخ میں ایسے اسباب پیدا ہوں جو اِس ایڈیشن کا خاتمہ کردیں اور اِس طرح دینِ حق کی صداقت بدستور برقرار رہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت سے اب تک ایسے 3 بڑے واقعات پیش آئے ہیں، جب کہ انسان نے خود ساختہ طور پر دین کا ایک غلط ایڈیشن تیار کیا، لیکن اس کے بعد تاریخی عمل کے تحت ایسے حالات پیدا ہوئے جنھوں نے مذہب کے اِس غلط متبادل (wrong alternative) کو حجت (دلیل) کی سطح پر ختم کردیا۔ اِس طرح دین حق کی نظریاتی صداقت بدستور تاریخ میں قائم رہی۔

تاریخ میں اِس نوعیت کی پہلی مثال مظاہر فطرت کی پرستش (nature worship) ہے جس کو مذہب کی زبان میں شرک کہا جاتا ہے۔ فطرت کی پرستش کا مطلب یہ ہے کہ فطرت کے مظاہر، سورج، چاند ستارے، وغیرہ میں خدائی صفات (divine attributes) کو فرض کرکے ان کی پرستش کرنا۔ مظاہر فطرت کی یہ پرستش قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک قائم رہی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ تعالی نے تاریخ میں ایسا انقلابی عمل جاری کیا جس کے نتیجے میں آخر کار وہ دور آیا جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے۔ جدید سائنس کے ذریعے مظاہر فطرت کی موضوعی تحقیق (objective exploration) کی گئی۔ اِس کے نتیجے میں علمی طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ فطرت میں کوئی اُلوہیت (divinity) نہیں ہے۔ اِس طرح انسان کے خود اپنی عقلی مسلّمہ پر یہ ثابت ہوگیا کہ فطرت صرف مخلوق ہے، اس کے اندر کوئی بھی الوہی صفت (divine attribute) نہیں۔ اِس طرح، خدا کے دین کا دینِ حق ہونا بدستور ثابت شدہ بنا رہا۔

قدیم تاریخ میں دین حق کا دوسرا غلط متبادل (false alternative) شخصیت پرستی (personality cult) کی صورت میں پیدا ہوا۔شخصیت پرستی کا سیاسی اظہار بادشاہت کے ادارہ کی صورت میں ہوا۔ بادشاہ کے متعلق مان لیا گیا کہ وہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں، پراسرار فوقیت رکھتا ہے۔اِس طرح بادشاہ کو عملاً وہ درجہ دے دیا گیا جو معبود کا درجہ ہونا چاہیے۔یہ بادشاہت یا سیاسی شخصیت پرستی انسانی تاریخ میں کئی ہزار سال تک جاری رہی ۔بادشاہت کے دور میں انسانی سوچ کا مرکز ومحور بادشاہ بن گیا۔اعلی انسانی جذبات بادشاہ کے ساتھ وابستہ کردئے گئے۔عام طور پر یہ مان لیا گیا کہ — جو بادشاہ کا مذہب، وہی سب کا مذہب (الناس علی دین ملوکھم)

بادشاہت کے زمانے میں ساری دنیا میں زراعت کا دور قائم تھا۔اُس زمانے میں زراعت (agriculture) اقتصادیات کا واحد ذریعہ تھی— زمین کا مالک ہونے کی بنا پر بادشاہ اقتصادیات کا واحد مالک بنا ہوا تھا۔بادشاہ کو یہ حیثیت تھی کہ بادشاہ دینے والا ہے اور بادشاہ چھیننے والا ۔اُس زمانے میں بادشاہ کو عملاً وہ درجہ ملا ہوا تھا، جو درجہ خدا کا ہونا چاہیے۔اِن حالات میں یہ تصور پیدا ہوا کہ بادشاہ حاکم (ruler) ہے اور دوسرے تمام لوگ محکوم (ruled) کی حیثیت رکھتے تھے۔قدیم زمانے کی اِس نفسیات کو ایک فارسی شاعر نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

اِس طرح بادشاہ گویا خدا کا ایک سیاسی متبادل(political alternative) بن گیا تھا۔گویا دین باطل نے دین حق کی جگہ لے رکھی تھی۔ اللہ تعالی کو یہ صورتِ حال مطلوب نہ تھی، چناں چہ تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری ہوا۔ یہ عمل ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا، جب کہ عرب میں قبائلی سرداری کا نظام رائج تھا اور عرب کے اطراف میں دو بڑے ایمپائر قائم تھے — ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر۔بائبل کے الفاظ میں، یہ گویا سیاسی چٹانیں تھیں۔رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے اِن سیاسی چٹانوں کو توڑ کر تاریخ میں ایک نیا سیاسی عمل جاری ہوا۔ یہ عمل سفر کرتے ہوئے آخر کار یورپ پہنچا۔اِس سیاسی عمل کا نقطہ انتہا 1789 میں پیش آنے والا فرانسیسی انقلاب تھا۔

اِس انقلاب کے بعد دنیا میں ایک نیا دور آیا جس کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔ جمہوریت نے شخصی بادشاہت کے تصور کا خاتمہ کر دیا اور دنیا میں عوامی حکومت کا دور آیا، جس کا فارمولا یہ تھا:

Government of the people, by the people, for the people.

اِس جمہوری انقلاب نے قدیم طرز کی شخصی بادشاہت (monarchy) کا خاتمہ کر دیا، پہلے یورپ میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں۔ اِس طرح دنیا میں بادشاہی مذہب کا خاتمہ ہوگیا اور نظری طور پر دینِ حق دوبارہ دنیا میں قائم ہوگیا۔ دینِ حق کا یہ قیام سیاسی اقتدار یا حکومتی نظام کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ حجت کی سطح پر دینِ حق کا فکری اظہار تھا۔ یہ واقعہ اتفاقاً پیش نہیں آیا، بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ تاریخ میں ایک عظیم خدائی آپریشن کا نتیجہ تھا۔ جمہوریت صرف ایک سیاسی نظریہ نہ تھا، اس کا ایک اور اہم تر پہلو یہ تھا کہ اس نے اُس سیاسی الوہیت (political divinity) کے تصور کا خاتمہ کر دیا جس کو بنیاد بنا کر قدیم زمانے کے بادشاہ اپنی عظمت قائم کیے ہوئے تھے۔ جمہوری انقلاب کے بعد سیاسی اقتدار صرف ایک انتظامیہ (administration) بن کر رہ گیا، ایک مقدس ادارے کی حیثیت سے اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اِس سلسلے کی تیسری مثال وہ ہے جس کو ہیومن ازم (Humanism) کہا جاتا ہے۔ ہیومن ازم ایک جدید فلسفہ ہے جس کو دوسرے الفاظ میں، انسان پرستی کہا جا سکتا ہے۔ یہ دینِ حق کا آخری غلط متبادل ہے جو بیسویں صدی کے نصف آخر میں زیادہ طاقت کے ساتھ پیدا ہوا۔ یہی معاملہ وجودیت (Existentialism) کا ہے، جس کا بانی فرانسیسی فلسفی سارترے (Jean Paul Sartre) ہے جس کی وفات 1946 میں ہوئی۔ وجودیت بھی دراصل ہیومن ازم کا فلسفیانہ ایڈیشن ہے۔

ہیومن ازم کیا ہے، ہیومن ازم ایک غیر خدا پرستانہ فلسفہ ہے۔ ہیومن ازم ایک فکری نظام ہے جس کا مقصد ساری اہمیت انسان کو دینا ہے، نہ کہ خدا یا کسی فوق الفطری طاقت کو:

> Humanism: An outlook or system of thought attaching prime importance to human, rather than divine or supernatural matters.

دورِ جدید کے بہت سے فلسفی ہیومن ازم کے نقطہ نظر کے حامی بن گئے۔ مثلاً جرمن فلسفی

لدوگ فیور باخ (Ludwig Feverbach) جس کی وفات 1872 میں ہوئی، اس نے لکھا ہے کہ — انسان ہی خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں:

God is nothing other than man himself.

امریکی فلسفی ولیم جیمس (William James) جس کی وفات 1910 میں ہوئی، وہ بھی ہیومن ازم کا حامی تھا، انگلش فلسفی جولین ہکسلے (Julian Huxley) جس کی وفات 1975 میں ہوئی، اس نے ہیومن ازم کی حمایت میں ایک کتاب لکھی۔ اس کا ٹائٹل یہ ہے:

Religion Without Revelation

اِس کتاب میں ہیومن ازم کی تعریف اِس طرح کی گئی ہے — سیٹ کا خدا سے انسان کی طرف منتقل ہوجانا (Transfer of seat from God to Man.)۔

ہیومن ازم کے موضوع پر عام قاری کے لیے ایک قابلِ مطالعہ کتاب یہ ہے:

Humanism: A Very Short Introduction, by Stephen Law, 2011

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہیومن ازم کے فلسفے کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ لوگوں نے یہ فرض کرلیا کہ انھیں دینِ خداوندی کا ایک بدل مل گیا ہے۔ غیر خدا پرست طبقے میں یہ سمجھا جانے لگا کہ — انسان ہی ہر اعتبار سے سب کچھ ہے (Man is the measure of all things.)

مگر عین اِسی زمانے میں ایک نیا طاقت ور ظاہرہ پیدا ہوا جس نے ہیومن ازم کے تصور کو عملاً باطل ثابت کردیا۔ یہ طاقت ور ظاہرہ وہ تھا جس کو عام طور پر گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے، یعنی عالمی سطح پر حرارت کا غیر متناسب طور پر بڑھ جانا جس کے نتیجے میں زمین پر زندگی کا نظام درہم برہم ہوجائے۔

موجودہ زمانے میں جدید ٹکنالوجی کے ظہور کے بعد انڈسٹری کو بہت ترقی ہوئی۔ مختلف ملکوں میں کثیر تعداد میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے۔ اِن کارخانوں کو چلانے کے لیے جو ایندھن (fuel) استعمال ہوتا تھا، اُس سے مسلسل طور پر بڑی مقدار میں کاربن خارج ہونے لگا۔ اِس اخراج کو کاربن ایمیشن (carbon emission) کہا جاتا ہے۔ اِس کاربن ایمیشن نے زمین کے اوپر قائم شدہ فضا کو خطرناک حد تک آلودہ بنادیا۔

اِس فضائی آلودگی یا فضائی حرارت کے نتیجے میں کئی ناقابلِ حل مسائل پیدا ہوگئے۔ اِس کے نتیجے میں برف کے بڑے بڑے ذخائر، پہاڑوں کے گلیشیر، نارتھ پول اور ساؤتھ پول کی آئس کیپ (ice cap)، سمندروں میں تیرتے ہوئے برفانی پہاڑ (iceberg) تیزی سے پگھلنے لگے۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ سمندروں کی سطح بڑھنے لگی۔ نازک حیوانات (fragile animals) مرنے لگے۔ اِس طرح کے واقعات کے نتیجے میں یہ ہوا کہ زمین پر قائم شدہ لائف سپورٹ سسٹم تباہ ہونے لگا، حتی کہ اب سائنس داں یہ خبر دے رہے ہیں کہ زمین بہت جلد انسان کے لیے ناقابلِ رہائش بن جائے گی۔

اِس صورتِ حال کا پیدا ہونا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ دراصل ہیومن ازم کے فلسفے کی موت کا اعلان ہے۔ ہیومن ازم کے فلسفے میں یہ مان لیا گیا تھا کہ انسان کائنات میں مرکزی مقام (central position) رکھتا ہے۔ انسان کی اِس حیثیت کو ماننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ مانا جائے کہ انسان کو ہر طرح کی قدرت حاصل ہے، انسان اپنے مستقبل کا مالک ہے۔ اگر انسان واقعۃً اِس طرح کی طاقت رکھتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ موجودہ زمانے میں زمین پر واقع ہونے والی اُس انسان کُش تباہی کو روکے جو گلوبل وارمنگ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ گلوبل وارمنگ کو روکنے میں انسان کی ناکامی نے ہیومن ازم کے فلسفے کا آخری طور پر خاتمہ کر دیا ہے۔

جب گلوبل وارمنگ کا ظاہرہ سامنے آیا تو تمام دنیا کی حکومتیں اور تمام دنیا کے سائنس داں بڑے پیمانے پر متحرک ہوگئے۔ کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں اِس موضوع پر ہونے والی کانفرنس (دسمبر 2009) میں دنیا کے تمام ملکوں کے سائنس داں بڑی تعداد میں اکٹھا ہوئے۔ اِس طرح کی کوششیں حکومتوں کی طرف سے بھی کی جارہی ہیں اور سائنس دانوں کی طرف سے بھی۔ اِس موضوع پر تحقیقات اور تجربات کا سلسلہ ساری دنیا میں مسلسل طور پر جاری ہے، مگر نتیجے کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ناکام ثابت ہوا۔ گلوبل وارمنگ کا خطرہ مسلسل طور پر بڑھ رہا ہے۔ اب وہ خطرناک سطح تک پہنچ چکا ہے، مگر اُس کو روکنے کے لیے انسان کی ہر کوشش پوری طرح بے نتیجہ ثابت ہورہی ہے۔

گلوبل وارمنگ کا یہ تجربہ کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ وہ ہیومن ازم کے نظریے کے کامل اِبطال

(total negation) کے ہم معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گلوبل وارمنگ کے ظاہرے نے اُسی طرح ہیومن ازم کے فکر کا خاتمہ کر دیا ہے جس طرح اس سے پہلے فطرت پرستی کو سائنس نے ختم کیا تھا اور جمہوریت کے ذریعے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

موجودہ گلوبل وارمنگ بھی پچھلے خدائی آپریشن کی طرح ایک خدائی آپریشن ہے جس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دینِ حق کے لیے ہیومن ازم کا متبادل ایک بے بنیاد متبادل (false alternative) تھا۔ اِس طرح خدائی فیصلے کے مطابق، دین حق نے دوبارہ تاریخ میں فکری اظہار کا وہ درجہ حاصل کر لیا جو خدا نے اس کے لیے ابدی طور پر مقدر کیا تھا۔

خلاصہ کلام

اوپر جو کچھ کہا گیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے ساتویں صدی کے ربع اول میں یہ اعلان کیا تھا کہ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت ہی مستند ہدایت (authentic guidance) ہے اور خدا کا دین ہی دینِ حق ہے۔ خدا نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ خدا کی نازل کردہ ہدایت (قرآن) ابدی طور پر پوری طرح محفوظ رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہدایت کے بارے میں خدا کا فیصلہ کامل طور پر پورا ہوا۔

اِس سلسلے میں دوسری چیز خدا کا نازل کردہ دین ہے۔ خدا کی نظر میں یہی دین ہمیشہ کے لیے دین حق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس دین کے بارے میں خدا کا یہ فیصلہ تھا کہ جب بھی انسان بطور خود اس کا کوئی غلط متبادل تیار کرے تو خود تاریخ میں ایسے اسباب پیدا ہوں جو مسلّمہ دلائل کی سطح پر اس کو غیر معتبر ثابت کر دیں۔ خدا کے اِس فیصلے کا اظہار بھی تاریخ میں بار بار ہوتا رہا اور اب اکیسویں صدی میں جو صورتِ حال ہے، وہ یہ ہے کہ ہدایت اور دینِ حق دونوں کے معاملے میں انسان کے پاس کوئی دوسرا انتخاب باقی نہیں۔ اب حقیقت کے اعتبار سے، انسان کے لیے ایک ہی ممکن انتخاب ہے اور وہ وہی ہے جو خدا نے خاتم النبیین کی بعثت کے وقت اس کے لیے مقدر کر دیا تھا۔

دعوہ ایکٹوزم

From Political Activism to Dawah Activism

مشہور محدث امام مالک بن انس (وفات: 179 ہجری) کا ایک قول اِن الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: لا یصلح آخر هذه الأمة، إلا بما صلح به أولها (مسند الموطأ، رقم الحدیث: 783) یعنی اِس امت کے دورِ آخر کے لوگوں کی اصلاح بھی اُسی طرح ہوگی، جس طرح اِس امت کے دورِ اول کے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی۔

امت کے لیے یہ طریقہ اصلاح کیا ہے، اس کا اندازہ رسول اور اصحابِ رسول کے دور کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے دور کو اسلام کا دورِ اول کہا جاسکتا ہے۔ اِس دور میں جو کچھ پیش آیا، اس کی تفصیل حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ اِس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنے مشن کا آغاز کیا۔ 13 سال تک آپ پُرامن انداز میں اپنے مشن کو چلاتے رہے۔ اِس مدت میں مکہ کے کچھ افراد نے اسلام قبول کیا، لیکن وہاں کی بڑی اکثریت آپ کی مخالف بن گئی۔ انھوں نے ہر صورت سے آپ کو ستانا شروع کردیا، یہاں تک کہ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ رسول اور اصحابِ رسول یا تو مکہ سے ہجرت کرجائیں یا اہلِ مکہ کی طرف سے جارحانہ کارروائی کا سامنا کریں۔

اُس وقت حضرت عمر فاروق اور دوسرے اصحاب نے کہا کہ اگر ہم سے جنگ کی جاتی ہے تو ہم جنگ کریں گے۔ پیغمبر اسلام نے حضرت عمر فاروق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یا عمر، إنا قلیل (سیرت ابن کثیر: 1/441) یعنی اے عمر، ہم تھوڑے ہیں۔ پیغمبر اسلام کا یہ جواب کوئی سادہ جواب نہ تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی فریقِ ثانی کے ساتھ ٹکراؤ کا وقت نہیں آیا۔ اللہ کے منصوبے کے مطابق، یہ ایک قبل از وقت بات ہوگی کہ ہم فریقِ ثانی سے لڑ جائیں۔ ابھی ہمیں صبر کرتے ہوئے حالات کو اُس نوبت تک پہنچانا ہے جہاں اللہ اُس کو پہنچانا چاہتا ہے۔

دعوت اور نصرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اِس معاملے میں جو ماڈل (model) قائم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ پیغمبرانہ مشن کے دو بڑے حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان دعوت ہے، اور دوسرے حصے کا عنوان نصرت، یعنی اہلِ ایمان کو یہ کرنا ہے کہ پہلے وہ احساسِ ذمے داری کے تحت، دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں۔ وہ آخری حد تک پر امن رہتے ہوئے اپنے دعوتی مشن کو جاری رکھیں۔ وہ کسی حال میں ردعمل یا ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اِس کے بعد اہلِ ایمان کے ساتھ جو کچھ ہوگا، وہ تمام تر اللہ کی نصرت کے تحت ہوگا۔ اللہ کی نصرت کے تحت اہلِ ایمان کے لیے مزید مواقع کھلتے چلے جائیں گے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ اِن مواقع کو پہچانیں اور دانش مندانہ طور پر ان کو استعمال کریں، یہاں تک کہ ان کا سفرِ دعوت اپنی آخری منزل تک پہنچ جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو نمونہ قائم ہوا، اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس معاملے میں نصرتِ الٰہی کے ظہور کے تین مرحلے ہیں۔ وہ مرحلے حسب ذیل ہیں:

1۔ نصرت باعتبارِ حفاظت (*Nusrat* in terms of security)

2۔ نصرت باعتبارِ پراسس (*Nusrat* in terms of process)

3۔ نصرت باعتبارِ فتح (*Nusrat* in terms of victory)

4۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا تو اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو یہ ہدایت دی گئی: يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ○ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ○ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ○ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (74:1-7)۔ یہ قرآن کی سورہ المدثر کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ یہ سورہ اگرچہ بالکل ابتدا میں نازل ہوئی، لیکن تلاوت کی ترتیب کے اعتبار سے وہ مصحف کے آخری حصے میں شامل ہے۔ اِن آیات میں پیغمبر اسلام کو جو ہدایت دی گئی، اس کا مطلب یہ تھا کہ تم پُر امن انداز میں دعوت الی اللہ کا کام کرتے رہو۔ مشن کے بقیہ مراحل کا تعلق تمام تر اللہ کی نصرت سے ہے۔ تم انتظار کی پالیسی پر قائم رہو اور جب اللہ کی نصرت ظاہر ہو تو تم اس کے مطابق، اُس کو استعمال کرو۔

نصرت باعتبارِ حفاظت

جیسا کہ عرض کیا گیا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا۔ آپ نے یک طرفہ طور پر امن کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ اُس وقت مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ انھوں نے آپ کے ساتھ مخالفت کا طریقہ اختیار کیا۔ جب حالات بہت زیادہ شدید ہوگئے، اُس وقت بھی آپ نے ٹکراؤ سے مکمل اعراض کیا۔ یہاں تک کہ نبوت کے 13 سال بعد آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ آگئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپ نے اور آپ کے اصحاب نے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ اپنے مقامِ عمل (work place) کو بدل دیا۔

واقعات بتاتے ہیں کہ ہجرت کے بعد بھی مکہ کے مشرک سردار خاموش نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے یک طرفہ طور پر مسلّح جارحیت کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے باقاعدہ جنگی تیاری کرکے مدینہ پر حملہ کردیا۔ یہ واقعہ پیغمبر اسلام کی ہجرت کے 16 ماہ بعد پیش آیا۔ مدینہ سے تقریباً 80 میل دور بدر کے مقام پر دونوں فریقوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اِس جنگ کو تاریخ میں غزوہ بدر کہا جاتا ہے۔ یہ صرف یک روزہ جنگ تھی جو 17 رمضان 2 ہجری کو پیش آئی۔ اِس جنگ میں فریقِ مخالف کی طرف سے ایک ہزار مسلح افراد تھے جو پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ دوسری طرف 313 کی تعداد میں اصحابِ رسول تھے، جو کم تر جنگی تیاری کے باوجود اپنے دفاع کے لیے بدر کے مقام پر پہنچے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفسہ عملاً اِس جنگ میں شریک نہ تھے۔ البتہ آپ کے لیے میدانِ جنگ سے باہر وقتی طور پر ایک عریش (hut) بنایا گیا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب دونوں گروہوں کے درمیان مسلح ٹکراؤ کا وقت آیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گر پڑے۔ اُس وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: اللهم إنك إن تهلك هذه العصابة من أهل الإسلام فلا تعبد في الأرض أبدا (مسند أحمد: 1 / 112) یعنی اے اللہ، اگر تو اِس گروہ کو ہلاک کردے تو اِس کے بعد زمین پر کبھی تیری عبادت نہ ہوگی۔

اللہ تعالی نے پیغمبر اسلام کی دعا قبول فرمائی اور قرآن (3:124-125) کے بیان کے مطابق،

میدانِ جنگ میں کئی ہزار کی تعداد میں فرشتے بھیجے۔ اِس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، اُس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ (3:123)

یہ معاملہ جو غزوہ بدر کے وقت پیش آیا، وہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ یہ وہی چیز تھی جس کو ہم نے نصرت باعتبار حفاظت سے تعبیر کیا ہے، یعنی منصوبۂ الٰہی کی تکمیل سے پہلے مخالفین نے یک طرفہ حملہ کرکے یہ کوشش کی کہ اصحابِ رسول کا خاتمہ کردیا جائے، مگر یہ قبل از وقت تھا۔ ابھی وہ وقت آنے والا تھا جب کہ اصحابِ رسول کی جماعت اپنا آخری دعوتی رول ادا کرے۔ اِس کے لیے ضروری تھا کہ اِس جماعت کو مخالفین کے حملے سے بچا کر محفوظ رکھا جائے۔

اصل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے جب مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا، اُسی وقت سے اللہ تعالی کا ایک منصوبہ زیرعمل آگیا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ ایک مدت تک مختلف واقعات کے دوران پیغمبر اسلام اور آپ کی دعوتِ توحید کا خوب چرچا ہو، تاکہ مکہ اور اطرافِ مکہ کے لوگ اُس سے باخبر ہوجائیں۔ لوگوں کے اندر بڑے پیمانے پر اِس بارے میں تجسس (curiosity) پیدا ہوجائے اور پھر اُن کے اِس تجسس کو استعمال کرکے یہ موقع فراہم کیا جائے کہ لوگ بڑے پیمانے پر آپ کے مشن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

نصرت باعتبارِ پراسس

پراسس کے اِس معاملے کو قرآن میں رفعِ ذکر (94:4) کہا گیا ہے، یعنی لوگوں کے درمیان توحید کے مشن کا چرچا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں اپنی دعوتی مشن کا آغاز کیا تو ہر دن نئے نئے واقعات پیش آتے رہے — کبھی آپ، لوگوں کے مجمع میں جاکر اُن کو قرآن سنا رہے ہیں، کبھی مکہ کے کسی آدمی کے قبولِ اسلام پر مخالفین کی طرف سے اس پر تشدد کیا جارہا ہے، کبھی کسی مسلمان کو حرمِ مکہ میں نماز پڑھنے سے روکا جارہا ہے، کبھی باہر سے مکہ آنے والا کوئی شخص پیغمبر اسلام سے اِس معاملے میں سوال وجواب کررہا ہے، کبھی حج کا موسم ہے اور مختلف قبائل کے لوگ مکہ آرہے ہیں اور آپ وہاں جاکر اُن کے سامنے اپنے مشن کا تعارف پیش کررہے ہیں، کبھی آپ کا اور آپ کے خاندان کا بائکاٹ کیا جارہا ہے، کبھی مکہ کے سرداروں کی ایذارسانی سے مجبور ہوکر اصحابِ رسول کا ایک قافلہ مکہ سے ہجرت کرکے حبش جارہا ہے، کبھی آپ

اپنے مشن کے تحت طائف اوردوسرے مقامات پر جاتے ہیں، کبھی دار الندوہ میں پیغمبراسلام کے خلاف مشورہ ہورہا ہےاور آپ کوقتل کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے، وغیرہ۔

پھر جب مکہ میں 13 سال قیام کے بعد آپ مکہ سے 300 میل کی دوری پر واقع شہر مدینہ چلے جاتے ہیں تو اِس تذکرے میں بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ اب غزوات اور سرایا اور جھڑپوں (skirmishes) جیسے واقعات کے نتیجے میں آپ کا اور آپ کے مشن کا چرچا تمام عرب میں، حتیٰ کہ اطرافِ عرب میں پھیل جاتا ہے۔ آپ کے مخالفین کی مخالفانہ کارروائیوں کے نتیجے میں بظاہر بہت سے واقعات ہورہے تھے جو مسلسل لوگوں کے علم میں آرہے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک بلا اعلان عمل جاری تھا۔ یہ عمل اِن واقعات کے درمیان ایک انڈر کرنٹ یا زیرِسطح عمل (under the surface process) کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ لوگوں کے اندر نہایت تیزی سے تجسس کی نفسیات پیدا کررہا تھا۔ لوگ فطری طور پر جاننا چاہتے تھے کہ یہ مشن کیا ہے اور اِس مشن سے وابستہ افراد کا معاملہ کیا ہے۔ تجسس کی یہ زیریں رو اللہ کے منصوبے کے مطابق، عین مطلوب تھی، کیوں کہ اُس سے پیغمبر اسلام کے مشن کے دعوتی مواقع مسلسل طور پر بڑھ رہے تھے۔ یہی وہ عمل ہے جس کو ہم نے نصرت باعتبار پراسس کا نام دیا ہے۔

نصرت باعتبارِ فتح

ہجرت کے دوسرے سال اِس انڈر کرنٹ عمل پر تقریباً 20 سال گزر چکے تھے۔ نصرت باعتبار پراسس کا عمل اپنی تکمیل کے مرحلے تک پہنچ گیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ اِس پیدا شدہ امکان کو بھر پور طور پر دعوت کے لیے استعمال (avail) کیا جائے۔ مگر مخالف فریق نے جنگ اور ٹکراؤ کا جو ماحول بنا رکھا تھا، اس کی موجودگی کی بنا پر اِس پیدا شدہ موقع کو استعمال کرنا عملاً ناممکن ہوگیا تھا۔ اِس لیے اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت حکمت کے ساتھ ایک نیا منصوبہ بنایا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مدینہ میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خواب دکھایا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ جارہے ہیں۔ آپ نے یہ خواب اپنے اصحاب کو بتایا۔ اِس کو سن کر لوگ بہت خوش ہوئے۔ وہ عمرہ کے لیے مکہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اِس کے مطابق،

آپ یکم ذی القعدہ 6 ہجری کو عمرہ کے ارادے سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اُس وقت تقریباً 15 سو مہاجرین اور انصار آپ کے ساتھ تھے۔ اہلِ مکہ کو پیغمبر اسلام کے اِس سفر کی اطلاع ہوگئی۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ کسی قیمت پر پیغمبر اسلام کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ چناں چہ انھوں نے آگے بڑھ کر حدیبیہ کے مقام پر آپ کے قافلے کو روک دیا جو کہ مکہ سے 9 میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے حدیبیہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اِس کے بعد اہلِ مکہ کے نمائندے وہاں آنے لگے اور تقریباً دو ہفتے تک دونوں فریق کے درمیان گفت وشنید جاری رہی۔ اِس گفتگو کے دوران پیغمبر اسلام کو یہ موقع ملا کہ آپ اہلِ مکہ سے یہ کہیں کہ ہمارے اور تمھارے درمیان ٹکراؤ اور جنگ کی جو صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، وہ ایک غیر مطلوب چیز ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس کو ختم کر دیا جائے۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ فریقین کے درمیان صلح کا معاہدہ (peace treaty) ہو جائے۔

صلح کا یہ معاہدہ جب کاغذ پر لکھا جانے لگا تو اہلِ مکہ کے نمائندہ سردار نے شدید انداز میں حمیتِ جاہلیہ (48:26) کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے ضد اور سرکشی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ان کی یک طرفہ شرطوں کی بنیاد پر معاہدہ کیا جائے، حتی کہ انھوں نے اصرار کیا کہ ''رسول اللہ'' کے لفظ کو معاہدے کی تحریر سے مٹا دیا جائے۔ پیغمبر اسلام نے اہلِ مکہ کی تمام شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا، صرف اِس لیے کہ اِس معاہدے کے ذریعے دونوں فریق کے درمیان امن کا ماحول قائم ہو رہا تھا۔

حدیبیہ کا معاہدۂ صلح اہلِ مکہ کی یک طرفہ شرطوں کی بنیاد پر ہوا تھا۔ چناں چہ صحابہ کے اندر اس کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوا۔ عمر فاروق نے کہا: لما نعطي الدنية من ديننا (صحيح البخاري، رقم الحديث: 2731) یعنی ہم اپنے دین کے معاملے میں اِس ذلت آمیز معاہدے کو کیوں قبول کریں۔ ایک صحابی نے رسول اللہ سے کہا کہ آپ نے مدینہ میں اپنے ایک خواب کے حوالے سے ہم کو بتایا تھا کہ ہم عمرہ کرنے مکہ جا رہے ہیں، پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ عمرہ کے بغیر درمیان سے لوٹ رہے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ کیا میں نے یہ کہا تھا کہ ہم اِسی سال مکہ جا کر عمرہ کریں گے (أفأخبرتك أنا نأتيه العام؟)۔ اِن تمام مخالفتوں کے باوجود آپ نے اہلِ مکہ سے

امن کا معاہدہ کرلیا اور حدیبیہ سے مدینہ کے لیے واپسی کا فیصلہ فرمالیا۔

معاہدہ حدیبیہ کی تکمیل کے فوراً بعد وہ سورہ اتری جو قرآن میں الفتح کے نام سے شامل ہے۔ اِس سورہ کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے: اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا (48:1) یعنی ہم نے تم کو کھلی فتح دے دی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سورہ اپنے اصحاب کو پڑھ کر سنائی تو ابتداءً صحابہ کو یہ بیان بہت عجیب معلوم ہوا۔ عمر فاروق نے کہا: أو فتح هو يا رسول الله- قال: نعم، والذي نفسي بيده إنه لفتح (القرطبي 16/261) یعنی اے خدا کے رسول، کیا یہ کوئی فتح ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ ہاں، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یقیناً وہ فتح ہے۔ اِسی طرح ایک اور صحابی نے کہا: ما هذا بفتح- فقال: بل هو أعظم الفتوح- (القرطبي 16/260) یعنی یہ تو کوئی فتح نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں وہ فتح ہے، بلکہ سب سے بڑی فتح ہے۔

معاہدہ حدیبیہ دراصل ایک تدبیر تھی۔ اُس نے عمل کے میدان کو بدل دیا۔ اِس سے پہلے اہلِ ایمان مجبور تھے کہ وہ ٹکراؤ اور جنگ کے میدان میں فریقِ ثانی سے مقابلہ کریں، لیکن اب اُن کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ اپنی پوری قوت کو یکسوئی کے ساتھ دعوت کے میدان میں استعمال کریں۔ میدانِ عمل کی یہ تبدیلی بے حد اہم تھی۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ صرف دو سال کے محدود عرصے میں اسلام پورے جزیرہ عرب میں پھیل گیا۔

اِس نتیجے کو دیکھتے ہوئے مشہور تابعی ابن شہاب الزہری (وفات: 124 ہجری) نے کہا تھا کہ: لقد كان الحديبية أعظم الفتوح (القرطبي، 16/261) یعنی حدیبیہ اسلام میں سب سے بڑی فتح تھی۔ مگر یہ سادہ طور پر صرف نتیجے کی بات نہیں، بلکہ وہ منصوبہ (planning) کی بات تھی۔ یہ کوئی اتفاقی نتیجہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک گہری منصوبہ بندی کے ذریعے پیش آنے والا منصوبہ تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے نصرت باعتبار فتح کا عنوان دیا ہے۔

یہ معاملہ دراصل نصرت بذریعہ پراسس کا معاملہ تھا۔ حدیبیہ سے پہلے تقریباً 20 سال تک بظاہر ٹکراؤ اور مخالفت کے جو واقعات پیش آرہے تھے، اُن کے ساتھ فطری طور پر ایک زیر سطح پراسس

جاری تھا۔ اِس پراسس کوایک لفظ میں، منفی تعارف کہا جاسکتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر ایک کے لیے اسلام ایک ایسی حقیقت بن گیا جو یہ تقاضا کر رہا تھا کہ اُس کو براہِ راست جاننے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں، اِس صورتِ حال نے بڑے پیمانے پر اسلام کے لیے دعوت کے مواقع پیدا کر دئے، جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

معاہدہ حدیبیہ کا معاملہ بلاشبہہ ایک حکیمانہ منصوبہ بندی کا معاملہ تھا۔ یہ حکیمانہ منصوبہ بندی تمام تر فطرت کے قوانین پر مبنی ہے، اِس لیے ہر زمانے میں دوبارہ اس کا کامیاب تجربہ کیا جا سکتا ہے، جس طرح دورِ اول میں اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا ''نصرت باعتبار فتح'' کا معاملہ خصائص نبوی کا معاملہ نہیں، بلکہ وہ اسوہ نبوی کا معاملہ ہے۔ اس کو ہر زمانے میں اُسی طرح دہرایا جاسکتا ہے جس طرح پیغمبر کے دوسرے نمونوں کو دہرایا جاسکتا ہے۔

حدیبیہ اور اسوہ رسول

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) یعنی اللہ کے رسول میں تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اِس آیت میں 'اسوہ' کسی محدود معنی میں نہیں ہے، وہ پیغمبر کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ پیغمبر اپنی پوری زندگی کے اعتبار سے، اہلِ ایمان کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس عموم میں استثنا صرف کسی ایسی چیز کا ہوسکتا ہے جس کو صراحتاً پیغمبر کے ساتھ خاص کیا گیا ہو۔ مثلاً ازدواج کے معاملے میں بعض پہلوؤں سے آپ کے ساتھ استثنا کا معاملہ، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (33:50)۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کا ہر قول اور ہر فعل امت کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہوگا، الا یہ کہ رسول کے کسی فعل کو صراحتاً رسول کی ذات کے ساتھ خاص کیا گیا ہو۔ اِس اصول کی روشنی میں معاہدۂ حدیبیہ کا معاملہ بلاشبہہ ایک قابلِ تقلید اسوہ رسول کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی وہ حالات پیدا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ 6 ہجری میں پیدا ہوئے تھے، تو اُس وقت اسوہ حدیبیہ اُسی طرح امت کے لیے قابلِ اتباع بن جائے گا، جس طرح وہ دورِ اول کے اہلِ ایمان کے لیے قابلِ اتباع بنا تھا۔

معاہدہ حدیبیہ ایک فتح کا معاملہ تھا۔ فتح کا معاملہ صرف پیغمبر کے لیے خاص نہیں، وہ تمام امت کے لیے یکساں طور پر مطلوب ہے۔ قرآن میں بار بار فتح کو اہلِ ایمان کے لیے ایک عمومی مطلوب کی حیثیت سے بتایا گیا ہے۔ مثلاً: وَأُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ (61:13)۔ جب فتح پوری امت کے لیے ایک مطلوب شے ہے تو فتح کی تدبیر بھی یقینی طور پر پوری امت کے لیے ایک مطلوب شے ہوگی۔ فتح اور تدبیرِ فتح کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں تدبیرِ فتح سے مراد سیاسی فتح (political victory) نہیں ہے، بلکہ نظریاتی فتح (ideological victory) ہے۔ موجودہ زمانے میں اِس نظریاتی فتح کا امکان پوری طرح پیدا ہو چکا ہے۔ مگر اِس نظریاتی فتح کو واقعہ بنانا صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ حکمتِ حدیبیہ کو سمجھا جائے اور آج کے حالات کے لحاظ سے اس کا استعمال کیا جائے۔

حکمتِ حدیبیہ

حدیبیہ کے واقعے کو سیرت کی کتابوں میں غزوۃ الحدیبیہ کے عنوان کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حدیبیہ کا واقعہ دوسرے بہت سے غزوات میں سے ایک غزوہ تھا۔ حالاں کہ حدیبیہ کا واقعہ نہ غزوۃ تھا اور نہ دوسرے واقعاتِ نبوی کی طرح صرف ایک واقعہ۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیبیہ کا واقعہ ایک اعلیٰ درجے کا منصوبہ تھا۔ حدیبیہ کے واقعے کو، معروف معنی میں، غزوہ کہنا بلاشبہہ اس کا کم تر اندازہ (underestimation) کرنے کے ہم معنی ہے۔

حکمتِ حدیبیہ دراصل ایک فطری قانون ہے۔ اِس قانون کا ذکر قرآن کی سورہ الفتح میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا (48:27) یعنی اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہ جانی۔ یہ قرآن کا ایک اسلوب ہے۔ اِس سے مراد اللہ کا علم غیب نہیں ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اُس وقت ایک صورتِ حال موجود تھی، لیکن اس کو جاننے کے لیے ربانی عقل درکار تھی، عام آدمی اُس کو سمجھ نہیں سکتا۔ عام آدمی ہمیشہ چیزوں کو فیس ویلو (face value) پر لیتا ہے، عام آدمی صرف اُس بات کو جان پاتا ہے جو سطح پر ہوتی ہے۔ لیکن ربانی عقل رکھنے والا انسان

اپنی بصیرت کے تحت اُس حقیقت کو جان لیتا ہے جو وہاں زیر سطح موجود ہوتی ہے۔

6 ہجری میں عرب کے اندر یہ صورتِ حال تھی کہ بظاہر لوگ پیغمبر کے مخالف بنے ہوئے تھے، لیکن داخلی نفسیات کے اعتبار سے، ہر ایک کے اندر سکنڈ تھاٹ (second thought) آچکا تھا، یعنی شعوری یا غیر شعوری طور پر مذہبِ توحید کے بارے میں دلوں کے اندر نرم گوشہ (soft corner) کا پیدا ہونا۔ اِس کی ایک علامتی مثال خالد بن الولید (وفات: 21 ہجری) کا واقعہ ہے۔ وہ فتحِ مکہ سے کچھ پہلے ایمان لائے۔ وہ اپنے اُس وقت کے احساس کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں: قد شهدت هذا المواطن كلّها على محمد صلى الله عليه وسلم، فليس في مواطن أشهده إلا أنصرف وأنا أرى في نفسي أني موضع في غير شيء (حياة الصحابة، جلد 1، صفحہ 160)

خالد بن الولید کے اِن الفاظ کو اگر جنرلائز کیا جائے تو اُس وقت کے عربوں کی اکثریت کا احساس یہی ہو چکا تھا۔ اگر چہ خارجی سطح پر ٹکراؤ اور مخالفت کا ماحول نظر آتا تھا، لیکن داخلی نفسیات کے اعتبار سے بیش تر لوگ فقد صغت قلوبكما (66:4) کا نمونہ بن چکے تھے۔

یہ صورتِ حال تھی جس کو استعمال (avail) کرنے کے لیے ایک عملِ اعتدال (process of normalization) درکار تھا، کیوں کہ معتدل ماحول کے بغیر اِس امکان کو استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یک طرفہ بنیاد پر معاہدہ حدیبیہ کر کے یہی معتدل ماحول بنایا گیا۔ اور اس کے بعد فطری طور پر وہ نتیجہ برآمد ہوا جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:1-2)

ظاہرِ دنیا، باطنِ دنیا

صلح حدیبیہ 6 ہجری میں ہوئی۔ اِس واقعے کو قرآن میں فتح مبین (48:1) کہا گیا ہے۔ جس حکمت (wisdom) کے تحت حدیبیہ کا معاہدہ کیا گیا، اُس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (48:27) یعنی اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہ جانی، پس اللہ نے اس سے پہلے ایک فتحِ قریب ٹھہرا دی۔

قرآن کی اِس آیت میں بظاہر دنیا کا اور آخرت کا ذکر ہے، مگر اِس آیت کا ایک توسیعی مفہوم (extended sense) بھی ہے، جس کا اشارہ آیت کے اِس لفظ میں ملتا ہے: يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (30:7)۔ گویا دنیا کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ مگر ظاہر بیں لوگ صرف اس کے ظاہر کو جانتے ہیں، وہ اس کے باطن سے بے خبر رہتے ہیں، یعنی اکثر لوگ چیزوں کو ان کے فیس ویلو (face-value) پر لیتے ہیں، حالات کے گہرے پہلوؤں تک ان کی نظر نہیں پہنچتی۔

یہ آیت قرآن میں صلح حدیبیہ کے سیاق میں اتری۔ اِس پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیت پر غور کیجئے تو اس سے ایک اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سطح (surface) پر جو کچھ نظر آتا ہے، وہ صرف حالات کا ظاہری پہلو ہوتا ہے، اِس کے سوا ایک اور چیز ہوتی ہے جو انڈر کرنٹ (undercurrent) ہوتی ہے۔ جس آدمی کے اندر ربانی بصیرت ہو، وہ سطح سے گزر کر انڈر کرنٹ امکانات کو دیکھ لے گا۔ وہ سطح کی باتوں کو نظر انداز کرے گا اور جو چیز انڈر کرنٹ ہے، اس کو دریافت کر کے اس کے مطابق، اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے گا۔

یہ ایک حکمتِ حیات ہے، یعنی سطح کی باتوں کو نظر انداز کر کے انڈر کرنٹ جو حالات ہیں، ان کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کرنا۔ معاہدۂ حدیبیہ اِسی حکمت کی ایک پیغمبرانہ مثال ہے۔ یہ مثال پیروانِ رسول کے لیے ایک ابدی ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیروانِ رسول کو چاہیے کہ وہ رسول اللہ کے اِس نمونے کو اپنے حالات پر منطبق کریں اور اُس عظیم کامیابی کے حصے دار بنیں جو اِس حکمت پر اللہ نے مقدر کی ہے۔

اکیسویں صدی میں حدیبیہ منصوبہ

اکیسویں صدی میں دوبارہ وہی حالات زیادہ بڑے پیمانے پر پیدا ہو گئے ہیں جو کہ پہلی صدی ہجری میں معاہدہ حدیبیہ کے وقت عرب میں پیدا ہوئے تھے۔ اکیسویں صدی میں دوبارہ پوری طرح وہ امکان پیدا ہو گیا ہے جب کہ معاہدہ حدیبیہ کی تاریخ کو عالمی سطح پر دہرایا جائے۔ اِس امکان کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کی شرط دوبارہ وہی ہے جو دورِ اوّل میں پیش آئی، اور وہ ہے صابرانہ دانش مندی یا دانش مندانہ صبر۔

موجودہ زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ مغربی قومیں نئے ذرائع سے مسلح ہو کر پوری دنیا میں

پھیل گئیں۔ انھوں نے ہر جگہ اپنا دبدبہ قائم کر دیا۔ یہ واقعہ زیادہ بڑے پیمانے پر اٹھارھویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ اُس وقت کی دنیا میں مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں — برصغیر ہند میں مغل ایمپائر، ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبے میں ترک ایمپائر، وغیرہ۔ مغربی قوموں نے مسلمانوں کی اِن سلطنتوں کو مغلوب کرلیا اور ہر جگہ اپنا دبدبہ قائم کرلیا۔ اِس عمل کا نقطۂ آغاز متعین کرنا ہو تو وہ 1799 قرار پائے گا۔ اسی سال دو بڑے فیصلہ کُن واقعے ہوئے۔ ایک طرف، اِسی سال بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) میں مغربی طاقتوں نے ترکوں کے عظیم بحری بیڑہ (naval fleet) پر حملہ کرکے اس کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اور دوسری طرف، اِسی سال برٹش فوج نے سلطان ٹیپو کی فوج کو کامل شکست دے دی۔ اِس کے بعد برٹش جنرل نے فاتحانہ جذبے کے ساتھ کہا تھا کہ — آج انڈیا ہمارا ہے (Today, India is ours!)۔

اِس کے بعد انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں مسلسل اِس طرح کے واقعات ہوتے رہے۔ مثلاً 1857 میں انڈیا میں مغل سلطنت کا خاتمہ، 1924 میں خلافتِ عثمانی کا خاتمہ، 1948 میں اسرائیل کا قیام، اور پھر دوسری عالمی جنگ (1945-1939) کے بعد نام نہاد امریکی امپیریل ازم (American Imperialism) کا ظہور، وغیرہ۔

اِس طرح کے واقعات نے پوری مسلم دنیا میں شدید ردعمل پیدا کیا۔ ہر جگہ نفرت اور تشدد اور جہاد ایکٹوزم شروع ہوگیا۔ ہر جگہ کے مسلمانوں میں وہی جارحانہ کلچر وجود میں آ گیا جس کی ترجمانی عرب شاعر خیرالدین الزرکلی (وفات: 1976) کے اِن الفاظ سے ہوتی ہے:

هاتِ صلاحَ الدين ثانيةً فينا　　جدّدي حِطّين أو شبه حطينا

(صلاح الدین کو دوبارہ ہمارے درمیان لے آؤ۔ حطین یا حطین جیسا معرکہ دوبارہ گرم کرو)

واقعات بتاتے ہیں کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی دوسوسالہ مدت تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ''جہاد ایکٹوزم'' کی صدی تھی۔ تمام مسلم دنیا اِس جہاد ایکٹوزم میں شامل تھی، اِس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگ تقریر اور تحریر کی زبان میں نفرت اور تشدد کی بولی بول رہے تھے، اور بقیہ لوگ

باقاعدہ ہتھیاروں کے ذریعے اپنے مفروضہ دشمن کے ساتھ باقاعدہ لڑائی چھیڑے ہوئے تھے، لیکن یہ دوسوسالہ مقابلہ آرائی یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی مغلوبیت پر ختم ہوئی۔

آج ساری دنیا کے مسلمان ایک ہی بولی بول رہے ہیں — ہم مخالفین کی سازشوں سے گھرے ہوئے ہیں، ہم دشمنوں کی معاندانہ کارروائیوں کا شکار ہیں، وغیرہ۔ اِس موضوع پر آج کا مسلم پریس، عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کا خلاصہ ایک جملے میں یہ ہے کہ — ہم محاصرہ کی حالت میں ہیں (We are under siege)۔

زیرِ سطح امکانات

سطح پر بظاہر وہ حالات تھے جن کو عام طور پر اینٹی مسلم حالات کہا جاتا ہے، لیکن عین اِسی مدت میں زیرِ سطح کچھ دوسری سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری تھیں۔ یہ سرگرمیاں وہ تھیں جو سماجی اور سیاسی اور علمی سطح پر جاری تھیں۔ اِن سرگرمیوں کے چیمپین بھی مغربی قوموں کے لوگ تھے۔ اِن سرگرمیوں کے نتیجے میں اِس مدت میں دنیا میں مذہبی آزادی آئی۔ جمہوریت کا دور آیا، امن (peace) کو خیر اعلیٰ (summum bonum) کا درجہ دے دیا گیا، رواداری (tolerance) کو ایک عالمی مسلّمہ قرار دے دیا گیا، جدید تقاضوں کے تحت ساری دنیا میں ایک نیا ذہن پیدا ہوا جس کو انسان دوست ذہن (human-friendly mind) کہا جاسکتا ہے۔ پھر اِسی کے ساتھ اِس مدت میں ٹکنالوجی کو غیر معمولی ترقی ہوئی، پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا، الیکٹرانک کلچر وجود میں آیا۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے ایک نیا دور پیدا کیا جس کو دورِ مواصلات کہا جاتا ہے۔

اِسی کے ساتھ ایک اور ترقی بہت بڑے پیمانے پر وجود میں آئی جس کو علم یا سائنس کی ترقی کہا جاتا ہے۔ اِس ترقی نے فطرت کے اندر چھپے ہوئے حقائق انسان کے سامنے کھول دئے۔ علم کے تمام شعبوں میں انقلابی تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ یہ تبدیلیاں جو موجودہ زمانے میں پیدا ہوئیں، وہ عین اسلام کے حق میں تھیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ اُس موافق دور کا ظہور تھا جس کی خبر پیشگی طور پر قرآن (41:53) میں دی گئی تھی۔

موافقِ اسلام دور

موجودہ زمانے میں جو تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں، وہ اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی انسائکلو پیڈیا بھی ان کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ ان کے بیان کے لیے ایک پوری لائبریری کی ضرورت ہے۔ تاہم مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِن تبدیلیوں کی بنا پر تاریخ انسانی میں پہلی بار ایک نیا دور پیدا ہوا، ایک ایسا دور جس کا تصور قدیم انسان نہیں کرسکتا تھا۔ یہ دور اپنی حقیقت کے اعتبار سے، مکمل طور پر ایک موافقِ اسلام دور ہے۔

مزید یہ کہ دورِ جدید کے یہ عظیم امکانات تمام تر امن کے تصور پر مبنی ہیں۔ اِن امکانات کو استعمال کرنے کے لیے نہ جنگ کی ضرورت ہے اور نہ کوئی سیاسی ایمپائر قائم کرنے کی۔ اِن جدید مواقع کا یہ ایک حیرت انگیز پہلو ہے کہ ان کو مکمل طور پر پُر امن ذرائع کے تحت استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اِن جدید مواقع کو استعمال کرنے کے لیے کسی بھی مرحلے میں نہ جنگ کی ضرورت ہے اور نہ پولٹکل پاور کی۔

سیکولر مثال

اِن صفحات میں جو بات کہی جارہی ہے، وہ صرف ایک مذہبی بات نہیں ہے، یہ دراصل ایک اصولِ فطرت (law of nature) ہے۔ خالق نے جن اصولوں کے تحت اِس دنیا کو بنایا ہے، اُن میں سے ایک اصول یہ بھی ہے۔ اِس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں سطح (on the surface) پر ہوتی ہیں جن کو ہر آدمی دیکھ سکتا ہے، اور کچھ زیادہ بڑی چیزیں ہوتی ہیں، مگر وہ ہمیشہ زیرِ سطح (under the surface) ہوتی ہیں۔ اِن دوسری چیزوں کو ہمیشہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو بصیرت (wisdom) رکھنے والے ہیں۔ اِس دنیا میں زیادہ بڑی کامیابی صرف اُن لوگوں کے لیے مقدر ہے جو انڈر کرنٹ چیزوں کو دیکھ سکیں اور اس کے مطابق، اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔

اِس کی ایک مثال جاپان ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان محوری گروپ (Axis powers) کے ساتھ تھا۔ اُس زمانے میں جاپان ایک تشدد پسند قوم کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن جنگ کے دوران امریکا نے جاپان پر ایٹمی حملہ کیا۔ اس نے جاپان کے دو شہر ہیروشیما (Hiroshima) اور ناگاساکی (Nagasaki) پر اگست 1945 میں دو ایٹم بم گرائے۔ یہ جاپان کے لیے ایک ہلاکت خیز تجربہ تھا۔ اِس کے بعد جاپان بظاہر

پوری طرح ایک تباہ شدہ ملک بن گیا۔اُس وقت جاپان کا سیاسی لیڈر ہیروہٹو (Hirohito) تھا۔ ہیروہٹو ایک مدبر آدمی تھا۔اس نے اپنی بصیرت سے یہ جاناکہ سرفیس پر جوحالات ہیں، وہ بظاہر جاپان کے لیے ناموافق ہیں،لیکن انڈرکرنٹ جوصورتِ حال ہے،وہ جاپان کے لیے ایک موافق امکان کی حیثیت رکھتی ہے۔

اُس وقت کی دنیا میں دو بڑی طاقتیں تھیں — روس اور امریکا۔ دونوں ملک بھاری مصنوعات (hardware) میں مشغول تھے اور ہلکی مصنوعات (software) کا میدان تقریباً خالی تھا۔ جاپان نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس حقیقت کو جانا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ اِس مخفی امکان کو استعمال کرے۔

اِس کے بعد جاپان نے دو کام کیے۔ ایک طرف، جاپان نے یہ کیا کہ اس نے امریکا سے ٹکراؤ کو یک طرفہ طور پر ختم کردیا، اور اپنی ساری توجہ تعلیم اور صنعت کے میدان کی طرف موڑ دیا۔ اِس کے بعد جو ہوا، وہ یہ کہ تقریباً 30 سال کے اندر جاپان کی ایک نئی تاریخ وجود میں آگئی۔ جاپان نے نہ صرف جنگ کے نقصانات کی تلافی کردی، بلکہ اس نے اتنی ترقی کی وہ جدید دور میں اقتصادی سپر پاور (economic superpower) بن گیا۔ یہ معجزہ اِس طرح پیش آیا کہ جاپان نے سرفیس کے حالات کو نظر انداز کیا اور انڈرکرنٹ جو امکانات چھپے ہوئے تھے، ان کو استعمال کیا۔

اِس معاملے کی دوسری مثال وہ ہے جو انڈیا میں پیش آئی۔ انڈیا میں تقریباً 200 سال تک برٹش حکومت قائم رہی۔ 1857 میں انڈیا میں آزادی کی لڑائی شروع ہوئی۔ یہ لڑائی ہتھیاروں کے بل پر شروع کی گئی تھی۔ اِس جنگ میں کچھ مسلم لیڈر اور کچھ ہندو لیڈر شریک تھے۔ آزادی کی یہ جنگ تقریباً 60 سال تک جاری رہی، مگر اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کسی اور صورت میں نہیں نکلا۔ آخر کار 1919 میں مہاتما گاندھی سیاست کے میدان میں آئے اور انھوں نے جنگ آزادی کی قیادت سنبھالی۔ اُس وقت انڈیا بظاہر ایک تباہ شدہ ملک بنا ہوا تھا، لیکن مہاتما گاندھی نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس حقیقت کو جانا کہ یہاں انڈرکرنٹ ایک اور صورتِ حال موجود ہے جو انڈیا کے لیے ایک موافق امکان کی حیثیت رکھتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ تشدد کا طریقہ چھوڑ کر امن کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

یہ انڈرکرنٹ امکان کیا تھا، وہ یہ تھا کہ جس زمانے میں برطانیہ انڈیا پر حکومت کررہا تھا، اُسی

زمانے میں یورپ کے ملکوں میں شاہی خاندان راج کررہے تھے — اِن یورپی ملکوں میں اِن حکومتوں کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر تحریکیں اٹھیں۔ بڑے بڑے یورپی دماغوں نے یہ نظریہ پھیلایا کہ کسی خاندان کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی ملک پر حکومت کرے۔ اِس سیاسی تحریک کے نتیجے میں ایک سیاسی اصول پورے یورپ میں ایک مسلّم اصول بن گیا۔ اِس اصول کو عام طور پر حکومتِ خود اختیاری (self-determination) کا اصول کہا جاتا ہے:

The right of a people to decide upon its own form of government without coercion or outside influence.

یہ سیاسی انقلاب یورپ میں پہلے فکری سطح پر آیا۔ اس کے بعد اس نے عملی صورت اختیار کی۔ اِس سیاسی انقلاب کا پہلا عملی اظہار فرانس میں ہوا۔ یہ فرنچ ریولوشن (French Revolution) تھا جو 1789 میں پیش آیا۔ اِس انقلاب کے بعد فرانس میں شخصی بادشاہت ختم ہوگئی اور جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔ دھیرے دھیرے یہ انقلاب پورے یورپ میں پھیل گیا۔

مہاتما گاندھی نے اِس سیاسی مسلّمہ کو استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ خود یورپ کے حالات بتاتے ہیں کہ اب بادشاہت کا دور ختم ہو چکا ہے اور ہر ملک کو حق ہے کہ وہ اپنے یہاں قومی حکومت قائم کرے۔ مہاتما گاندھی نے اِس اصول کو لے کر انڈیا کی تحریک آزادی کو نیا رخ دے دیا۔ انھوں نے تشدد کا طریقہ چھوڑ کر پورے معنوں میں پرامن طریقہ اختیار کیا، جس کو وہ اہنسا (non-violence) کہتے تھے۔ مہاتما گاندھی کی یہ پرامن جدوجہد جہد آزادی برٹش حکومت کے لیے نیا مسئلہ بن گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ پہلے، جدوجہد آزادی کو دبانا آسان تھا۔ کیوں کہ وہ لوگ برٹش حکومت کے خلاف ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ اِس طرح برٹش حکومت کو موقع ملتا تھا کہ وہ ان کے خلاف ہتھیار استعمال کر کے انھیں کچل دے۔ اِس تبدیلی نے برٹش حکمرانوں سے ہتھیار کے استعمال کا جواز چھین لیا۔ اِس صورت حال کا اندازہ ایک واقعے سے ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں ایک برٹش کلکٹر نے اپنے سیکریٹریٹ کو یہ تار بھیجا — براہِ کرم، بذریعہ ٹیلی گرام یہ بتایئے کہ ''شیر'' کو ہتھیار کے استعمال کے بغیر کیسے ہلاک کیا جائے:

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently.

یہ ایک سیکولر مثال ہے کہ کس طرح ایک لیڈر نے اپنے زمانے کے انڈر کرنٹ حالات کو سمجھا اور کامیابی کے ساتھ اس کو استعمال کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ اصول فطرت کا ایک اصول ہے۔ یہ ایک فطری امکان ہے جو ہمیشہ اور ہر صورتِ حال میں موجود رہتا ہے۔ اِس امکان کو ہر بڑے مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ سیکولر مقصد ہو یا مذہبی مقصد۔ یہی امکان موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے لیے پوری طرح موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کر کے حکیمانہ انداز میں اس کو استعمال کیا جائے۔

فضلِ عظیم کا معاملہ

قرآن کی سورہ النساء میں ایک آیت اِن الفاظ میں آئی ہے: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (4:113) یعنی اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو اُن میں سے ایک گروہ نے یہ ٹھان لیا تھا کہ وہ تم کو بہکا کر رہے گا، حالاں کہ وہ اپنے آپ کو بہکا رہے ہیں، وہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تم کو وہ چیز سکھائی ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے، اور اللہ کا فضل ہے تم پر بہت بڑا۔

قرآن کی اِس آیت میں 'فضل' کا لفظ کسی پُراسرار معنی میں نہیں ہے۔ فضل کے لفظی معنی ہیں: زیادہ یا شئ مزید (additional thing)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے علاوہ ایک مزید چیز دی گئی جو کہ ختم نبوت کا رول ادا کرنے کی نسبت سے آپ کے لیے ضروری تھی، یعنی وہ اسباب یا مواقع جن کو استعمال کر کے آپ خاتم النبیین کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دے سکیں۔ مثلاً ہاجرہ اور اسماعیل کے ذریعے سے ایک نئی نسل کی تیاری جس کا ذکر قرآن کی سورہ ابراہیم (14) کی آیت نمبر 37 میں کیا گیا ہے، یا ساسانی ایمپائر اور بازنتینی ایمپائر کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر دونوں کو کمزور کر دینا، جس کا اشارہ قرآن کی سورہ الروم کی آیت نمبر 2 میں کیا گیا ہے۔ مذکورہ آیت (4:113) میں اِسی قسم کی

نصرت مراد ہے، نہ کہ پُراسرار قسم کی کوئی شخصی فضیلت۔ نصرت کا یہ خصوصی معاملہ پیغمبر کے مشن کی نسبت سے تھا، نہ کہ پیغمبر کی ذات کی نسبت سے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں علم کی تعلیم (وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ) سے مرادِ علمِ وحی نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد مذکورہ قسم کے موافق امکانات سے پیغمبر کو باخبر کرنا ہے۔ یہی اسلوب سورہ الفتح (48) میں اختیار کیا گیا ہے جہاں 'علم مالم تعلموا' کا لفظ آیا ہے۔ سورہ الفتح کی اِس آیت میں علم سے مراد وہ موافق امکانات ہیں جو معاہدہ حدیبیہ کے اندر باعتبار نتیجہ چھپے ہوئے تھے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے پچھلے زمانوں میں ہزاروں سال کے دوران بہت سے پیغمبر بھیجے (23:44)۔ اِن پیغمبروں نے نبوت کا فریضہ پوری طرح انجام دیا، لیکن ان کا مشن صرف اعلانِ توحید تک پہنچا۔ اُن میں سے کسی کے زمانے میں نہ مطلوب قسم کی امت بنی اور نہ دینِ خداوندی کا متن محفوظ ہوسکا اور نہ توحید پر مبنی عمومی انقلاب آیا، جو کہ اللہ تعالی کو مقصود تھا۔

یہی وجہ تھی جس کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے لیے اللہ تعالی نے خصوصی اسباب فراہم کیے۔ اِن اسباب کو استعمال کر کے یہ ممکن ہوا کہ دنیا میں توحید پر مبنی انقلاب آئے اور دینِ خداوندی کی نئی تاریخ بنے۔ پیغمبر اسلام کے لیے وحی کے علاوہ، جو مزید موافق اسباب فراہم کیے گئے، اِنھیں کو قرآن میں فضل کہا گیا ہے، یعنی اضافی اسباب یا مزید نصرت۔ اللہ تعالی نے ایک لمبی مدت کے اندر یہ اضافی اسباب فراہم کیے، یہاں تک کہ رسول اور اصحابِ رسول کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ اِن اسباب کو استعمال کرکے وہ اللہ تعالی کے منصوبے کی تکمیل کریں۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں 'وعلّمك مالم تكن تعلم' اُس وحی کے لیے نہیں ہے جو قرآن کی سورت میں آپ پر نازل ہوئی، بلکہ اِس سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق مذکورہ موافق امکانات سے ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی نے خصوصی طور پر اِن موافق امکانات کی خبر دی، تاکہ آپ شعوری طور پر اِن امکانات سے واقف ہوں اور ان کو اپنے مشن کے حق میں استعمال کرسکیں۔

6 ہجری میں پیغمبر اسلام اور قریش کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر جو معاہدہ ہوا تھا،

وہ اس معاملے کی ایک واضح مثال ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت عمر فاروق کو اِس معاہدے پر سخت اختلاف ہو گیا تھا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس کا ایک حصہ کتابوں میں اِس طرح نقل ہوا ہے: قال عمر: فأتيت أبابكر، فقلت يا أبابكر، أليس هذا نبي الله حقاً؟ قال: بلى- قلت: ألسنا على الحق وعدونا على الباطل؟ قال: بلى، قلت: فلم نعطي الدنية في ديننا إذاً؟ قال: أيها الرجل، إنه رسول الله وليس يعصي ربه، وهو ناصره، فاستمسك بغرزه، فوالله إنه على الحق - (تفسير ابن كثير 4 / 199) یعنی عمر فاروق کہتے ہیں کہ پھر میں ابوبکر کے پاس گیا۔ میں نے کہا کہ اے ابوبکر، کیا رسول اللہ نبی برحق نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ضرور آپ نبی برحق ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم حق پر ہیں اور ہمارا دشمن باطل پر ہے۔ انھوں نے کہا کیوں نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر کیوں ہم اپنے دین کے معاملے میں ذلت کو اختیار کریں۔ ابوبکر نے کہا کہ اے شخص، وہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ کبھی اپنے رب کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو لازم پکڑو۔ خدا کی قسم، وہ حق پر ہیں۔

دورِ جدید کی مثال

قرآن کی مذکورہ آیت میں اللہ کے جس 'فضل عظیم' کا ذکر ہے، اس کا ظہور صرف ایک بار نہیں ہوا، بلکہ خدا کی دوسری رحمتوں کی طرح وہ بھی تاریخ میں بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ فضل یا اضافی نصرت بہت بڑے پیمانے پر ظاہر ہو چکی ہے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو پہچانیں اور اس کو خدائی مشن کے حق میں بھرپور طور پر استعمال کریں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اِس لیے بھیجا، تاکہ وہ سارے عالم کو امرِ حق سے آگاہ کر دے (25:1)۔ اِس آیت میں جس عالمی نشانے کا ذکر ہے، وہ اول دن سے مطلوب تھا، مگر اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، اِس دنیا میں کسی نشانے کی تکمیل کراماتی طور پر نہیں ہوتی، بلکہ وہ اسباب کے ذریعے ہوتی ہے۔

اِس عالمی دعوتی نشانے کوانجام دینے کے لیے قدیم زمانے میں عالمی مواصلات کا نظام عملاً موجود نہ تھا، اِس بنا پر مطلوب نشانہ بھی قدیم زمانے میں پورا نہ ہوسکا۔

اِس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کیا۔ اِس پراسس کی تکمیل باقاعدہ طور پر انیسویں صدی میں ہوئی۔ انیسویں صدی اور اس کے بعد کی صدی میں وہ تمام اسباب وجود میں آگئے جو دینِ حق کی عالمی پیغام رسانی کے لیے ضروری تھے۔ آج جس چیز کو دورِ مواصلات کہا جاتا ہے، وہ دراصل اِسی خدائی منصوبے کے تحت وجود میں آیا ہے۔

یہ دورِ مواصلات اور اِس نوعیت کے دوسرے تائیدی ذرائع گویا کہ دورِ جدید کے 'فضل عظیم' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام کو اُس زمانے کے اعتبار سے فضلِ عظیم یا موافق اسباب دئے گئے تھے، موجودہ زمانے میں پیغمبر کی امت کو دوبارہ جدید تقاضوں کے مطابق، فضلِ عظیم یا موافق اسباب عطا کیے گئے ہیں۔ اب امت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے فضلِ عظیم کو پہچانے اور اس کو استعمال کر کے اپنے آپ کو اللہ کی عظیم سعادتوں کا مستحق بنائے۔

حدیبیہ انقلاب

قدیم ترین زمانے سے انسان کا یہ ذہن رہا ہے کہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کا سب سے زیادہ طاقت ور ذریعہ جنگ ہے۔ عربی زبان کی ایک قدیم مثل ہے: الحرب أنفى للحرب (جنگ کی کاٹ جنگ ہے)۔ انگریزی زبان میں کہا جاتا ہے — وار فار پیس (war for peace)، یعنی پُرامن مقصد حاصل کرنا ہے تو جنگ کرو۔ فارسی کے ایک قدیم شاعر نے کہا تھا کہ جو شخص تلوار چلاتا ہے، اُسی کے نام کا سکہ چلتا ہے:

ہر کہ شمشیر زند سکّہ بہ نامش خوانند

مگر تاریخ کا تجربہ برعکس طور پر یہ بتاتا ہے کہ جنگ سے کبھی کسی نے کوئی مثبت فائدہ حاصل نہیں کیا۔ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ جنگ میں جو فریق ہارتا ہے، وہ اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہارنے والے فریق کے اندر انتقام (revenge) کی نفسیات جاگ اٹھتی ہے۔ وہ دوبارہ اپنی قوتوں کو مجتمع کرتا ہے اور فاتح فریق کے خلاف انتقامی جنگ چھیڑ دیتا ہے۔ یہی واقعہ بار بار ہوتا رہتا ہے۔ اِس طرح عملاً یہ ہوتا ہے کہ جنگ سے ہمیشہ ایک دورِ برائی (vicious circle) قائم ہوجاتا ہے:

war-defeat-revenge, war-defeat-revenge

مسلم تاریخ بھی اِس معاملے میں استثنا (exception) کی مثال نہیں۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ بتاتی ہے کہ 2 ہجری میں بدر کی لڑائی پیش آئی۔ اِس جنگ میں اہلِ ایمان کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ انھوں نے فریقِ ثانی کے 70 افراد کو قتل کردیا، لیکن مسئلہ ختم نہیں ہوا۔ عملاً یہ ہوا کہ شکست خوردہ فریق انتقامی نفسیات میں مبتلا ہوگیا۔ مکہ لوٹ کر اس نے نئی جنگ کی تیاری شروع کردی اور پھر 3 ہجری میں اس نے انتقامی جذبے کے تحت مدینہ پر حملہ کردیا۔

اس کے نتیجے میں وہ جنگ پیش آئی جس کو جنگ احد کہا جاتا ہے۔ جنگ احد میں اہلِ ایمان کو شکست ہوئی اور فریقِ مخالف نے اِس جنگ میں اہلِ ایمان کے 70 افراد کو قتل کردیا۔ جنگ کے خاتمے پر

فریقِ مخالف کے سردار ابوسفیان نے ایک پہاڑی کے اوپر کھڑے ہوکر بلند آواز سے کہا:
یوم بیوم بدر (آج ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا)۔

تجربہ بتاتا ہے کہ پوری تاریخ میں اربابِ کار اِس حقیقت سے بے خبر رہے کہ انسان کی انتقامی نفسیات اِس میں رکاوٹ ہے کہ جنگ کے ذریعے کوئی مثبت مقصد حاصل کیا جاسکے۔ ایسی حالت میں قابلِ عمل طریقہ صرف یہ ہے کہ جنگ کے بجائے صلح کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ صلح کا فائدہ یہ ہے کہ فریقین کے درمیان پُرامن ماحول قائم ہوجاتا ہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ حالات کے اندر چھپے ہوئے مواقع (opportunities) کو دریافت کرکے انھیں استعمال (avail) کیا جائے۔ اِس مصالحانہ پالیسی کے تحت کامیابی کا حصول پوری طرح ممکن ہوجاتا ہے، کیوں کہ مواقع کے استعمال ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

خدائی منصوبہ بندی

اِس معاملے میں انسان کو صحیح رہنمائی دینے کے لیے اللہ نے تاریخ میں مداخلت کا فیصلہ کیا۔ یہ واقعہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں پیش آیا۔ اللہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس کا ذریعہ بنایا۔ اِس کا آغاز ایک خواب سے ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مدینہ میں تھے۔ یہاں آپ نے ایک خواب دیکھا۔ اِس خواب کے مطابق، آپ ذوالقعدہ 6 ہجری میں اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اِس کے بعد مختلف واقعات پیش آئے۔ آخر کار طویل گفت وشنید (negotiation) کے بعد فریقین کے درمیان وہ معاہدہ طے پایا جس کو تاریخ میں معاہدہ حدیبیہ (Hudaibia Agreement) کہا جاتا ہے۔

یہ معاہدہ اپنی تفصیلات کے اعتبار سے، کئی شرطوں پر مشتمل تھا، لیکن اس کی بنیادی شرط صرف ایک تھی، وہ یہ کہ دس سال تک دونوں فریقوں کے درمیان کوئی جنگ نہ ہوگی۔ اِس شرط کے الفاظ یہ تھے: هذا ما صالح عليه محمد بن عبد الله سهيل بن عمرو اصطلحا على وضع الحرب عن الناس عشر سنين، يأمن فيهن الناس ويكف بعضهم عن بعض (سيرة ابن كثير: 3/321) یعنی

یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے ہوا۔ دونوں اِس پر رضا مند ہوئے کہ دونوں کے درمیان دس سال تک جنگ نہیں ہوگی۔

معاہدہ حدیبیہ دراصل دس سال کے لیے ایک ناجنگ معاہدہ (no-war packt) تھا۔مگر دونوں فریقوں کے درمیان اُس وقت دشمنی کا جو ماحول تھا، اُس کے اعتبار سے اِس قسم کا معاہدہ ایک ایسا معاہدہ تھا جو عملاً ناممکن نظر آتا تھا۔ چناں چہ بظاہر یہ ناممکن چیز صرف اُس وقت ممکن ہوئی، جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقِ ثانی کی کڑی شرطوں کو یک طرفہ طور پر منظور کرلیا۔

مثلاً ایک شرط یہ تھی کہ مکہ کا کوئی شخص اگر اسلام قبول کر کے مدینہ آئے تو اس کو دوبارہ مکہ والوں کی طرف لوٹانا ہوگا۔ اِس کے برعکس، مدینے کا کوئی شخص اگر مکہ چلا جائے تو اہلِ مکہ کو حق ہوگا کہ وہ اس کو مکہ میں روک لیں اور دوبارہ اس کو مدینہ واپس نہ کریں۔ اِسی طرح اِس معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ تمام اہلِ ایمان اِس سال حدیبیہ سے مدینہ واپس چلے جائیں، وہ عمرہ کے لیے مکہ میں داخل نہ ہوں۔

معاہدہ حدیبیہ ایک کاغذ پر لکھا گیا تھا۔ حضرت علی بن ابی طالب اس کی کتابت کررہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق، انھوں نے پہلا جملہ یہ لکھا: هذا ما صالح عليه محمد رسول الله۔ فریقِ ثانی کے نمائندہ سہیل بن عمرو نے اِس پر اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے، اِس لیے آپ صرف ''محمد بن عبد اللہ'' لکھیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے کہا کہ تم کاغذ پر ''رسول اللہ'' کا لفظ مٹا دو اور صرف ''محمد بن عبد اللہ'' لکھو۔ حضرت علی کاغذ سے ''رسول اللہ'' کا لفظ مٹانے پر راضی نہ ہوئے۔ اِس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کو اپنے ہاتھ سے کاغذ سے مٹا دیا۔

اِس معاہدے کی تکمیل کے بعد رسول اور اصحاب رسول مدینہ واپس آگئے۔ اِس معاہدے سے پہلے دونوں فریقوں کے درمیان مسلسل طور پر ایک حالتِ جنگ (state of war) قائم تھی۔ اِس بنا پر اسلام کا دعوتی مشن عملاً تقریباً متروک ہوکر رہ گیا تھا۔ معاہدہ حدیبیہ کے بعد یہ ہوا کہ دونوں فریقوں کے درمیان مکمل امن قائم ہوگیا۔ اب پیغمبر اور آپ کے اصحاب نے دعوت کا نیا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے

منظم انداز میں مدینہ کے اطراف میں مسلسل طور پر دعوتی کام شروع کردیا۔ عرب کے مختلف علاقوں میں آباد قبائل کے درمیان وفود بھیج کر دعوتی کام کیا جانے لگا، حتی کہ عرب کے باہر جو حکومتیں قائم تھیں، اُن کے یہاں دعوتی وفود بھیجے جانے لگے۔ خود مکہ میں رشتے داروں کے ذریعے آمد ورفت جاری ہوگئی۔ اِس طرح خود مکہ میں توحید کی آواز پہنچنے لگی۔

پرامن ماحول میں اِس طرح دعوتی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ کثرت سے اسلام کے حلقے میں داخل ہونے لگے، یہاں تک کہ صرف دو سال کے اندر اہلِ ایمان کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ یہ ممکن ہوگیا کہ جنگ کے بغیر خود اہلِ ایمان کی تعداد اسلام کی فتح کے لیے کافی ہوجائے۔ چناں چہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموش منصوبہ بندی کے تحت دس ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف مارچ کیا۔ اِس طرح کسی جنگ کے بغیر مکہ پر اہلِ ایمان کا غلبہ قائم ہوگیا۔ توحید کی آواز انسانی فطرت کی آواز ہے۔ اگر معتدل ماحول میں دعوتی کام ہو تو پر امن دعوت ہی لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہوجائے۔ روایات میں آیا ہے کہ جب اچانک ایک صبح کو اہلِ مکہ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوگئے ہیں تو مکہ کے سردار ابو سفیان نے یہ اعلان کردیا: یامعشر قریش، هذا محمد قد جاءکم فیما لا قِبل لکم به، فمن دخل دار أبي سفیان فهو آمن (سیرة بن هشام: 4/23) یعنی اے قریش کے لوگو، یہ محمد ہیں جو اِس طرح مکہ میں داخل ہوگئے ہیں کہ تمھارے اندر اُن کے مقابلے کی طاقت نہیں۔

معاہدۂ حدیبیہ کے نتیجے میں جو تاریخی واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:1-2) یعنی جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح، اور تم لوگوں کو دیکھو کہ وہ فوج درفوج خدا کے دین میں داخل ہورہے ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں 'نصر اللہ' سے مراد وہی چیز ہے جس کو دوسرے مقام پر نصرِ عزیز (48:1-2) کہا گیا ہے۔ 'يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا' کے الفاظ میں اُس واقعے کا ذکر ہے جو

معاہدہ حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔لوگ اتنی بڑی تعداد میں اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے کہ ان کی کثرتِ تعداد ہی فتح کا سبب بن گئی۔

حکمتِ حدیبیہ

نزاع (conflict) کے معاملے میں انسان قدیم زمانے سے صرف یہ جانتا تھا کہ ایسے معاملے میں صرف دو میں سے ایک کا انتخاب (choice) ہوتا ہے—جنگ یا پسپائی۔مگر انسان کی یہ سوچ ثنائی طرزِ فکر (dichotmous thinking) پر مبنی تھی۔قانونِ فطرت کے مطابق، یہاں ایک اور انتخاب ممکن تھا جس سے پوری تاریخ میں انسان بے خبر رہا۔

وہ انتخاب یہ تھا کہ یک طرفہ صلح کے ذریعے امن قائم کیا جائے اور پھر حکیمانہ منصوبہ بندی کے ذریعے موجود مواقع (opportunities) کو بھر پور طور پر استعمال (avail) کیا جائے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ نہ فریقِ ثانی سے ٹکراؤ کیا جائے اور نہ پسپائی کا طریقہ اختیار کیا جائے، بلکہ خاموش منصوبہ بندی کے ذریعے امن کی طاقت (power of peace) کو استعمال کیا جائے۔حدیبیہ کے تاریخی واقعے کے تحت اللہ تعالی نے رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے اِس حکمت کا عملی مظاہرہ (practical demonstration) کروایا۔

مگر یہ تاریخ کا عجیب سانحہ ہے کہ حکمتِ حدیبیہ کے کامیاب مظاہرے کے باوجود مسلم اور غیر مسلم دونوں اِس عظیم حقیقت سے بے خبر رہے۔تاریخ میں حکمت حدیبیہ کو صرف ایک بار استعمال کیا گیا، نہ اُس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔انسان ہمیشہ امن کے بارے میں سوچتا رہا ہے، حتی کہ امن باقاعدہ مطالعے کا ایک مستقل موضوع بن گیا ہے جس کو پیسیفزم (pacifism) کہا جاتا ہے۔اِس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔اِس موضوع پر ایک انسائکلو پیڈیا بھی تیار کی گئی ہے جس کا نام انسائکلو پیڈیا آف پیسیفزم (*Encyclopaedia of Pacifism*) ہے، مگر اب تک کوئی قابل عمل نظریۂ امن (ideology of peace) دریافت نہ ہوسکا۔

روسی مصنف لیوٹالسٹائے (وفات: 1910) کی امن کے موضوع پر ایک مشہور کتاب ہے۔

ورلڈلٹریچر میں وہ ٹاپ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ امن کا قیام صرف عالمی محبت (universal love) کے تصور پر قائم ہوسکتا ہے۔ اُس کی اِس روسی کتاب کا ترجمہ مختلف عالمی زبانوں میں ہوا ہے۔ انگریزی ترجمے کا ٹائٹل یہ ہے:

War and Peace, by LeoTolstoy—1865

مگر جیسا کہ معلوم ہے، ٹالسٹائے کی کتاب صرف ایک ناول ہے، یعنی وہ فکشن کے پیرایے میں لکھی گئی ہے، اور کوئی فکشن حقیقی زندگی (real life) کے لیے گائڈ بک نہیں بن سکتا۔

قرآن کا بیان

معاہدہ حدیبیہ ذوالقعدہ 6 ہجری میں طے پایا۔ اس کے فوراً بعد قرآن کی سورہ الفتح نازل ہوئی۔ اِس سورہ کی ابتدائی تین آیتیں یہ تھیں: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا (48:1-3) یعنی بے شک ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی تاکہ اللہ تمھاری اگلی اور پچھلی خطائیں معاف کردے اور تمھارے اوپر اپنی نعمت کی تکمیل کردے اور تم کو سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو زبردست مدد عطا کرے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ الفتح دورانِ سفر اُس وقت اتری جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ حدیبیہ کی تکمیل کے بعد حدیبیہ سے مدینہ جارہے تھے۔ اُس وقت جو واقعہ ہوا تھا، وہ صرف معاہدۂ امن تھا۔ جہاں تک فتح کی بات ہے، وہ ابھی مستقبل کی چیز بنی ہوئی تھی۔ پھر کیوں ایسا ہوا کہ ماضی کے صیغے میں ارشاد ہوا کہ ہم نے تم کو فتح دے دی، کھلی ہوئی فتح۔ یہ اسلوب دراصل امن کی اہمیت بتانے کے لیے تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب حقیقی معنوں میں پرامن طریقہ (peaceful method) اختیار کیا جائے، تو اُس کے بعد موافق نتیجے کا نکلنا یقینی ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ 'لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ' اِس آیت میں 'ذنب' کا لفظ ہے۔ 'ذنب' کے لفظی معنی گناہ (sin) کے ہوتے ہیں۔ مگر یہاں 'ذنب' کا لفظ اپنے معروف معنی کے اعتبار سے

نہیں ہے، بلکہ وہ شدتِ اظہار کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالی نے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر یک طرفہ امن کی طرف رہنمائی کی تو تمھارے اندر اِس کے درست ہونے پر شک کیوں پیدا ہوا۔ جیسا کہ روایات میں آیا ہے، صحابہ نے اِس معاہدے پر برہمی کا اظہار کیا تھا۔ حضرت عمر فاروق نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ: لم نعطي الدنية في ديننا (ہم اپنے دین کے بارے میں ذلت کا طریقہ کیوں اختیار کریں)۔ اِسی طرح یہاں 'مغفرت' سے مراد معروف معنی میں بخشش (salvation) نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تحریکِ توحید کے دوران اہلِ ایمان سے تدبیر کے اعتبار سے جو خطائیں ہوئیں، اُن کو موثر نہ ہونے دینا، اِن تدبیری خطاؤں کے باوجود آخری کامیابی کو یقینی بنانا۔

آیت میں واحد کا صیغہ (ليغفر لك) استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، مگر یہ خطاب نمائندہ ہونے کے اعتبار سے ہے، یعنی اُس وقت رسول کی حیثیت جماعتِ مسلمین کے نمائندہ کی تھی۔ گویا اِس آیت میں رسول کو خطاب کرتے ہوئے پوری جماعتِ مسلمین کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ بہ اعتبار حقیقت، اس سے مراد اُس وقت کے اہلِ ایمان کی پوری جماعت ہے۔ اِس تفسیر کا ایک قرینہ یہ ہے کہ قرآن میں اِس معاملے کو 'إنا فتحنا لك' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، حالاں کہ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ یہ فتح پیغمبر اسلام کی شخصی فتح نہ تھی، وہ اس وقت کی تمام جماعتِ مومنین کی اجتماعی فتح تھی۔ اِس کا دوسرا قرینہ یہ ہے کہ آگے اِس سورہ کی آیت نمبر 5 میں جمع کے الفاظ آئے ہیں۔ (48:8)

اِس آیت میں اتمامِ نعمت سے مراد وہ چیز نہیں ہے جس کو دوسرے مقام پر اکمالِ دین (6:3) کہا گیا ہے۔ سورہ الفتح میں اتمامِ نعمت سے مراد وہ حکیمانہ تدبیر ہے جس کی تلقین حدیبیہ کے معاملے میں اللہ کی طرف سے کی گئی تھی۔ آگے فرمایا کہ 'ويهديك صراطا مستقيما'۔ اِس آیت میں صراطِ مستقیم کا لفظ ایک مختلف معنی میں آیا ہے۔ سورہ الفاتحہ میں صراطِ مستقیم سے مراد انفرادی صراطِ مستقیم ہے اور سورہ الفتح میں صراطِ مستقیم سے مراد اجتماعی صراطِ مستقیم۔

آخر میں فرمایا کہ: وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۔ اِس آیت میں نصرِ عزیز سے مراد عام فتح

نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ فتح ہے جو مکمل طور پر پُرامن تدبیر کے ذریعے حاصل ہو، جیسا کہ معاہدۂ حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔ نصرِ عزیز کا یہ مفہوم قرآن کی سورہ النصر (110) سے مزید واضح ہوتا ہے۔ اِس سورہ میں 'نصر اللہ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ 'نصر اللہ' (خدائی فتح) کس طرح حاصل ہوئی۔ واضح طور پر وہ اُس پرامن تدبیرِ حکمت کے ذریعے حاصل ہوئی جو معاہدہ حدیبیہ کے وقت اختیار کی گئی تھی۔

حدیبیہ کلچر

معاہدہ حدیبیہ سادہ طور پر صرف ایک معاہدہ نہ تھا۔ معاہدہ حدیبیہ کے ذریعے انسان کے اوپر ایک عظیم حکمت (wisdom) کو کھولا گیا، یعنی یہ حکمت کہ اجتماعی زندگی میں کامیابی کا طریقہ کیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں 2 ہجری میں بدر کی لڑائی پیش آئی۔ اِس لڑائی میں اہلِ ایمان کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی، لیکن اِس کے صرف ایک سال بعد احد کی لڑائی پیش آئی۔ اِس لڑائی میں فریقِ ثانی نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے لڑائی کے میدان میں اہلِ ایمان کے 70 آدمیوں کو ہلاک کردیا۔ ایسا انتقامی نفسیات کی بنا پر ہوا۔ بدر کی لڑائی اہلِ ایمان کے لیے فتح تھی، لیکن فریقِ ثانی کے لیے وہ انتقام کے ہم معنی بن گئی:

Battle of Badr was victory for Muslims and revenge for the other party.

اِس تجربے سے معلوم ہوا کہ جنگ مسئلے کا حل نہیں۔ جنگ میں کامیابی صرف اُس وقت مسئلے کا حل بن سکتی ہے جب کہ فریقِ ثانی اپنی شکست (defeat) کو تسلیم کرے۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ہارا ہوا فریق اپنی ہار کو نہیں مانتا، بلکہ اس کے اندر انتقام کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ اِس بنا پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جنگ کبھی مسئلے کو ختم کرنے والی ثابت نہیں ہوتی۔

اِس بنا پر اللہ کی رہنمائی کے تحت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلے کے حل کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ اِس طریقے کو حکمتِ حدیبیہ کہہ سکتے ہیں۔ حدیبیہ کا معاہدہ ایک ناجنگ معاہدہ (no-war pact) تھا، جو فریقِ ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان کر انجام پایا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم معاہدے کو مکمل کرنے کے بعد حدیبیہ سے مدینہ کی طرف واپس لوٹے۔ سفر کے دوران آپ پر سورہ الفتح نازل ہوئی۔ معاہدہ حدیبیہ پر آپ کے اصحاب خوش نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورہ الفتح اپنے اصحاب کو سنائی تو صحابہ کو اِس کے بارے میں تردد ہوا۔ حضرت عمر فاروق نے تعجب کے ساتھ کہا: أوفتح هو يا رسول الله؟ قال: نعم، والذي نفسي بيده إنه لفتح۔ (اے خدا کے رسول، کیا یہ فتح ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، بے شک وہ فتح ہے)۔ ایک اور شخص نے کہا کہ: ما هذا بفتح (یہ تو کوئی فتح نہیں)۔ اِس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بل هو أعظم الفتوح (وہ فتح ہے، بلکہ وہ تمام فتحوں سے زیادہ بڑی فتح ہے) تفسیر القرطبي: 16/260

معاہدہ حدیبیہ جیسے ایک معاہدے کو قرآن میں فتح مبین کیوں کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمایا کہ یہ ایک عظیم فتح ہے، حالاں کہ آیت کے نزول کے وقت عملی طور پر 'فتح' کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تبصرہ سیاسی فتح کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ اِس معنی میں تھا کہ اِس معاہدے کے نتیجے میں اہلِ ایمان کو اپنے حریف کے اوپر بالادستی حاصل ہوگئی، یعنی اہلِ ایمان اپنے حریف کے مقابلے میں ایڈوانٹج کی پوزیشن میں آگئے۔

معاہدہ حدیبیہ کے وقت فریقِ ثانی کے پاس صرف تلوار کی طاقت تھی۔ اِس معاہدے نے فریقِ ثانی کو پابند کر دیا کہ وہ اپنی تلوار کو اہلِ ایمان کے خلاف استعمال نہ کرے۔ اِس طرح گویا اہلِ ایمان کے مقابلے میں، فریقِ ثانی خود تو بے طاقت ہو کر رہ گیا۔ لیکن اہلِ ایمان کے پاس تلوار کے سوا ایک اور چیز تھی جو فریقِ ثانی کے پاس نہ تھی اور وہ ہے نظریہ توحید (ideology of Tauhid)۔ یہ نظریاتی طاقت پوری طرح قابلِ استعمال تھی۔ معاہدہ حدیبیہ کے بعد یہ ہوا کہ فریقِ ثانی عملی طور پر کچھ کرنے کے قابل نہ رہا۔ اِس کے برعکس، امن کے قیام کی بنا پر اہلِ ایمان کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنی پوری طاقت کو استعمال کرتے ہوئے اپنی آئڈیالوجی کی بھرپور تبلیغ کریں۔

چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ ایک طرف فریقِ ثانی اِس پر مجبور ہوگیا کہ وہ اہلِ ایمان کے خلاف

اپنی تلوار نہ استعمال کرے اور دوسری طرف اہلِ ایمان کامل آزادی کے ماحول میں نظریہ توحید کی تبلیغ واشاعت میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ انھوں نے عرب کے تمام شہروں اور قبیلوں میں توحید کا پیغام پہنچانا شروع کردیا، حتی کہ عرب کے باہر جو ممالک تھے، اُن کے باشندوں تک بھی وہ اسلام کا پیغام پہنچانے لگے۔ اِسی حکمتِ حدیبیہ کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف دو سال میں پورا عرب اسلام میں داخل ہوگیا۔

حدیبیہ پالیسی کا فائدہ صرف یہ نہ تھا کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے ملک میں اسلام کو یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ مختصر مدت میں وہاں ایک غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) آگیا۔ اس کا دوسرا عظیم فائدہ یہ ہوا کہ حدیبیہ پالیسی کے ذریعے عرب میں جو انقلاب آیا، اُس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایک نیا عمل (process) جاری کردیا۔ یہ عمل مختلف مراحل سے گزرتا ہوا موجودہ دور تک پہنچا۔ اِس اعتبار سے، موجودہ دور کو حدیبیہ پراسس کا نقطہ انتہا کہا جاسکتا ہے۔

حدیبیہ حکمت کیا تھی۔ حدیبیہ حکمت مختصر طور پر یہ تھی کہ جنگی ٹکراؤ کو بند کرکے امن کا ماحول قائم کرنا اور پھر پُرامن کوشش کے ذریعے اسلام کے فطری پیغام (natural message) کو لوگوں تک پہنچانا۔ موجودہ زمانے میں انسانی تعلقات کے درمیان جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، اس کے بعد یہی حدیبیہ کلچر تمام قوموں کے اتفاق کے ساتھ ساری دنیا میں رائج ہوگیا ہے۔ اِس اعتبار سے، موجودہ دور کو دورِ حدیبیہ (age of *Hudaibia*) کہا جاسکتا ہے۔ پچھلے دور میں حدیبیہ کلچر صرف مقامی طور پر آیا تھا۔ موجودہ زمانے میں حدیبیہ کلچر کسی قربانی کے بغیر عالمی سطح پر قائم ہوگیا ہے۔

اقوامِ متحدہ کا قیام

اقوامِ متحدہ (UNO) 1945 میں قائم ہوئی۔ اِس ادارے کا خاص مقصد عالمی امن کا قیام تھا۔ دنیا کے تمام ممالک باقاعدہ طور پر اس کے ممبر بنے۔ اِس بین اقوامی ادارے کا ہیڈ کوارٹر نیو یارک (امریکا) میں قائم ہے۔ اِس عالمی ادارے کے تحت تمام ملکوں کے اتفاق سے ایک چارٹر (charter) تیار کیا گیا، جس کو اقوامِ متحدہ کا منشور (Charter of the United Nations) کہا جاتا ہے۔ اِس چارٹر کے تحت تمام قوموں کے اتفاق سے ایک قرارداد طے پائی جو دفعہ 2 (4) کے طور پر اِس چارٹر میں

شامل ہے۔اقوامِ متحدہ کے اِس چارٹر کی دفعہ کے تحت تمام قوموں کے اتفاق سے یہ طے پایا کہ — تمام ممبر ممالک بین اقوامی تعلقاتی میں اِس کے پابند ہیں کہ وہ کسی ریاست کو اس کے استحکام یا اس کی سیاسی آزادی کے معاملے میں دھمکی نہیں دیں گے اور نہ اس کے خلاف طاقت کا استعمال کریں گے:

All Members shall refrain in their international relations from the threat or use of force against the territorial integrity or political independence of any state.

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی یہ دفعہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے، عین وہی ہے جو معاہدہ حدیبیہ کے وقت طے پائی تھی۔مزید یہ کہ ساتویں صدی میں معاہدہ حدیبیہ کے وقت فریقِ ثانی کی جن شرطوں کو یک طرفہ طور پر ماننا پڑا تھا، بیسویں صدی میں تمام قوموں نے اِن شرطوں کو بطور خود حذف کر دیا۔ موجودہ زمانے میں اہلِ ایمان کو اِس چارٹر کے مطابق، خود حالات کے تحت، عالمی امن حاصل ہو گیا ہے۔اِسی کے ساتھ موجودہ زمانے میں مزید اضافے کے ساتھ وہ تمام امکانات اور مواقع پوری طرح کھل گئے ہیں جو دعوت الی اللہ کے عالمی مشن کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً مذہبی آزادی، کھلا پن (openness)، عالمی کمیونیکیشن، آزادانہ آمد و رفت، پرنٹنگ پریس، وغیرہ۔

سورہ الفتح جو معاہدہ حدیبیہ کے بعد اتری تھی، اُس کا خاتمہ اِس آیت پر ہوا ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۖۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (48:29)

ترجمہ: ’’محمد، اللہ کے رسول اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں، وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔تم اُن کو رکوع میں اور سجدے میں دیکھو گے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔اُن کی نشانی ان کے چہروں پر ہے، سجدے کے اثر سے۔ان کی یہ مثال

تورات میں ہے۔ اور انجیل میں اُن کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی ۔ اس نے اپنا انکھوا نکالا ، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ اور موٹا ہوا، پھر وہ اپنے تنے پر کھڑا ہوگیا۔ وہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے، تا کہ اللہ اُن سے منکرین کو غصہ دلائے ۔ اُن میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ نے اُن سے معافی اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے''۔

قرآن کی سورہ الفتح کے خاتمے کے یہ الفاظ تمثیل کی زبان میں ایک اہم تاریخی حقیقت کو بتارہے ہیں، وہ یہ کہ معاہدۂ حدیبیہ جو ذوالقعدہ 6 ہجری میں پیش آیا، وہ کوئی وقتی اور محلّی چیز نہ تھا، بلکہ وہ ایک عظیم عمل (process) کا آغاز تھا، جس کے تکمیلی مرحلے پر ایک عالمی انقلاب آنے والا تھا۔ یہ انقلاب تدریجی طور پر آیا اور بیسویں صدی عیسوی میں اس کی تکمیل ہوئی۔

اِس عالمی انقلاب سے مراد وہی چیز ہے جس کو ہم نے دورحدیبیہ (age of *Hudaibia*) کہا ہے۔ معاہدہ حدیبیہ کا خلاصہ یہ تھا کہ فریقِ ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان کر امن قائم کرنا اور پھر تمام موجود مواقع کو دعوت الی اللہ کے لیے استعمال کرنا۔ یہ موافق حالات جو قدیم زمانے میں رسول اور اصحابِ رسول کی قربانیوں کے ذریعے ظہور میں آئے تھے، وہ اب عالمی تبدیلیوں کے نتیجے میں خود زمانی تقاضے کے تحت مزید اضافے کے ساتھ حاصل ہوگئے ہیں۔

یہ جدید موافق حالات جن اسباب کے ذریعے ظہور میں آئے، وہ وہی ہیں جن کو مغربی تہذیب، جمہوری افکار، اقوامِ متحدہ، وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یہ بظاہر سیکولر انقلابات تھے، لیکن اللہ نے اِن بظاہر سیکولر انقلابات کو دین کی تائید کا ذریعہ بنادیا۔

خلاصہ کلام

ساتویں صدی عیسوی میں حدیبیہ معاہدے کا جو موافق نتیجہ ظاہر ہوا تھا، اس کو قرآن میں 'فتحِ مبین' کہا گیا ہے۔ حدیبیہ معاہدہ کوئی پر اسرار چیز نہ تھی، وہ ایک معلوم حکیمانہ تدبیر تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں اِس تدبیر کو صرف محدود طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ وہ بھی اِس طرح کہ رسول اور اصحابِ رسول کو یہ قربانی دینی پڑی تھی کہ وہ فریق ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیں، حتی کہ

لفظ ''رسول اللہ'' کو وہ معاہدے کی دستاویز سے مٹادیں۔مگر بعد کو اللہ کی مدد سے جو حالات پیدا ہوئے، اُس کے بعد ایسا ہوا کہ حدیبیہ انقلاب وسیع تر معنی میں ایک عالمی انقلاب بن گیا۔

حدیبیہ معاہدے کے ذریعے جو امکانات صرف دس سال کے لیے حاصل کیے گئے تھے، موجودہ زمانے میں انھوں نے مستقل طور پر عالمی اصول (universal norm) کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ اب نہ دوسروں کی شرطوں کو ماننے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دستاویز سے ''رسول اللہ'' کے لفظ کو مٹانے کی ضرورت۔

حدیبیہ معاہدے کے بعد اہلِ ایمان کو کام کے جو مواقع ملے تھے، وہ اب مزید اضافے کے ساتھ اُن کو حاصل ہو چکے ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اِن مواقع کو دریافت کیا جائے اور دانش مندی کے ساتھ اس کو استعمال کیا جائے۔

ایک تاریخی قانون

قرآن کی سورہ البقرہ میں ایک تاریخی قانون کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِہٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:250-251)۔ یعنی جب جالوت اور اس کی فوجوں سے اُن (بنی اسرائیل) کا سامنا ہوا تو انھوں نے کہا: اے ہمارے رب، ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو جما دے اور منکروں کے مقابلے میں تو ہماری مدد کر۔ پھر انھوں نے اللہ کے اذن سے اُن (فلسطینیوں) کو شکست دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اور اللہ نے داؤد کو ملک اور حکمت عطا کیا اور جن چیزوں کا چاہا، اس کا علم بخشا۔ اور اگر اللہ بعض کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا رہے تو زمین فساد سے بھر جائے۔ مگر اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

> Had it not been for God's repelling some people by means of others, the earth would have been filled with corruption. But God is bountiful to mankind.

قرآن کی اِن آیات میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ واقعہ قبل مسیح دور سے تعلق رکھتا ہے۔ فلسطین کے جنوبی حصہ (southern coastal area) میں ایک واقعہ ہوا۔ بارہویں صدی قبل مسیح میں یہاں ایک قوم آ کر آباد ہوئی جس کو تاریخ میں، فِلسطی یا فَلسطینی (Philistines) کہا جاتا ہے۔ اِن لوگوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بعد کو اُن کے درمیان بگاڑ آیا۔ اُس زمانے میں فلسطین کے شمالی حصے میں بنی اسرائیل آباد تھے۔ فلسطینی، بنی اسرائیل کے خلاف سرکشی کرنے لگے، یہاں تک کہ 1010 قبل مسیح میں فلسطینیوں کا بنی اسرائیل سے مسلّح ٹکراؤ ہوا۔ اِس ٹکراؤ میں ایک اسرائیلی نوجوان داؤد کی بہادری سے فلسطینیوں کو شکست ہوئی۔ اِس کے بعد رفتہ رفتہ 732 قبل مسیح میں فلسطینیوں کا اِس علاقے سے خاتمہ ہو گیا۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں 'دفع' (repel) کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی ہٹانا۔لسان العرب میں 'دفع' کی تشریح 'الإزالة بقوة' (8/87) سے کی گئی ہے۔یہ 'دفع' دراصل تاریخ کے بارے میں اللہ کا ایک قانون ہے۔مذکورہ واقعے میں اللہ تعالیٰ نے اسرائیلی گروہ کے ذریعے فلسطینی گروہ کو اقتدار سے ہٹایا تھا۔اللہ انسانی تاریخ کی مسلسل نگرانی کررہا ہے، وہ انسان کی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے انسانی تاریخ کو مینیج (manage) کررہا ہے، وہ بار بار ایسے حالات پیدا کرتا ہے جب کہ ایک قوم دوسری قوم کو مقامِ اقتدار سے ہٹائے۔اگر ایک قوم مسلسل طور پر مقامِ اقتدار پر قابض رہے تو اُس کے اندر جمود (stagnation) پیدا ہوجائے گا۔یہ جمود مختلف صورتوں میں فساد (corruption) کا سبب بنے گا۔

دفع کے اِس قانون کا تعلق سیکولر قوموں سے بھی ہے اور مذہبی قوموں سے بھی۔اِس معاملے کی ایک مثال ہندستان ہے۔ہندستان میں پہلے راجاؤں کی حکومت تھی۔راجاؤں کے بعد یہاں مغل دور آیا، پھر مغل دور ختم ہوا اور برٹش دور آیا۔اس کے بعد 1947 میں برٹش دور کا خاتمہ ہوا اور قومی حکومت (national government) کا دور آیا۔یہ تمام تبدیلیاں دفع کے قانون کے تحت ہوئیں۔ہر بار جب ایک گروہ کے اندر ''فساد'' آ گیا تو اس کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم لائی گئی۔گویا پرانے خون (old blood) کی جگہ نئے خون (new blood) کو کام کرنے کا موقع دیا گیا۔اِس عمل کو ریڈیکل آپریشن (radical operation) کہا جاسکتا ہے۔

اوپر کی آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔آیت کے اِس ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ کے جس 'فضل' کا ذکر ہے، اُس سے مراد یہی قانونِ دفع ہے جو مسلسل طور پر سیاسی اقتدار کی تنظیم کررہا ہے۔یہ تنظیم انسان کی اعلیٰ بہبود کے لیے ہے۔اگر قانونِ دفع کی صورت میں انسانی اقتدار کی تنظیم نہ کی جائے تو دنیا میں سیاسی اجارہ داری (political monopoly) آجائے اور پھر انسانی تاریخ اپنی مطلوب منزل پر نہ پہنچ سکے گی۔

یہود کی تاریخ

دفع کے اِس قانون کا نفاذ بعد کے زمانے میں خود یہود (بنی اسرائیل) پر کیا گیا۔بنی اسرائیل کو

اللہ تعالیٰ نے عروج اور غلبہ عطا کیا، لیکن ایک مدت کے بعد یہود میں بھی وہی ''فساد'' پیدا ہوا جو کہ ہر قوم میں پیدا ہوتا ہے۔ جب ایسا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے کسی اور قوم کے ذریعے یہود کے ساتھ دفع کا وہی معاملہ کیا جس کو ہم نے ریڈیکل آپریشن (radical operation) کا نام دیا ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن میں دو متعین آپریشن کا حوالہ دیا گیا (17:4-8)۔ پہلا واقعہ بابل (عراق) کے بادشاہ نبوکدنضر (Nebuchadnezzar) کا ہے۔ اس نے 586 قبل مسیح میں فلسطین پر حملہ کیا، جو اُس وقت بنی اسرائیل کے زیر قبضہ تھا۔ نبوکدنضر نے بنی اسرائیل کی سیاسی طاقت کو توڑ دیا اور یروشلم میں ان کے عبادت خانہ (ہیکل سلیمانی) کو مکمل طور پر ڈھا دیا۔ اِس کے بعد دوسرا واقعہ وہ ہے جو رومی بادشاہ ٹائٹس (Titus) کے ذریعے پیش آیا۔ ٹائٹس نے 70 عیسوی میں یروشلم پر حملہ کرکے اس کو پوری طرح تباہ کر دیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تذکیر القرآن، صفحہ 762-760)۔

بنی اسرائیل کے خلاف یہ آپریشن بطور سزا (punishment) نہ تھا، بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ بطور انتباہ (warning) تھا۔ وہ اِس لیے تھا کہ بنی اسرائیل متنبہ ہوں، اُن کا جمود ٹوٹے اور وہ اپنی اصلاح کرکے دوبارہ اللہ کی رحمت کے مستحق بن جائیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (17:8)۔ لیکن بنی اسرائیل دوبارہ اصلاح قبول نہ کرسکے۔ وہ بدستور اپنی حالت پر قائم رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حاملِ کتاب الٰہی ہونے کی حیثیت سے معزول کر دیا اور بنو اسماعیل کو حاملِ کتاب الٰہی کی حیثیت دے دی۔ تبدیلی کے اِس واقعے کا ذکر قرآن کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (4:54)۔

مسلم تاریخ کی مثال

مسلم ملت دفع کے اِس تاریخی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ چناں چہ پچھلے چودہ سو سال میں یہ معاملہ بار بار پیش آیا ہے، یعنی ایک گروہ کو مقامِ اقتدار سے ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے گروہ کو

مقامِ اقتدار پر لانا، ایک گروہ کو معزول کرکے دوسرے گروہ کو کام کا موقع دینا۔
پچھلے چودہ سو سال میں جن مسلم گروہوں کو اقتدار ملا، اُن کی بنیادی تقسیم یہ ہے:

1۔ خلافتِ راشدہ (Rashidun Caliphate) 632-661ء
2۔ خلافتِ امیہ (Umayyad Caliphate) 661-750ء
3۔ خلافتِ اندلس (Moorish Empire) 711-1492ء
4۔ خلافتِ بنوعباس (Abbasid Empire) 750-1258ء
5۔ مغل سلطنت (Mughal Empire) 1226-1857ء
6۔ عثمانی خلافت (Ottoman Empire) 1299-1922ء

مذکورہ سیاسی واقعات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلم گروہ کو اقتدار حاصل ہوتا ہے اور پھر ایک مدت کے بعد اُس کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے گروہ کو لایا جاتا ہے۔ مسلم ملت کے درمیان یہ سلسلہ تقریباً انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کا غلبہ ختم ہوجاتا ہے اور مغربی قوموں کو غلبہ حاصل ہوجاتا ہے، خواہ براہِ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر۔ یہ تمام واقعات اتفاقاً نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ وہ اللہ رب العالمین کے قائم کردہ تاریخی قانون کے تحت ہو رہے ہیں۔

خلافتِ راشدہ کی اصطلاح ایک سیاسی ادارہ کی حیثیت سے بعد کے دور میں وضع ہوئی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا جو سیاسی ادارہ قائم ہوا، وہ تقریبا 30 سال تک باقی رہا۔ اس کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا۔ ایسا اتفاقاً نہیں ہوا۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ بعد کے زمانے میں خلافت کا یہ ادارہ اپنی اخلاقی خوبیوں کے باوجود سیاسی استحکام (political stability) کو باقی رکھنے کے قابل نہ رہا، اِس لیے اس کو ہٹا کر بنوامیہ کا دور لایا گیا۔ بنوامیہ کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے عربی زبان اور عرب کلچر (المروءۃ، وغیرہ) کے فروغ کا شدت سے اہتمام کیا جو کہ اُس وقت قرآن کی کامل حفاظت کے لیے ضروری تھا۔

بنوامیہ کی حکومت تقریباً 90 سال تک جاری رہی۔ ان کے دورِ حکومت کے آخری زمانے میں یہ بات واضح ہوگئی کہ عربیت کے تحفظ میں انھوں نے عالمی تقاضے کو فراموش کردیا۔ چناں چہ اس کے بعد

بنوامیہ کواقتدار کے مقام سے ہٹا کران کی جگہ بنوعباس کولا یا گیا۔ بنوعباس کے دور میں کئی بڑے بڑے کام انجام پائے — احادیث کوجمع کرنا، علومِ اسلامی کی تدوین، اسلام کی اشاعت، وغیرہ۔ اِس کے علاوہ انھوں نے اُس وقت کے سیکولر علوم کو حاصل کیا اوران کوفروغ دیا۔

اِس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر عالمی فکر پیدا ہوا۔ بنوعباس کے دبدبے کے تحت حفاظتِ دین کا کام کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ واضح ہو کہ دورِ قدیم میں حفاظتِ دین کے لیے سیاسی دبدبہ ضروری تھا، مگر اب پرنٹنگ پریس اور دوسرے موافق اسباب کے ظہور کے بعد سیاسی دبدبے کے بغیر خدا کا دین کامل طور پر محفوظ ہے۔

بنوعباس کی سلطنت تقریباً 500 سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد فطری طور پر بنوعباس میں جمود کا دور آ گیا۔ وہ ترقی کے سفر کو مزید جاری رکھنے کے قابل نہ رہے۔ چناں چہ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے ذریعے ایک آپریشن کیا گیا اور اِس طرح عباسی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

اِس کے بعد تاریخی قانون کے مطابق، دوسری قوموں کو موقع دیا گیا۔ عباسی دور ہی میں ایک مسلم گروہ اٹھا جس نے اندلس (اسپین) میں اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ اِس حکومت کو سیکولر مورخین مورش سلطنت (Moorish Empire) کا نام دیتے ہیں۔ مورش سلطنت کو موافق حالات ملے، چناں چہ انھوں نے علم کی ترقی میں مزید بہت زیادہ اضافہ کیا۔ اُس دور کے ترقیاتی نمونوں کو استنبول (ترکی) کے میوزیم
(The Istanbul Museum of the History of Science and Technology in Islam)
میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مگر بعد کے دور میں اندلس کی مسلم سلطنت میں بگاڑ آ گیا۔ اس کے حکمراں عیش وعشرت میں پڑ گئے۔ آخر کار 700 سال سے زیادہ مدت کے بعد اُن پر دفع کا قانون نافذ ہوا اور اسپین کے مسیحی حکمراں نے لڑ کر اُن کا خاتمہ کر دیا۔

اِسی دور میں مغل حکمراں ہندستان میں داخل ہوئے اور یہاں ایک طاقت ور مسلم سلطنت قائم کر دی۔ مغل سلطنت کے زیر سایہ ہندستان میں کئی کام انجام پائے۔ مغل حکمرانوں کو دعوت وتبلیغ سے

کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن اُن کے دبدبے کے تحت صوفیوں کو یہ موقع ملا کہ وہ اِس ملک میں اسلام کی اشاعت بڑے پیمانے پر کرسکیں۔ لیکن بعد کے دور میں مغل حکمرانوں میں بھی وہی بگاڑ آیا جو ہر قوم میں آتا ہے۔ چناں چہ 600 سال کے بعد ہندستان میں برٹش قوم ابھری اور اس نے 1857 میں مغل سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

اِس سلسلے میں آخری نام عثمانی خلافت کا ہے۔ اس نے یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبے میں اپنی سلطنت قائم کی۔ اس نے لمبے عرصے تک اسلام کا دبدبہ قائم رکھا۔ اِس طرح یہ ہوا کہ پرنٹنگ پریس اور دوسرے موافق اسباب کے ظہور سے پہلے کے دور میں وہ دینِ اسلام کی محافظ بنی رہی۔ آخر کار عثمانی خلافت میں بھی بڑے پیمانے پر جمود پیدا ہوا، وہ مسلسل کمزور ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ 600 سال کے بعد مغربی قوموں کا ظہور ہوا اور اِس طرح عثمانی خلافت کا دور ختم ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ کمال اتاترک (وفات: 1938) نے عثمانی خلافت کا خاتمہ کر دیا، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ کمال اتاترک نے 1924 میں ترک خلافت کے خاتمے کا صرف اعلان کیا تھا، اُس کا خاتمہ اِس سے بہت پہلے ہو چکا تھا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ماہ نامہ الرسالہ، نومبر 2012)۔

جمہوریت کا رول

دفع کا قانون پچھلے زمانے میں انقلابی عمل (ریڈیکل آپریشن) کے ذریعے انجام پاتا تھا، مگر موجودہ زمانے میں اِس طریقے کو بدل دیا گیا۔ اِسی بدلے ہوئے طریقے کو موجودہ زمانے میں جمہوریت کہا جاتا ہے۔ جمہوریت دراصل دفع کے قانون کا باقاعدہ انسٹی ٹیوشنلائزیشن (institutionalization) ہے۔ فرانسیسی انقلاب (French Revolution) جمہوری دور کا آغاز ہے جس نے 1792 میں بادشاہی نظام کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد عالمی سیاست میں ایک نیا دور آیا، جس کے نتیجے میں یہ ممکن ہوگیا کہ الیکشن کے ذریعے پُرامن طور پر حکومت کی تبدیلی ممکن ہوگئی۔ اِس طرح تاریخ میں ریڈیکل تبدیلی کے بجائے، پرامن تبدیلی (peaceful change) کا دور آ گیا۔

موجودہ زمانے کے مسلمان اِس الٰہی منصوبے کو سمجھ نہ سکے۔ وہ خودساختہ ذہن کے تحت

یہ کررہے ہیں کہ کہیں وہ ناکام طور پر دوسری قوموں سے لڑ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ منفی روش قانونِ الٰہی کے خلاف ہے، اِس لیے اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ اِسی طرح کہیں ایسا ہے کہ مسلمان پچھلے سیاسی ماڈل کی گرفت سے آزاد نہ ہونے کی بنا پر خاندانی لیڈرشپ قائم کئے ہوئے ہیں۔ کہیں اگر ان کو کچھ سیاسی اقتدار مل گیا ہے تو وہاں وہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی صورت خدا کے منصوبے کے مطابق نہیں، اِس لیے وہ نتیجہ خیز بننے والی بھی نہیں۔

رول کی تبدیلی

اللہ نے انسان کی ہدایت کے لیے جو دین بھیجا، اُس کے دو تقاضے تھے — ایک تھا، اس کی حفاظت (preservation)، اور دوسرا تھا اس کا اظہار۔ دین کی حفاظت کا کام پہلے، بنی اسرائیل کو سونپا گیا، مگر وہ اس میں ناکام ہوگئے۔ اِس واقعہ کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا (62:5)

بنی اسرئیل کی ناکامی کے بعد بنو اسماعیل (امتِ محمدی) کو دینِ خداوندی کے حامل ہونے کی یہ ذمے داری سپرد کی گئی۔ امت محمدی نے اپنے آغاز کے بعد ہزار سال کی مدت میں دین کی حفاظت کا کام پوری طرح انجام دے دیا۔ اب خدا کا دین کامل طور پر محفوظ ہے۔ امت محمدی کو اس کے آغاز کے بعد لمبی مدت تک مددگار قوت کے طور پر سیاسی دبدبہ عطا کیا گیا۔ اس دبدبے کا خاص مقصد یہی تھا کہ دین کا متن (text) اور اس کی تاریخ مستند طور پر محفوظ ہوجائے۔

اِس کے بعد دوسرا کام جو مطلوب تھا، اس کو ایک لفظ میں اظہار کہا جاسکتا ہے۔ امت مسلمہ اِس دوسرے کام کو انجام نہ دے سکی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو غیر معمولی مواقع دئے گئے — تعداد، دولت اور سیاسی طاقت، وغیرہ۔

مگر امت مسلمہ اِس دوسرے مطلوب کام کو انجام دینے میں ناکام رہی۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں یہ واضح ہوگیا کہ امت مسلمہ اب اُسی طرح ایک بے جان قوم بن چکی ہے، جیسا کہ اِس سے پہلے بنی اسرائیل اپنے دورِ زوال میں ایک بے جان قوم بن چکے تھے۔

بے جان ہونے کا مفہوم

کسی امت کے بے جان ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دینِ خداوندی کو چھوڑ دے اور اعلان کے ساتھ کوئی دوسرا دین اختیار کرلے۔ اِس قسم کی تبدیلی نہ پہلے کبھی ہوئی اور نہ آج ہوگی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ 14 صدیاں گزرنے کے بعد امتِ مسلمہ پر وہ وقت آگیا جو پچھلی امتوں پر آیا تھا، یعنی مسلمان عملاً ایک بے جان قوم بن گئے۔ اب کوئی بھی اصلاحی جدوجہد ان کو مجموعی طور پر دوبارہ زندہ کرنے والی نہیں۔ اب جو چیز ہونے والی ہے، وہ صرف یہ کہ امت کے کچھ افراد کو شخصی طور پر زندگی ملتی رہے گی، نہ کہ پورے مجموعے کو۔

اِس صورتِ حال کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ دھیرے دھیرے امت کی بعد کی نسلوں میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ لوگ اسلام کے نام پر ایک خود ساختہ اسلام (self-styled version of Islam) بنا لیتے ہیں۔

اِس خود ساختہ اسلام میں اسپرٹ حذف ہوجاتی ہے اور صرف کچھ ظاہری شکلیں باقی رہتی ہیں۔ پھر لمبی مدت تک اُس پر قائم رہتے ہوئے وہ اُس پر پختہ (conditioned) ہوجاتے ہیں۔ اِس پختگی (conditioning) کے ساتھ ہمیشہ ایک فرضی یقین (false conviction) جمع ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے وضع کردہ اسلام پر اِس طرح جینے لگتے ہیں، جیسے کہ وہ خدا اور رسول کے دین پر قائم ہیں۔ اِسی فرضی یقین کا نام بے جان ہونا یا زندگی سے محرومی ہے۔ جو لوگ اِس حالت پر پہنچ جائیں، وہ اِس صلاحیت سے محروم ہوجاتے ہیں کہ وہ دوبارہ اپنی روش پر نظر ثانی کرسکیں۔

کنڈیشننگ کی حالت

یہی وہ حالت ہے جس کا ذکر یہود کے حوالے سے قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: **وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ** (2:88) یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں کے اوپر غلاف ہے۔ نہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کردی ہے، اِس لیے وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں ’غُلف‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔عبداللہ بن عباس نے اس کی تشریح اِن الفاظ میں کی ہے: أي قلوبنا ممتلئة علما، لا تحتاج إلى علم محمد ولا غيره (القرطبی 2/25) یعنی ہمارے دل علم سے بھرے ہوئے ہیں، وہ محمد یا کسی اور کے علم کے محتاج نہیں۔لعنت کوئی پراسرار چیز نہیں ،لعنت سے مراد شدید قسم کی کنڈیشننگ ہے جس کی ڈی کنڈیشننگ عام طور پر ممکن نہیں ہوتی۔ یہاں ’’علم‘‘ سے مراد معروف معنوں میں علم نہیں، بلکہ خودساختہ تصورِ دین ہے۔

یہود کا یہ خودساختہ دین اپنی حقیقت کے اعتبار سے،علم پر مبنی نہیں تھا، بلکہ وہ امانی (2:78) پر مبنی تھا۔ٹھیک یہی حال موجودہ زمانے میں مسلم ملت کا ہوا ہے۔ وہ دین کے خودساختہ ماڈل پر قائم ہیں۔ زمانہ گزرنے کے بعد وہ اپنے اِس خودساختہ ماڈل پر اتنے پختہ ہو چکے ہیں کہ اب وہ اُس پر نظرثانی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

پچھلی امتوں کے بارے میں قرآن میں یہ آیت آئی ہے: الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) یعنی انھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا اور وہ بہت سے گروہ ہو گئے۔ ہر گروہ اپنے خودساختہ طریقے پر نازاں ہے۔

یہی حال موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا ہوا ہے۔ وہ خودساختہ تعبیرات کے مطابق ،مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ یہ تمام گروہ خودساختہ تصورِ دین پر قائم ہیں۔لیکن لمبی مدت گزرنے کے بعد اب ہر گروہ کا ذہن اپنے ماڈل کے حق میں اتنا زیادہ پختہ ہو چکا ہے کہ اب وہ اِس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ وہ اُس پر نظرثانی کرے۔

امت مسلمہ اوراس کے بعد

امتِ مسلمہ کے حال اور مستقبل کو سمجھنے کے لیے قرآن کے سورہ الانبیاء کی اِن آیات کا مطالعہ کیجیے: وَحَرٰمٌ عَلٰي قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○ حَتّٰٓي اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (21:95-96) یعنی جس بستی والوں کے لیے ہم نے ہلاکت مقرر کردی ہے،اُن کے لیے حرام ہے کہ وہ رجوع کریں، یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دئے

جائیں گے اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے۔

یہ قرآن کی دو آیتیں ہیں۔ دوسری آیت میں واضح طور پر مستقبل میں پیش آنے والے ایک واقعے کا ذکر ہے، یعنی یاجوج اور ماجوج کا ظہور۔ پہلی آیت میں اگرچہ استقبال کا صیغہ استعمال نہیں ہوا ہے، لیکن اِس سے مراد بھی مستقبل میں پیش آنے والا واقعہ ہے، یعنی یاجوج اور ماجوج کے ظہور سے فوراً پہلے کا واقعہ۔

اصل یہ ہے کہ پہلی آیت میں قرآن کے مخصوص اسلوب میں، امتِ مسلمہ کے مستقبل کا ذکر ہے۔ اِس آیت میں دفع کا وہی قانون بیان کیا گیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یہاں حرام سے مراد امت کا 'غلف' کی حالت تک پہنچ جانا ہے، یعنی دورِ زوال کی حالت۔ اور اہلاک سے مراد یہ ہے کہ جب امت پر یہ حالت آئے گی تو اُس کو خدائی رول کے لیے رد کر دیا جائے گا۔

یہ فطرت کا ایک عام قانون ہے جو امتِ مسلمہ پر بھی لازما آئے گا (لتتبعن سنن من کان قبلکم)، لیکن ایک فرق کے ساتھ، وہ یہ کہ امت یہود کو نظری اور عملی دونوں اعتبار سے رد کیا گیا تھا، لیکن امتِ مسلمہ کا رد کیا جانا صرف نظری اعتبار سے ہوگا، اِس کے بعد بھی عملی طور پر موجودہ دنیا میں اُن کی حیثیت باقی رہے گی، کیوں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی اور نبی آنے والا نہیں جو دونوں اعتبار سے امتِ مسلمہ کے رد کیے جانے کا اعلان کر سکے۔

قرآن کی مذکورہ آیات میں صرف پہلی آیت امتِ مسلمہ کے بعد کے دور کے بارے میں ہے۔ جب کہ قانونِ فطرت کے مطابق، امت اپنے زوال کی آخری حد پر پہنچ چکی ہوگی۔ اِس آیت میں ہلاکت سے مراد معروف ہلاکت نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد وہی چیز ہے جس کو ذہنی جمود (intellectual stagnation) کہا جاتا ہے۔ آیت میں حرام سے مراد بھی معروف حرام نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد جمود کی وہ حالت ہے، جب کہ لوگوں کے اندر بے حسی کا وہ درجہ آجائے جس کو قرآن میں قساوت کہا گیا ہے، یعنی قبولیت (receptivity) کے مادے کا ختم ہو جانا۔

اِس معاملے کی مثال فطرت میں پتھر اور زرخیز زمین (soil) کی صورت میں رکھ دی گئی ہے۔

پتھر پر پانی ڈالا جائے تو پتھر اس کو قبول نہیں کرے گا- پانی اس کے اوپر سے بہہ جائے گا- اس کے برعکس، زرخیز مٹی میں پانی ڈالا جائے تو وہ اس کو بھرپور طور پر قبول کرلیتی ہے- اِسی طرح جب کوئی قوم زندہ ہوتو اس کے اندر قبولیت کی صلاحیت بھرپور طور پر موجود ہوتی ہے- اِس کے برعکس، جب قوم میں جمود آجائے تو وہ قبولیت کی صلاحیت سے محروم ہوجاتی ہے-

کسی امت کی یہ حالت کیوں ہوتی ہے- اس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ ہے فرضی یقین (false conviction)- دورزوال میں یہ ہوتا ہے کہ امت حقیقتاً بے روح (spiritless) ہوجاتی ہے، لیکن ظاہری طور پر وہ ایک خودساختہ دین (self-styled version of religion) پر قائم رہتی ہے- دھیرے دھیرے وہ اپنے اسی خودساختہ دین پر اتنی پختہ ہوجاتی ہے کہ اس کے خلاف سوچنا اس کے لئے ناممکن ہوجاتا ہے- اس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ حقیقی دین اس کے لیے اجنبی (غریب) بن جاتا ہے، خواہ اس کو کتنا ہی دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہو- اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی امت کے اندر کوئی نیا فکری انقلاب (intellectual revolution) لانا ناممکن ہوجاتا ہے- اِس مرحلے پر پہنچ کر وہ تخلیقی فکر (creative thinking) سے محروم ہوجاتی ہے- یہی وہ حقیقت ہے جس کو مذکورہ آیت میں 'أنهم لا يرجعون' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے-

اہلِ مغرب کا رول

صحیح البخاری میں ایک روایت اِن الفاظ میں آئی ہے: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (رقم الحديث: 3062) یعنی اللہ ضرور اِس دین کی تائید فاجر شخص کے ذریعے کرے گا-

اِس حدیث میں 'فاجر' کا لفظ غیر مومن کے معنی میں آیا ہے- آج کل کی زبان میں اس کو سیکولر انسان کہہ سکتے ہیں- اِس روایت میں پیشین گوئی کی زبان میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ بعد کے زمانے میں ایسے سیکولر لوگوں کو اٹھائے گا جو خدا کے دین کے معاملے میں تائیدی کردار (supporting role) ادا کریں گے-

تاریخی اعتبار سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تائیدی رول بالفعل عمل میں آچکا ہے- اب

ضرورت صرف یہ ہے کہ اس کی معرفت حاصل کی جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

دو مطلوب رول

اصل یہ ہے کہ دین اسلام کے حاملین سے دو رول مطلوب تھا — ایک رول وہ ہے جس کو قرآن میں حفاظتِ دین (15:9) کہا گیا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جس کے لیے قرآن میں اظہارِ دین (48:28) کے الفاظ آئے ہیں۔

حفاظتِ دین سے مراد ہے دین کا قلمی یا کتابی تحفظ — قرآن کے اصل متن کا مکتوب حالت میں محفوظ ہو جانا، حدیث کا مدوّن مجموعہ تیار ہو جانا، سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہ کا لکھی ہوئی حالت میں ریکارڈ ہو جانا، اسلام کا وہ دور جس کو قرون مشہود لہا بالخیر کہا گیا ہے، اس کو مستند تاریخ کی حیثیت دے دینا، اسلام کی بنیاد پر ایسے ادارے (مسجد، مدرسہ، حج کا نظام، وغیرہ) قائم ہو جانا جن کے ذریعے ابدی طور پر اسلام کو ایک اجتماعی بنیاد حاصل ہو جائے۔

یہ تمام کام ایک لفظ میں، تحفظِ دین کے کام ہیں۔ امتِ مسلمہ نے اپنے ابتدائی تقریباً ہزار سال کے دوران اِس کام کو کامل طور پر اور مستند طور پر انجام دے دیا۔ یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ اسلام کا مستند ماخذ نہ صرف لائبریریوں میں موجود ہے، بلکہ پورا ذخیرہ انٹرنیٹ پر اِس طرح محفوظ ہوگیا ہے کہ ایک شخص فنگر ٹپ (fingertip) کے استعمال سے ایک لمحے میں اِس پورے ذخیرے تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

تائید دین کے چار اہم کام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث اِن الفاظ میں آئی ہے: مثل أمتي مثل المطر، لایُدری أوّله خیر، أم آخره (سنن الترمذي، رقم الحدیث: 2869) یعنی میری امت کی مثال بارش جیسی ہے، نہیں معلوم کہ اس کا اول زیادہ بہتر ہے یا اس کا آخر زیادہ بہتر ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، بارش کا اول اور آخر دونوں اپنے اپنے لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ اِس حدیث میں امت کے دو دور کا ذکر ہے — ابتدائی دور اور آخری دور، ایک پہلو سے امت کا ابتدائی دور

بہتر ہے اور دوسرے پہلو سے اس کا آخری دور بہتر ہے۔

اِس حدیثِ رسول میں دراصل امت کے بارے میں ایک پیشین گوئی کی گئی ہے جو کہ اب واقعہ بن چکی ہے۔ امت کے پہلے دور میں ایک طرف، دین کو محفوظ دین کی حیثیت دی گئی ہے اور دوسری طرف، اِس دور میں ایک ایسا انقلاب برپا ہوا جس نے انسانی تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کردیا۔ اِس تاریخی پراسس کا آغاز امتِ مسلمہ نے کیا تھا، لیکن بعد کے زمانے میں یہ رول مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہوگیا۔ اِس عمل (process) کے تکمیلی مرحلے میں جو چیزیں مطلوب تھیں، وہ زیادہ تر اہلِ مغرب کے ذریعے انجام پائیں۔

اِس تاریخی عمل کا آغاز ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں امتِ مسلمہ کے ذریعے ہوا۔ اِس کے بعد اہلِ مغرب نے اِس معاملے میں تائیدی رول (supporting role) انجام دیا، جس کی تکمیل انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں ہوئی۔

چار پہلو

1۔ اِس معاملے میں اہلِ مغرب کے ذریعے جو کام انجام پایا، اس کے چار خاص پہلو ہیں اور اِن چاروں پہلوؤں کا اشارہ قرآن میں موجود ہے۔ اِن میں سے ایک کام وہ ہے جس کا ذکر بطور پیشین گوئی قرآن کی اِس آیت میں کیا گیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) یعنی عنقریب ہم اُن کو آفاق میں اور انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ اُن پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں جس پیشین گوئی کا ذکر ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ اِس دنیا میں معرفت اور ایمانی رزق کے بے شمار آئٹم ہیں، جن کو قرآن میں آیات اور آلاء اللہ اور کلمات اللہ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس قسم کی چیزوں کا ذکر قرآن اور حدیث میں ابتدائی طور پر موجود ہے، لیکن ان کی تفصیلات کو جاننا سائنٹفک مطالعے پر موقوف تھا جس کو قرآن میں زمین وآسمان پر تفکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سائنسی مطالعے کے اِس کام کا آغاز امتِ مسلمہ کے افراد نے کیا تھا، لیکن اس کی تکمیل

تمام تر اہلِ مغرب کے ذریعے انجام پائی۔ یہی وہ کام ہے جس کو موجودہ زمانے میں، ماڈرن سائنس (modern science) کہا جاتا ہے۔ ماڈرن سائنس کا نظریاتی حصہ پورا کا پورا قرآن کی اِس آیت کی تفصیل ہے۔ قدیم زمانے میں آیات اللہ کا علم صرف عینی مشاہدے کے ذریعے ممکن ہوتا تھا، اہلِ مغرب نے اس کو وسیع کرکے دوربینی مشاہدہ اور خوردبینی مشاہدے تک پہنچا دیا۔

موجودہ زمانے کی نظریاتی سائنس نے فطرت (nature) کے بارے میں جو حقیقتیں دریافت کی ہیں، اُن کے ذریعے سے پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ انسان تخلیق میں خالق کو دریافت کرسکے، وہ معرفتِ حق کے اُن اعلیٰ درجات تک پہنچ سکے جو قدیم روایتی دور میں انسان کے لیے ممکن نہ تھا۔

2۔ اِس معاملے میں اہلِ مغرب کی دوسری دین یہ ہے کہ انھوں نے شکر خداوندی کے نئے بے شمار آئٹم دریافت کیے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ انعامات کو شعوری طور پر جانے اور اُن کے لیے منعم کا اعتراف کرے۔ اِسی اعتراف کا مذہبی نام شکر ہے۔ شکر کی حیثیت دین کے اہم ترین مطلوب کی ہے، لیکن اعلیٰ شکر، انعامات کی اعلیٰ معرفت ہی سے ہوسکتا ہے، اور یہ وہ کام ہے جو تاریخ میں پہلی بار اہلِ مغرب کے ذریعے انجام پایا۔

اِس سلسلے میں قرآن کی ایک متعلق آیت یہ ہے: وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (14: 34) یعنی خدا نے تم کو وہ سب کچھ دے دیا جو تم نے اُس سے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم گن نہیں سکتے ۔ یقیناً انسان بہت ظالم اور بہت ناشکر گزار ہے۔

خالق نے انسان کو اس کی ضرورت کی تمام چیزیں بطور عطیہ دے دی ہیں ۔ یہ عطیات سب کے سب خدائی انعامات ہیں ۔ اِن عطیات کی واقفیت سے اللہ کے لیے بے پناہ شکر پیدا ہوتا ہے۔ یہ عطیات یا نعمتیں بے شمار ہیں، مگر قدیم زمانے میں انسان اِن میں سے بہت کم عطیات کو جانتا تھا۔ ایسی حالت میں وہ بڑا شکر نہیں کرسکتا تھا۔ جدید مغربی سائنس نے فطرت میں چھپے ہوئے بے شمار نئے عطیات کو دریافت کیا اور جدید صنعت اور ٹکنالوجی کے ذریعے اس کو عام انسان کے لیے

قابلِ حصول بنا دیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو اہلِ مغرب کے ذریعے پہلی بار انجام پایا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ انسان اپنے رب کے لیے زیادہ بڑا شکرادا کرسکے — اہلِ مغرب کا یہ عطیہ بلاشبہہ تائیدِ دین کی ایک اعلیٰ مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

3۔ اِس سلسلے میں اہلِ مغرب کی تیسری دین وہ ہے جس کو عالمی مواصلات کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ اس نے اپنا پیغام جو پیغمبروں کے ذریعے بھیجا ہے، وہ تمام اہلِ عالم تک پہنچے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا (25:1) یعنی بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا، تاکہ وہ تمام عالم کے لیے آگاہ کرنے والا ہو۔

یہی بات حدیث میں پیشین گوئی کی زبان میں اِس طرح آئی ہے: لایبقی علی ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله كلمة الإسلام (مسند أحمد، رقم الحديث: 24215) یعنی زمین کی سطح پر کوئی گھر یا خیمہ نہیں بچے گا، مگر اللہ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کردے گا۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو یہ مطلوب تھا کہ اُس نے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت نامہ بھیجا ہے، وہ دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچے۔ مگر قدیم زمانے میں یہ عالمی پیغام رسانی ممکن نہ تھی۔ قدیم زمانے میں دعوت الی اللہ کا کام عملاً صرف مقامی طور پر ہوا، وہ عالمی طور پر انجام نہ پاسکا۔ موجودہ زمانے میں پہلی بار وہ ذرائع اور وسائل وجود میں آئے ہیں جن کو استعمال کرکے کرہ ارض کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں اللہ کا پیغام پہنچ جائے، زمین پر بسنے والا کوئی بھی انسان اُس سے بے خبر نہ رہے۔

یہ ذرائع اور وسائل خالق نے فطرت (nature) کے اندر بڑے پیمانے پر رکھ دئے تھے، مگر قدیم زمانے میں اِن ذرائع اور وسائل کو دریافت کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ اہلِ مغرب نے پہلی بار ان کو دریافت کیا اور ان کو صنعتی مصنوعات (industrial products) کی صورت دے کر داعیوں اور مبلغوں کے لیے قابلِ حصول بنا دیا۔

4۔ قدیم زمانے میں اقوام کی تنظیم (international organisation) کا تصور نہ تھا۔

قدیم زمانے میں صرف سیاسی تنظیم (political organisation) کا تصور تھا، جو کسی بڑی سلطنت کے تحت بذریعہ طاقت قائم ہوتا تھا۔ اِس تصور کے تحت قدیم زمانے میں وہ نظریہ وضع ہوا جس کو جنگ برائے امن (war for peace) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ اقتدار کے باہر اصول کی بنیاد پر قوموں کی تنظیم قائم کی جائے جو بین اقوامی معاملات میں اقتدار کے استعمال کے بغیر پرامن طور پر فیصلہ کن رول ادا کرسکے۔

قدیم زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ امن صرف سیاسی اقتدار کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ اِس تصور کا نتیجہ یہ تھا کہ قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک ساری دنیا میں جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ طریقہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف تھا۔ خدا کے تخلیقی منصوبے کا تقاضا ہے کہ قوموں کے درمیان پرامن تعلقات ہوں، تاکہ دعوت اور تعلیم جیسا تعمیری کام کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے۔ اِس لیے اسلام میں یہ مطلوب تھا کہ بین اقوامی امن کو سیاسی اقتدار سے الگ کردیا جائے۔ بین اقوامی امن کو معاہدات کی بنیاد پر قائم کیا جائے، نہ کہ سیاسی اقتدار کی بنیاد پر۔

پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے زمانے میں جو انقلاب آیا، اُس کا ایک پہلو یہ بھی تھا۔ اُس زمانے میں پہلی بار ایسا ہوا کہ معاہدات کی بنیاد پر بین الاقوامی امن کا قیام عمل میں آیا۔ یہ معاہدہ حدیبیہ تھا جو 628 عیسوی میں تشکیل پایا۔ اِس معاہدہ امن میں براہِ راست طور پر اہلِ مدینہ اور اہلِ مکہ شامل تھے، لیکن بالواسطہ طور پر یہود بھی اس میں شامل تھے جو کہ اُس وقت مدینہ کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ تھے۔ تاریخ کا یہ پہلا بین الاقوامی معاہدہ امن تھا جو اِس لیے کیا گیا کہ قومی تعلقات کو جنگ کے بجائے امن کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔

معاہدہ حدیبیہ صرف ایک واحد واقعہ نہ تھا، وہ تاریخ میں ایک نئے دورِ امن کا آغاز تھا۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نیا عمل شروع ہوا، جو سفر کرتے ہوئے یورپ تک پہنچا۔ چناں چہ 1920 میں جنیوا (سوئزرلینڈ) میں ایک بین اقوامی ادارہ قائم کیا گیا جس کا نام جمعیتِ اقوام (League of Nations) تھا۔ اِس جمعیت میں کُل 63 قومیں شامل تھیں، البتہ امریکا اس میں شامل نہ تھا۔ یہ تنظیم مستقل ثابت نہ

ہوسکی، یہاں تک کہ 1946 میں باقاعدہ طور پر اس کے خاتمے کا اعلان کردیا گیا۔

اِس کے بعد اِس مقصد کے لیے 1945 میں نئ اور زیادہ بڑی تنظیم قائم ہوئی۔ اس کا نام تنظیم اقوامِ متحدہ (United Nations Organisation) تھا۔ اِس دوسری تنظیم میں 193 ممالک شامل ہیں۔ اس کا صدر دفتر نیویارک (امریکا) میں ہے۔ یہ ایک غیر سیاسی تنظیم ہے۔ وہ امن کے میدان میں زیادہ موثر رول ادا کررہی ہے۔

یہ واقعہ بھی انھیں واقعات میں سے ہے جس کا ذکر ''تائیدِ دین'' کے طور پر کیا گیا ہے، اِس واقعے کو دوسرے الفاظ میں، دورِ شمشیر کو ختم کر کے عملا دورِ امن کو لانا کہا جا سکتا ہے۔ بین اقوامی تعلقات میں یہ تبدیلی عین اسلام کے حق میں ہے۔ یہ واقعہ اُس تاریخی عمل (historical process) کا نقطہ انتہا ہے جس کا آغاز ساتویں صدی کے ربع اول میں معاہدہ حدیبیہ کے ذریعے کیا گیا تھا۔

قدیم زمانے میں جنگ اور امن کا کوئی متفقہ اصول نہ تھا۔ جو لوگ سیاسی اقتدار پر قابض ہوتے تھے، وہی جنگ اور امن کا فیصلہ کرتے تھے۔ قوموں کے درمیان معاہداتی تنظیم کے مذکورہ طریقے نے اِس صورتِ حال کو ختم کر دیا۔ اب یہ ممکن ہوگیا کہ باہمی مسائل کا فیصلہ بین اقوامی گفت وشنید (international negotiation) کے ذریعے طے کیا جائے اور باہمی اختلافات کے باوجود عالمی امن کو برقرار رکھا جائے۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ ہر حال میں تعمیری سرگرمیاں کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہیں۔

جو لوگ چیزوں کو معیار کے پیمانہ (ideal yardstick) سے ناپتے ہیں، وہ اِن اداروں پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ پہلے وہ جمعیت اقوام کے ناقد تھے، اب وہ اقوامِ متحدہ کے ناقد بنے ہوئے ہیں، مگر یہ صرف بے دانشی کی بات ہے۔ یہ لوگ معیاری امن (ideal peace) کی باتیں کرتے ہیں، مگر اِس دنیا میں معیاری امن کا حصول سرے سے ممکن ہی نہیں۔

اِس دنیا میں کوئی چیز صرف خدا کے تخلیقی منصوبے کے تحت ہی حاصل کی جاسکتی ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے تحت اِس دنیا میں صرف قابلِ عمل امن (workable peace)

کا حصول ممکن ہے، اور بلا شبہہ اقوام متحدہ نے قابلِ عمل امن کے حصول کو ممکن بنا دیا ہے۔

خدا کے منصوبے کے مطابق، اِس دنیا میں انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ اِس آزادی کو منسوخ کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس دنیا میں کوئی چیز معیاری درجے میں نہیں، بلکہ صرف قابلِ عمل (workable) درجے میں حاصل ہوتی ہے، خواہ وہ امن اور عدل ہو یا اور کوئی چیز۔

قرآن کی سورہ الانفال میں رسول اور اصحابِ رسول کو ایک حکم اِن الفاظ میں دیا گیا تھا: وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (8:39) یعنی تم اُن سے قتال کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب، اللہ کے لیے ہو جائے۔

اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ قرآن کے مخصوص اسلوب میں یہی بات ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اِس حکم کا مطلب یہ ہے کہ — اپنی ساری طاقت استعمال کرکے تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کرو جس کے نتیجے میں ایسا ہو کہ دنیا میں جنگ کی حالت نہ رہے اور امن کی حالت قائم ہو جائے۔ قرآن کی یہ آیت ایک دور کو ختم کرنے اور دوسرے دور کا آغاز کرنے کے معنی میں ہے، نہ کہ کسی وقتی کارروائی کے معنی میں۔

استبدالِ قوم کا قانون

قرآن میں ایک خدائی قانون کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (47:38) یعنی اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمھاری جگہ دوسری قوم کو لے کر آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

قرآن کی اِس آیت میں جس استبدال (replacement) کا ذکر ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو سے اس کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر عمومی طور پر زوال اور فساد آ جائے تو اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہوگا کہ یہ صورتِ حال بدلے اور ایسے اہلِ ایمان پیدا ہوں جو صحیح معنوں میں دینِ خداوندی پر قائم ہوں۔ لیکن اِس استبدال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بگڑی ہوئی امت اگر ایک بلین کی تعداد میں ہے تو اس کی جگہ ایک بلین ہی کی تعداد میں دوسری صالح امت پیدا کر دی جائے۔

یہ استبدال ہمیشہ افراد کے اعتبار سے ہوتا ہے، نہ کہ مجموعی طور پر ایک پوری امت کے اعتبار سے۔

اِس استبدال کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا، یعنی اظہارِ دین کے اجزا کو دریافت کرنے میں اگر امتِ مسلمہ ناکام ہو جائے تو اللہ تعالی سیکولر طبقے میں سے ایسے مؤیدین کو اٹھائے گا جو اس کام کو انجام دیں اور معرفت اور شکر اور دعوت کے اعلی درجات تک پہنچنے کو ممکن بنا دیں۔

خلاصہ کلام

انسان کے بارے میں اللہ کا تخلیقی منصوبہ (creation plan) یہ ہے کہ انسان کو آزادی دے کر اس کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ خوددریافت کردہ معرفت (self-discovered realisation) پر کھڑا ہو اور کامل اختیار رکھتے ہوئے اللہ کے تخلیقی منصوبے کے تحت زندگی گزارے۔ جو لوگ اِس امتحان میں کامیاب ہوں، وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی ابدی جنتوں میں داخل کیے جائیں گے۔ اللہ نے نبیوں کو اِسی لیے بھیجا کہ وہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔ اِس رہنمائی کے مختلف مراحل ہیں، جو کہ قرآن وحدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم کا زمانہ تقریباً چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ حضرت ابراہیم کے زمانے تک جو پیغمبر آئے، وہ انفرادی سطح پر انسان کو رہنمائی دیتے رہے۔ حضرت ابراہیم کے بعد ایک نئی منصوبہ بندی کی گئی، یعنی ایک قوم وجود میں لانا اور تاریخ میں ایک انقلابی عمل (revolutionary process) جاری کرنا، جو بالآخر اللہ کے دین کے کامل اظہار تک پہنچ جائے۔

یہ نیا منصوبہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل سے شروع ہوا۔ اس کے بعد رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے اس کو طاقت ورتحریک (boost) ملی۔ اِس کے بعد امتِ مسلمہ کی حکومتوں کا دور آیا۔ اِس دورِ اقتدار میں خدا کا دین اصولی اور نظریاتی طور پر پوری طرح محفوظ ہو گیا۔ اِسی کے ساتھ تاریخ میں ایک نیا عمل جاری ہوا۔

اِس آخری دور میں اہلِ مغرب نے بالواسطہ طور پر تائید کا رول ادا کیا۔ انھوں نے فطرت کے قوانین کو دریافت کرکے اِس بات کو ممکن بنا دیا کہ خدا کے دین کو انسان کے مسلّمہ علمی معیار پر مدلل کیا جاسکے۔

عطیاتِ الٰہی کے چھپے ہوئے اجزا کو دریافت کر کے انھوں نے اس بات کو ممکن بنایا کہ انسان اعلیٰ عطیاتِ الٰہی کا تجربہ کرے اور اپنے رب کے لیے اعلیٰ شکر کا رسپانس دے سکے۔ اِس طرح اہلِ مغرب نے یہ کیا کہ انھوں نے فطرت کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو دریافت کر کے جدید مواصلات تک دست رس حاصل کی۔ اِس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ اللہ کے پیغام کو عالمی سطح پر ہر عورت اور مرد تک پہنچایا جا سکے۔ اِسی طرح اہلِ مغرب نے انسانی تاریخ کو دورِ سیاست سے نکال کر دورِ تنظیم (age of organization) تک پہنچایا۔ اِس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ سیاسی طاقت کے بغیر آزادانہ طور پر تمام دینی تقاضے انجام دئے جا سکیں۔

جہاں تک حفاظتِ دین کا تعلق ہے، اس کو تمام تر امتِ مسلمہ نے انجام دیا۔ اظہارِ دین کے کام کا آغاز بھی امتِ مسلمہ کے ذریعے ہوا، لیکن کامل اظہار کے لیے جو وسائل درکار تھے، وہ قدیم زمانے میں موجود نہ تھے۔ اِس میدان میں بھی امتِ مسلمہ نے ابتدائی کام کیا، لیکن اس کو اتمام تک پہنچانا باقی تھا۔ اظہارِ دین کا یہ تکمیلی مرحلہ اہلِ مغرب کی جدید دریافتوں کے ذریعے انجام پایا۔ تاہم اس معاملے میں اہلِ مغرب کا حصہ تائید باعتبارِ وسائل ہے، تاہم تائید کا یہ واقعہ اتفاقاً پیش نہیں آیا، بلکہ وہ اُس تاریخی عمل (historical process) کا نقطہ انتہا (culmination) تھا جو امتِ مسلمہ کے ذریعے ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا۔

قرآن کا تصورِ تاریخ — ایک جائزہ

انسائکلو پیڈیا برٹینکا میں حسب ذیل عنوان کے تحت ایک مقالہ چھپا ہے:
(Historiography and Historical Methodology) اِس مقالے میں ایک ذیلی عنوان (Muslim Historiography) قائم کیا گیا ہے۔ اِس کے تحت مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ — محمد نے اسلام کو ایک ایسے مذہب کی حیثیت سے پیش کیا جس میں تاریخ کا طاقت ور تصور موجود تھا۔ اسلام کی مقدس کتاب قرآن انتباہات سے بھرا ہوا ہے جو کہ تاریخ کے اسباق سے ماخوذ ہے:

> Muhammad made Islam a religion with a strong sense of history. The Quran, Islam's holy book, is full of warnings derived from the lessons of history. (EB. 8/959, 1974)

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس سے قرآن کا تصورِ تاریخ معلوم ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں شاہی خاندان (dynasty) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھی جاتی تھی۔ عبدالرحمن ابن خلدون (وفات: 1406) کے بعد ایک نیا دور آیا، جب کہ نیشن (nation) کو یونٹ بنا کر تاریخ لکھی جانے لگی۔ اس کے بعد آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے بارہ جلدوں میں ایک کتاب (*A Study of History*) لکھی۔ اِس میں تہذیب (civilization) کو یونٹ بنا کر پوری انسانی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

قرآن کا تصورِ تاریخ اِن سب سے مختلف ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا تصورِ تاریخ خدائی منصوبہ (divine plan) پر مبنی ہے، یعنی خدا کے تخلیقی پلان کی روشنی میں انسانی تاریخ کا جائزہ لینا۔ زیر نظر مقالے میں اِس قرآنی تصور کے مطابق، تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اِس جائزے کے لیے بنیادی طور پر 9 ذیلی عنوانات مقرر کئے گئے ہیں — خلافتِ آدم، اعلان و اِسرار، ذبح عظیم، احسن القصص، مقامِ محمود، آیتِ اسرا، اظہارِ دین، لوحِ محفوظ، ادخالِ کلمہ۔

جنتی افراد، جنتی معاشرہ

قرآن کی ایک آیت یہ ہے: **وما خلقتُ الجن والإنس إلا ليعبدون** (51: 56) یعنی

میں نے جن اور انس کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ صحابی مفسر عبداللہ بن عباس نے اِس آیت میں 'لیعبدون' کی تشریح 'لیعرفون' سے کی ہے، یعنی جنات اور انسان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کی معرفت (realization) حاصل کریں۔

معرفت کا تعلق فرد سے ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فرد ہی کا ذہن ہے جو اِس موضوع پر غور وفکر کرتا ہے اور پھر اس کا ذہن اُس فکری واقعے کا تجربہ کرتا ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خالق کے منصوبے کے مطابق، تخلیق کا نشانہ یہ ہے کہ ایسے افراد پیدا ہوں جو عارف باللہ کا درجہ رکھتے ہوں۔ اِس کے مطابق، تخلیق کا نشانہ افراد ہیں، نہ کہ کوئی مجموعہ یا نظام۔

تخلیق کا نشانہ وہی چیز ہوسکتی ہے جو فی الواقع قابلِ حصول ہو۔ اِس پہلو سے انسانی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر دور میں بلا شبہہ ایسے افراد پیدا ہوئے جو عارف باللہ (realized person) کی حیثیت رکھتے تھے۔ اِس کے برعکس، اگر مقصدِ تخلیق کو اجتماعی معنوں میں لیا جائے، مثلاً صالح معاشرہ بنانا، عادلانہ نظام کی تشکیل، عالمی سطح پر حکومتِ الٰہیہ کا قیام، زندگی کے تمام شعبوں میں شرعی قوانین کا نفاذ، وغیرہ۔ اِس طرح کے اجتماعی انقلاب کو برپا کرنا اگر تخلیق کا نشانہ ہو، تو وہ پوری تاریخ بشری میں کبھی معیاری معنوں میں وقوع میں نہیں آیا، نہ انبیا کے زمانے میں اور نہ انبیا کے زمانے کے بعد۔

آدم کی تخلیق سے لے کر اب تک انسانی تاریخ پر بہت لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔ اِس پوری مدت میں، انبیا یا پیروانِ انبیا کے ذریعے مسلسل طور پر یہ کام ہوتا رہا کہ تخلیق کا منصوبہ پورا ہو۔ یہ لوگ اللہ کے نمائندے تھے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کی ضرور مدد کرتا ہے، نہ صرف آخرت میں بلکہ موجودہ دنیا میں بھی (40: 51)۔ اِس طرح کی قرآنی آیات کی روشنی میں ہم کو یہ ماننا ہوگا کہ انبیا اور اُن کے پیروؤں کا مشن یقینی طور پر کامیاب ہوا۔

یہ ایک مسلّمہ واقعہ ہے کہ اِن حضرات کی کوششیں پورے انسانی مجموعہ یا نظام کی سطح پر کبھی معیاری معنوں میں کامیاب نہیں ہوئیں، البتہ افراد کی سطح پر وہ ہمیشہ کامیاب ہوئیں۔ ہر زمانے میں اور

ہر کوشش کے ذریعے ایسے افراد وجود میں آئے جو پورے معنوں میں عارف باللہ تھے، جنھوں نے اپنی ذات کے اعتبار سے اللہ کو اپنا کنسرن بنایا، جو اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے تھے اور جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے بھی۔

اِس تاریخی تجربے کا تقاضا ہے کہ خالق کے منصوبۂ تخلیق کی کامیابی کا معیار پورے مجموعۂ انسانیت (mankind) کو قرار نہ دیا جائے، بلکہ اس کی کامیابی کا معیار افراد کو قرار دیا جائے۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو خالق کا منصوبہ تخلیق آخری حد تک کامیاب نظر آئے گا۔ آدم سے قبل جنات پیدا کئے گئے تھے (15: 27)۔ جنات کی بڑی اکثریت اگر چہ سرکش بن گئی، لیکن قرآن کے مطابق، اُن میں شخصی اعتبار سے اعلیٰ درجے کے صالح افراد بھی پیدا ہوئے (72: 11)۔ اِس طرح انبیا کے زمانے میں اگر چہ یہ ہوا کہ انبیا کے مخاطبین کی بڑی اکثریت منکر بنی رہی، لیکن انھیں کے درمیان یہ واقعہ بھی ہوا کہ شخصی اعتبار سے اعلیٰ درجے کے صالح افراد پیدا ہوتے رہے۔ اِسی طرح ختم نبوت کے بعد دُعاۃ (داعیوں) کی کوششوں کے ذریعے بھی یہ واقعہ پیش آیا کہ اگر چہ نظام یا مجموعہ انسانیت کی سطح پر کبھی کامل معنوں میں صالح انقلاب نہیں آیا، لیکن شخصی سطح پر ہر دور میں بلاشبہہ ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جو عارف باللہ کا درجہ رکھتے تھے۔

اسلام کے مطابق، انسانی زندگی کے دو دور ہیں، قیامت سے پہلے اور قیامت کے بعد۔ قیامت سے پہلے کا دور برائے امتحان ہے اور قیامت کے بعد کا دور برائے انجام۔ یہ دونوں دور خالقِ کائنات کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ دونوں دور یکساں طور پر پوری طرح کامیاب دور ہوں۔ یہ خالق کے منصوبۂ تخلیق کا کمتر اندازہ (underestimation) ہوگا کہ کامیابی کے اعتبار سے دونوں دوروں میں فرق کیا جائے۔ اس اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں دوروں کی بہترین توجیہہ یہ ہے کہ پہلے دور کو انتخابِ افراد کا دور (period of individual selection) قرار دیا جائے اور دوسرے دور کو اقامتِ سماج (establishment of society) کا دور کہا جائے، یعنی پہلے دور میں اس اعلیٰ سماج کے لئے مستحق افراد (deserving individuals) کا انتخاب اور

دوسرے دور میں پوری تاریخ کے ان مشترک افراد کو یکجا کر کے ان کی بنیاد پر ایک اعلیٰ معاشرہ (high society) بنانا۔ انسانی حیات کا یہی وہ دوسرا دور ہے جس کو قرآن میں جنت کہا گیا ہے۔

خلافتِ آدم

قرآن کے مطابق، انسانیت کا آغاز آدم اور حوا کی تخلیق سے ہوا۔ آدم پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ قرآن کے بیان کے مطابق، انسان کی پیدائش سے پہلے سیارۂ ارض پر ایک ناری مخلوق جنات کو بسایا گیا تھا (15: 27)۔ یہ غالباً اُس وقت کی بات ہے جب کہ زمین ابھی گرم حالت میں تھی۔ اِس کے بعد جب زمین ٹھنڈی ہوئی اور یہاں کے سمندروں میں پانی بھر گیا تو اس کے بعد اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے لیے خلافتِ ارضی کا فیصلہ کیا۔ اِس لحاظ سے انسان، خلیفۃ الجن ہے۔ روایات کے مطابق، جنات نے زمین پر فساد برپا کیا، اِس لیے زمین کا چارج جنات سے چھین لیا گیا اور اس کو انسان کے حوالے کیا گیا۔ اِسی معاملے کو قرآن میں ''خلافت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

موجودہ زمین پر انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے بسایا گیا ہے، لیکن یہ آزادی ایک مشروط آزادی ہے۔ اِس کے مطابق، موجودہ زمین انسان کے لیے ایک امتحان گاہ ہے، وہ انسان کے لیے عیش گاہ نہیں۔ اِس معاملے کی ایک عملی مثال ابلیس اور ملائکہ کی صورت میں قائم کردی گئی ہے۔ جو لوگ ملائکہ کی مانند خدا کے حکم کے آگے سرینڈر کردیں، وہ قیامت کی عدالت میں کامیاب قرار پائیں گے، اور جو لوگ ابلیس کی مانند خدا کے حکم کے آگے سرینڈر نہ کریں، وہ قیامت کی عدالت میں ناکام قرار دئے جائیں گے۔ انسان کا یہ امتحان خود انسان کی سطح پر ہے، جیسا کہ ابلیس اور ملائکہ کے معاملے میں پیش آیا۔ اِس معاملے سے انسان کو ہر زمانے اور ہر نسل میں باخبر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ یہ پیغمبر لوگوں کی اپنی زبان میں صراطِ مستقیم کی وضاحت کرتے رہے۔ یہ پیغمبر جو کچھ کہتے تھے، وہ اللہ کی وحی سے کہتے تھے۔ تمام پیغمبروں کا ایک ہی مشترک اصول تھا— نصح وخیر خواہی، یعنی اپنے مدعو کی یک طرفہ طور پر خیر خواہی، مدعو کی طرف سے پیش آنے والی کسی بھی زیادتی پر ردعمل کا طریقہ اختیار کیے بغیر مثبت انداز میں اپنا پیغام دیتے رہنا۔

خدا اور فرشتوں کا مکالمہ

آدم کی تخلیق کے وقت خدا اور فرشتوں کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ اِس سلسلے میں قرآن کی آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں ۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اُس میں فساد برپا کریں اور خون بہائیں، اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: میں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھائے آدمی کو سارے نام، پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے اُن لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک، تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے'' ۔(2: 30-32)

یہاں یہ سوال ہے کہ وہ کیا بات تھی جس پر فرشتوں کو اشکال پیدا ہوا، اور بعد کو کیا چیز اُن کے علم میں آئی جس کے بعد اُن کا اشکال دور ہو گیا۔ اصل یہ ہے کہ ابتدا میں فرشتوں نے آدمی کی نسل کو اس کے پورے مجموعۂ انسانیت کے اعتبار سے لیا۔ اُن کو نظر آیا کہ جس طرح اختیار پا کر جنات کا گروہ سرکش بن گیا، اس طرح اختیار پانے کے بعد انسانی نسل بھی مجموعی طور پر سرکش بن جائے گی۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرے کے ذریعے انسانی نسل کے منتخب افراد کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور آدم نے اِن منتخب افراد کا تعارف کرایا۔ اُس وقت فرشتوں کو اندازہ ہوا کہ اگر چہ مجموعہ کے اعتبار سے انسانی نسل میں فساد آجائے گا، لیکن عمومی فساد کے باوجود ہر زمانے میں ایسے افراد پیدا ہوں گے جو فساد سے خالی ہوں اور اصلاح کے راستے پر چلنے والے ہوں۔ نسلِ انسانی کے اِنھیں منتخب افراد کو قرآن میں انبیا اور صدیقین اور شہدا اور صالحین (4: 69) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِس مظاہرے کے بعد فرشتوں کو اللہ کے تخلیقی منصوبے کا علم ہوا۔ فرشتوں نے جانا کہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کا تعلق پورے مجموعۂ انسانیت کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ وہ اِس مجموعے کے استثنائی افراد سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جنت کی معیاری دنیا میں آباد کرنے کے لیے ایسے افراد درکار تھے جو مکمل آزادی کے باوجود اپنے آپ کو سرکشی سے بچائیں اور خدا کی زمین پر خدا کے مطیع بن کر رہیں۔

ایسے افراد صرف کھلی آزادی کے ماحول میں بن سکتے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے اس کو کامل آزادی کے ماحول میں بسایا اور پھر فرشتوں کو مقرر کیا کہ وہ اُن استثنائی افراد کا ریکارڈ تیار کریں جو دباؤ کے بغیر خدا کی معرفت حاصل کریں اور پھر اپنے آزادانہ فیصلے کے تحت اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کا پابند بنائیں۔ یہی استثنائی افراد اللہ کے مطلوب افراد ہیں۔ انھیں مطلوب افراد کا انتخاب کر کے اُن کو جنت کی معیاری دنیا میں بسایا جائے گا۔

اعلان واِسرار

حضرت آدم کے بعد ان کی نسل جس علاقے میں پھیلی، وہ غالباً وہی علاقہ تھا جس کو میسو پوٹامیا (Mesopotamia) کہا جاتا ہے، یعنی دجلہ اور فرات کے درمیان کا زرخیز علاقہ۔ حضرت آدم کے بعد کئی نسلوں تک وہ درست حالت پر قائم رہے۔ پھر ان کے درمیان بگاڑ آیا۔ ان میں شرک پھیل گیا، یعنی خالق کے بجائے مخلوق کی پرستش کرنا۔ اِس کے بعد ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ حضرت نوح نے وحی کے ذریعے ان کو خدا اور آخرت کا پیغام دیا۔ ان کی کوشش سے ان کی قوم کی ایک محدود تعداد اُن پر ایمان لائی، لیکن قوم کی بڑی اکثریت سرکشی پر قائم رہی۔ حضرت نوح نے اپنی دعا میں کہا تھا کہ — خدایا، میں نے اعلان کے ساتھ بھی کام کیا اور اسرار کے ساتھ بھی (71: 9)۔

اِس آیت میں اعلان سے مراد قوم سے اجتماعی خطاب ہے، اور اِسرار سے مراد انفرادی سطح پر اُن کو نصیحت کرنا ہے۔ حضرت نوح نے لمبی مدت تک دونوں طریقے سے اپنا دعوتی مشن جاری رکھا، مگر قوم کی سرکشی ختم نہ ہوسکی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا طوفان بھیجا جس میں چند لوگ زندہ بچے جو حضرت نوح کی کشتی پر سوار تھے، بقیہ پوری قوم طوفان میں غرق ہو کر ہلاک ہوگئی۔

کہا جاتا ہے کہ اِس طوفان کے بعد حضرت نوح کے تین بیٹے زندہ بچے جن کا نام حام، سام، یافث تھا۔ اِنھیں تین بیٹوں سے بعد کی انسانی نسل چلی اور پھر وہ دھیرے دھیرے پوری سطح ارض پر پھیل گئی۔ جب انسانی نسل زمین کے مختلف حصوں میں آباد ہوئی تو ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے انھیں میں سے کسی فرد کو

پیغمبر بنایا جس نے اپنی قوم کو خدائی صداقت کا پیغام دیا۔ مگر جو انجام ہوا، وہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ لوگوں نے اپنے پیغمبروں کا مذاق اڑایا اور ان کو ماننے سے انکار کر دیا (36: 30)۔

اِس عام گمراہی کا سبب لوگوں کی ظاہر پرستی تھی۔ لوگ مخلوقات کو دیکھتے تھے، مگر خالق ان کو نظر نہ آتا تھا۔ اِس بنا پر ایسا ہوا کہ مخلوقات میں سے جو چیز بظاہر بڑی دکھائی دی، اُسی کو انھوں نے اپنا معبود سمجھ لیا اور اس کو پوجنے لگے۔ مثلاً سورج اور چاند، وغیرہ۔ اِس عام گمراہی کی بنا پر ایسا ہوا کہ پیغمبروں کی یا پیغمبروں کے مشن کی کوئی تاریخ ریکارڈ نہ ہوسکی۔ انسان نے جب لکھنا پڑھنا سیکھا تو اس نے اپنی تاریخ بھی لکھی، مگر اِن تاریخوں میں بادشاہوں اور جنرلوں کے واقعات لکھے گئے، مگر پیغمبروں کو یا ان کے مشن کو ناقابلِ ذکر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک کسی بھی پیغمبر کا حوالہ مدوّن تاریخ (recorded history) میں موجود نہیں۔

تاہم موجودہ زمانے میں زمین کی کھدائی سے پیغمبروں کے دور کے کچھ آثار برآمد ہوئے ہیں جن کی بنیاد پر کچھ پیغمبروں کے حالات مورخین نے تحریر کئے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم انیسویں صدی عیسوی تک تاریخی شخصیت نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف اول (1922-1943) میں کھدائی (excavation) کے ذریعے عراق کا قدیم شہر اُر (Ur) دریافت ہوا جو کہ حضرت ابراہیم کا مقامِ عمل تھا۔ اِس کے بعد پیغمبر ابراہیم کو ایک تاریخی شخصیت کی حیثیت سے مان لیا گیا۔

ذبحِ عظیم

ہزاروں سال تک پیغمبروں کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ضرورت تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے خدائی مشن کی ایک تاریخ بنے۔ وہ انفرادی واقعات سے بڑھ کر ایک تہذیب (civilization) کی صورت اختیار کر لے۔ اِس مقصد کے لیے ضرورت تھی کہ بڑی تعداد میں ساتھی ملیں، جن سے ایک مضبوط ٹیم تیار ہو۔ یہ ٹیم جدوجہد کر کے صورتِ حال کو بدلے۔ وہ تاریخ میں ایک نیا دور لائے، جب کہ خدائی مشن ایک تہذیب کی صورت اختیار کر لے۔ اِس قسم کی مطلوب ٹیم بنانے کے لیے وہ واقعہ ہوا جس کو قرآن میں ذبحِ عظیم (37: 107) کہا گیا ہے۔

ہزاروں سال تک ایسا ہوا کہ پیغمبر آتے رہے، مگر بڑی تعداد میں قبولِ ایمان نہ کرنے کی وجہ سے کسی پیغمبر کے ساتھ کوئی ٹیم نہیں بنی۔ اِس کا سبب وہی چیز تھی جس کو ماحول کی کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ اِس کنڈیشننگ کا ذکر حدیث میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: كل مولود يولد على الفطرة، فأبواه يهودانه، أويمجسانه، أوينصرانه (صحيح البخاري، رقم الحديث: 1385)۔

اِس صورتِ حال کی بنا پر آبائی مذہب ایک سماجی رواج بن گیا تھا۔ اِس تسلسل کو توڑنے کے بعد ہی یہ ممکن تھا کہ ایک ایسی نئی نسل بنائی جائے جو اپنی فطری حالت پر قائم ہو اور پھر پیغمبر کی دعوت کو قبول کرکے وہ خدا پرست انسانوں کی ٹیم کا حصہ بن سکے۔

اِس مخصوص منصوبے کے تحت، حضرت ابراہیم نے یہ کیا کہ وہ اُس دور کے متمدن ملک عراق کو چھوڑ کر عرب کے صحرا میں آئے اور یہاں خالص صحرائی ماحول میں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو آباد کیا۔ صحرائی ماحول میں آباد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ متمدن دنیا سے منقطع ہو کر ایک نسل بنے جو متمدن ماحول کی کنڈیشننگ (conditioning) سے پاک ہو۔

یہی وہ خصوصی منصوبہ تھا جس کے تحت حضرت ابراہیم کو یہ خواب دکھایا گیا کہ آپ اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں (37: 102)۔ حضرت ابراہیم نے اِس معاملے کو اپنے بیٹے کے جسمانی ذبح کے ہم معنی سمجھا اور بیٹے کو لٹا کر اس کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ عین اُس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اسماعیل کے جسمانی ذبیحہ سے روک دیا۔ اُس وقت فرشتے نے کہا کہ آپ بیٹے کے بجائے ایک دنبہ ذبح کر دیں اور بیٹے کو لے جا کر صحرا میں اُس مقام پر بسا دیں، جہاں آج مکہ آباد ہے۔

اِس واقعے کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (37: 107)

یعنی ہم نے چھڑا لیا اسماعیل کو ایک بڑے ذبیحہ کے بدلے۔ یہاں بڑے ذبیحہ سے مراد صحرا کے غیر متمدن اور بے آب و گیاہ ماحول میں آباد ہونا تھا، جو کہ جسمانی ذبیحہ سے بلاشبہہ بہت زیادہ سخت تھا۔ اِس آیت میں ذبحِ عظیم (عظیم قربانی) کا لفظ اسماعیل کے لیے آیا ہے، نہ کہ دنبہ کے لیے۔ دنبہ کو حضرت ابراہیم نے بطور فدیہ ذبح کیا اور اسماعیل کو ایک عظیم تر قربانی کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہ عظیم تر قربانی کیا تھی، وہ یہ تھی کہ

اس کے بعد اسماعیل کو اپنی ماں ہاجرہ کے ساتھ مکہ کے صحرا میں آباد کر دیا گیا، تاکہ اُن کے ذریعے سے ایک نئی نسل تیار ہو۔ اُس وقت یہ علاقہ صرف ایک بے آب وگیاہ صحرا کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہاں اسباب حیات میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی، اِس لیے اِس معاملے کو قرآن میں ذبحِ عظیم کا درجہ دیا گیا۔

احسن القصص

قرآن کی سورہ یوسف میں پیغمبر یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اِس واقعے کو قرآن کا احسن القصص (12: 3) بتایا گیا ہے۔ احسن القصص کا لفظی مطلب ہے — بہترین قصہ (best story) مگر قرآن میں یہ بات قصہ برائے قصہ کے طور پر نہیں آئی ہے، بلکہ وہ ایک اہم سبق (lesson) کے طور پر آئی ہے۔ ہر پیغمبر کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ حق کا داعی ہوتا ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ دعوت کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔ مختلف پیغمبر مختلف حالات میں آئے۔ اِس لحاظ سے یہ ہوا کہ مختلف پیغمبروں کے ذریعے مختلف قسم کی عملی مثالیں قائم ہوئیں۔ اُنھیں میں سے ایک مثال یا ماڈل وہ ہے جو حضرت یوسف کے ذریعے قائم ہوا۔

حضرت یوسف کنعان (فلسطین) کے علاقے میں ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو مصر جیسے متمدن ملک کے دار السلطنت میں پہنچا دیا، جہاں ایک بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ ایسا غالباً اِس لیے ہوا کہ حضرت یوسف کے ذریعے دعوت کی جو مثال قائم کرنا مطلوب تھا، وہ مصر جیسے ملک ہی میں ممکن تھی۔ حضرت یوسف کے اِس واقعے کی تفصیل قرآن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ اُس وقت کے مصری بادشاہ نے حضرت یوسف کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں ایک اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی۔ اِس پیش کش کو حضرت یوسف نے قبول کر لیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہ بادشاہ اپنے مذہبی عقیدے کے اعتبار سے مشرک تھا۔ مزید یہ کہ سیاسی تخت بھی بدستور اُس کے قبضے میں تھا۔ اِس کے باوجود حضرت یوسف نے بادشاہ کے تحت ملنے والے اِس عہدے کو قبول کر لیا۔

قرآن کے مطابق، اِس کا سبب یہ تھا کہ خزائن ارض پوری طرح حضرت یوسف کو حاصل ہو رہے تھے۔ قدیم زمانے کے لحاظ سے، خزائن ارض کا مطلب تھا — سرزمین مصر کا زراعتی انتظام۔

اِس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک مطلوب پیغمبرانہ ماڈل ہے کہ داعی اگر ایسے ملک میں ہو، جہاں سیاسی اقتدار (political power) کسی اور کے ہاتھ میں ہو، لیکن یہ امکان ہو کہ اگر داعیٔ حق دوسرے کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کرلے تو اس کو کام کے مواقع بلا روک ٹوک حاصل ہوجائیں گے، تو اُس وقت حکمت کا تقاضا یہ ہوگا کہ ایسی پیش کش کو کھلے دل سے قبول کرلیا جائے۔

حضرت یوسف کے ساتھ یہ معاملہ اُس دور میں پیش آیا، جب کہ دنیا میں ہر جگہ زراعت کا دور (agricultural age) پایا جاتا تھا۔ کام کے مواقع تمام تر زراعت کے ساتھ وابستہ تھے۔ اُس وقت خزائنِ ارض کا مطلب تھا— خزائنِ زراعت۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب ہم جمہوریت کے دور میں ہیں۔ اب سیاست کا ڈی سنٹرلائزیشن (de-centralization) ہوچکا ہے۔ اب انتظام (administration) کے سوا تمام شعبے ہر ایک کے لیے آزادانہ طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں حضرت یوسف کا ماڈل موجودہ حالات میں مکمل طور پر قابلِ انطباق (applicable) ہے۔ آج اگر داعیٔ حق، سیاسی حکمرانوں سے ٹکراؤ نہ کرے تو کسی باضابطہ اعلان یا معاہدہ کے بغیر ہی تمام خزائن ارض، بہ الفاظ دیگر، تمام مواقع کار آزادانہ طور پر داعی کے زیر تصرف آجائیں گے۔ حضرت یوسف کے اِس ماڈل کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ حق کے داعی کو چاہئے کہ وہ سیاسی اقتدار کے معاملے میں غیر نزاعی طریقِ کار (non-confrontational approach) اختیار کرے۔ اِس حکمت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ خزائنِ ارض پوری طرح اس کے استعمال میں آجائیں گے اور وہ پُرامن رہنے کی شرط پر دعوت کا کام اعلیٰ ترین معیار پر انجام دے سکے گا۔

حضرت یوسف کے واقعے کو قرآن میں احسن القصص کہا گیا ہے۔ یہ محض ایک قصے کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ ایک بہترین ماڈل ہے جس کو ایک پیغمبر کے ذریعے قائم کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف کا قصہ قرآن کے علاوہ، بائبل میں بھی تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ بائبل میں بتایا گیا ہے کہ بادشاہِ مصر نے جب حضرت یوسف کو مصر کے خزائن پر مقرر کیا تو اس نے کہا:

Only in regard to the throne, I will be greater than you.
(Genesis 37: 50)

حضرت یوسف کی مثال کی روشنی میں اگر یہ متعین کیا جائے کہ اس کے مطابق، کام کا بہترین ماڈل کیا ہے، تو وہ ماڈل یہ ہوگا کہ بادشاہِ وقت سے سیاسی ٹکراؤ نہ کرو۔ اِس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کے لیے یہ ممکن ہوجائے گا کہ آپ غیر سیاسی دائرے میں موجود تمام مواقع کو آزادانہ طور پر حق کے مشن کے لیے استعمال کرسکیں گے۔ اِس ماڈل کا خلاصہ دولفظوں میں یہ ہے — سیاسی اقتدار کے معاملے میں موجودہ صورت حال کو تسلیم کرنا، اور سیاسی اقتدار کے باہر کے دائرے میں اپنے عمل کی تنظیم کرنا:

Political statusquoism, non-political activism.

مقامِ محمود

قرآن کی سورہ الاسرا میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا ہے: عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (17: 79) یعنی امید ہے کہ تمھارا رب تم کو مقامِ محمود پر کھڑا کرے۔ قرآن کی اِس آیت میں جس مقامِ محمود کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ اِس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو آخرت سے پہلے موجودہ دنیا میں پیش آنا ہے۔ مقامِ محمود کے اِس دوسرے پہلو کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو استثنائی طور پر خود انسانی تاریخ کے مطابق، ایک مسلَّم نبوت (acknowledged prophethood) کا درجہ حاصل ہوجائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو پیغمبر دنیا میں آئے، ہمارے عقیدے کے اعتبار سے، وہ بلاشبہہ خدا کے پیغمبر تھے۔ مگر قدیم زمانے میں موافق اسباب نہ ہونے کی وجہ سے پچھلے پیغمبر قدیم تاریخی ریکارڈ میں درج نہ ہوسکے۔ پیغمبر اسلام کے زمانے میں پہلی بار وہ اسباب پیدا ہوئے جب کہ آپ کو آزاد تاریخی ریکارڈ میں ایک معلوم اور مسلّم شخصیت کے اعتبار سے درج کیا گیا۔ اِس تاریخی حقیقت کو ایک مستشرق نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے — محمد تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے:

Muhammad was born within the full light of history.

محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب 570 میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ بنو اسماعیل کے ایک فرد تھے۔ پچھلے تقریباً ڈھائی ہزار سال کے دوران عرب کے ماحول میں بنو اسماعیل کے نام سے ایک پوری نسل

تیار ہو چکی تھی۔ جس کے افراد کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنیاد پر ایک مستشرق نے اس کو ہیروؤں کی نسل (a nation of heroes) کہا تھا۔ یہی وہ گروہ ہے جس میں دعوت وتربیت کا کام کرکے وہ جماعت تیار ہوئی جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ رسول اور اصحاب رسول نے غیر معمولی جدوجہد کے ذریعے یہ کیا کہ انھوں نے ایک نیا دور پیدا کردیا۔ اُن سے پہلے توحید کا عقیدہ صرف ایک نظریے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اصحاب رسول کی غیر معمولی کوششوں سے وہ انقلاب کے مرحلے میں داخل ہوگیا۔ شرک کا دور ختم ہوگیا اور توحید کا دور پوری طاقت کے ساتھ شروع ہوگیا۔

اِسی انقلاب کا نتیجہ تھا کہ تاریخ میں ایک نیا پراسس (process) شروع ہوگیا۔ اِس پراسس کا آغاز ساتویں صدی کے نصف اول میں عرب سے ہوا، اس کا اختتام (culmination) ایک ہزار سال کے بعد یورپ میں ہوا۔ اس انقلاب کے بہت سے پہلو تھے۔ مثلاً اِس انقلاب نے اسلام کے عقیدے کو سائنسی حقیقت (scientific reality) کے درجے تک پہنچا دیا۔ اس نے مذہبی آزادی کا دروازہ کھولا۔ اس کے بعد دعوت وتبلیغ کے راستے کی تمام رکاوٹیں ختم ہوگئیں۔ اس کے نتیجے میں جدید کمیونکیشن وجود میں آیا، جس کے بعد یہ ممکن ہوگیا کہ اسلام کے پیغام کو عالمی سطح پر پہنچایا جاسکے۔ آفاق وانفس میں سائنس کی دریافتوں سے یہ ممکن ہوگیا کہ اعلیٰ ترین علمی معیار پر حق کی تبیین کی جاسکے (4: 53)۔

آیتِ اسرا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور، یعنی ہجرت (622ء) سے ایک سال پہلے ایک واقعہ پیش آیا، جس کو قرآن میں اسرا کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (17: 1)۔ اِس آیت میں اسرا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسرا کا لفظی مطلب ہے — رات کا سفر (night journey)۔ اللہ تعالیٰ کے خصوصی انتظام کے تحت، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ رات کے ایک لمحے میں آپ نے مکہ سے یروشلم کا سفر کیا، اور پھر آپ اسی رات کو یروشلم (فلسطین) سے مکہ واپس آئے۔ اِس سفر کی مجموعی مسافت تقریباً 25 سوکلومیٹر تھی۔

اِس سفر کا مقصد قرآن میں اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: **لنریہ من اٰیاتنا** یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیاں پیغمبر کو دکھانا۔ یہ نشانیاں (آیات اللہ) کیا تھیں، وہ یروشلم کی عمارتیں یا وہاں کے درخت اور چشمے نہ تھے۔ وہ نشانی دراصل فطرت میں چھپا ہوا وہ امکان تھا جس کو تیز رفتار سفر اور تیز رفتار پیغام رسانی کہا جاتا ہے، یعنی آنے والا دورِ مواصلات (age of communication)۔ اِس تجربے کے ذریعے پیغمبر اسلام کو بتایا گیا کہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہوجائیں گے جن کی مدد سے عالمی سطح پر خدا کے آخری دین کی اشاعت ممکن ہوجائے، یعنی وہی واقعہ جس کو حدیث میں 'ادخال الکلمۃ في کل البیوت' (ہر گھر میں کلمۂ اسلام کا داخلہ) کہا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اسرا کے واقعے کی صورت میں جو تجربہ کرایا گیا، وہ مستقبل کے بارے میں ایک بشارت تھی۔ اِس بشارت کا ذکر احادیث میں مختلف الفاظ میں آیا ہے۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام نے فرمایا: ولیتمنّ اللہُ ہٰذا الأمر حتی یسیر الراکب من صنعاء إلی حضرموت، ما یخاف إلا اللہ (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 3852) یعنی اللہ ضرور اِس امر (دین) کو تکمیل تک پہنچائے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعا سے حضرت موت تک جائے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی اور کا خوف نہ ہوگا۔ اِس سلسلے میں ایک اور روایت ان الفاظ میں آئی ہے: لیبلغن ہٰذا الأمرُ ما بلغ اللیلُ والنہار (مسند احمد، رقم الحدیث: 17082) یعنی خدا کی قسم، یہ امر (دین) ضرور وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک رات اور دن پہنچتے ہیں۔ اِسی طرح ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں: لا یبقی علیٰ ظہر الأرض بیت مدر ولا وبر إلا أدخلہ اللہ کلمۃَ الإسلام (مسند احمد، رقم الحدیث: 24215) یعنی زمین کی پشت پر کوئی چھوٹا یا بڑا گھر نہیں بچے گا، جہاں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو داخل نہ کردے۔

قرآن کی سورہ الاسرا میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو تیز رفتار کمیونکیشن کا تجربہ کرایا گیا تھا۔ مذکورہ احادیث میں پیشین گوئی کے انداز میں بتایا گیا ہے کہ یہ امکان ضرور مستقبل میں واقعہ بنے گا اور خدا کا دین جو عرب میں شروع ہوا، وہ گلوبل کمیونکیشن کے ذریعے سارے عالم میں پہنچ جائے گا، یہاں تک کہ کوئی بھی انسان اُس سے بے خبر نہ رہے۔

اظہارِ دین

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد 'اظہارِ دین' تھا۔ اظہارِ دین کی آیت قرآن میں تین بار آئی ہے (9: 33; 48: 28; 61: 9)۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ التوبہ کے الفاظ یہ ہیں: هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33) یعنی اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، تاکہ وہ اس کو سارے دین پر غالب کردے۔ اِس آیت کی تفسیر کے تحت مفسر القرطبی نے لکھا ہے کہ — اظہارِ دین کا مطلب ہے حجت اور دلائل کے ذریعے دین کو غالب کرنا (أي بالحجة والبراہین، 8/121)۔

اظہارِ دین کے جس واقعے کا قرآن میں ذکر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خود زمانۂ رسول میں وہ پوری طرح واقع ہوجائے گا۔ اِس آیت میں ایک تاریخی تبدیلی کا ذکر ہے، اور تاریخ میں کوئی بڑی تبدیلی اچانک یا محدود مدت میں نہیں آتی، ایسی تبدیلی ہمیشہ لمبی مدت کے پراسس (process) کے بعد آتی ہے۔ قرآن کی اِس آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اور اصحابِ رسول کی جدوجہد سے ساتویں صدی کے نصف اول میں ایک انقلابی عمل شروع ہوا۔ یہ عمل مختلف حالتوں سے گزرتا ہوا تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا اور پھر اس کے نقطۂ انتہا (culmination) کے طور پر وہ واقعہ اپنی کامل صورت میں پیش آیا جس کو قرآن میں '**لیظھرہ علی الدین کلّہ**' کے الفاظ میں بیان کیا گیا تھا۔

حجت یا برہان کیا ہے۔ یہ ایک دوطرفہ عمل ہے، یعنی ایک طرف حجت کو پیش کرنے والا ہوتا ہے اور دوسری طرف حجت کو سننے والا۔ اِس لیے حجت کو مخاطب کے ذہنی تقاضے کے مطابق ہونا چاہئے۔ علمی استدلال دراصل اِس بات کا نام ہے کہ مخاطب کے علمی مسلّمہ پر اپنی بات کو ثابت کیا جائے۔ ساتویں صدی کے نصف اول میں جب کہ قرآن اترا، اُس وقت دنیا روایتی دور سے گزر رہی تھی۔ اُس وقت صرف روایتی استدلال ہی ممکن تھا۔ مگر قرآن ایک ابدی کتاب کی حیثیت سے اتارا گیا ہے، اس لیے قرآن کے مذکورہ الفاظ میں یہ بات شامل ہے کہ نہ صرف روایتی دور میں، بلکہ بعد کو ظہور میں آنے والے

سائنسی معیار کے مطابق بھی قرآن مسلّمہ طور پر اپنی ایک ثابت شدہ کلام کی حیثیت کو برقرار رکھے گا۔

اِس مصلحت کا تقاضا تھا کہ انسانی علم کا ارتقا ایسے نہج پر ہو جو قرآن کی صداقت کو بعد کے دور میں بھی یکساں طور پر برقرار رکھے۔ یہی وہ مطلوب ہے جو بعد کے سائنسی دور میں حاصل ہوا۔ سائنس کی دریافتوں نے صرف یہ کیا کہ قرآن کے نظریات کو دوبارہ سائنس کے معیار پر ایک مسلّمہ معیار کی حیثیت دے دی۔ مستقبل میں پیش آنے والا یہی موافقِ قرآن واقعہ ہے جس کی پیشگی خبر ان الفاظ میں دی گئی تھی:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41: 53)۔

قرآن کی اِس آیت میں آفاق وانفس کی جن نشانیوں کا ذکر ہے، اُس سے مراد وہی چیز ہے جس کو جدید سائنس کی دریافتیں (scientific discoveries) کہا جاتا ہے۔ یہ دریافت دراصل فطرت میں قائم شدہ خدائی قانون کی دریافتیں ہیں۔ چوں کہ قرآن کو نازل کرنے والا جو خدا ہے، اُسی نے فطرت کے اِن قوانین کو بھی قائم کیا ہے، اِس لیے دونوں کے درمیان کامل مطابقت پائی جاتی ہے۔ اِس مطابقت نے حاملینِ قرآن کو موجودہ زمانے میں ایک یہ موقع دیا ہے کہ وہ قرآن کی صداقتوں کو سائنس کے مسلّمات کی روشنی میں ثابت شدہ بناسکیں۔

قرآن میں اظہارِ دین کے جس واقعے کا ذکر ہے، اُس سے مراد یہ نہیں ہے کہ خود زمانۂ نزول میں یہ واقعہ عملاً پیش آجائے گا، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعے جو انقلاب آئے گا، وہ انسانی تاریخ میں ایک نئے پراسس کو شروع کرے گا۔ یہ پراسس عرب میں شروع ہوا اور بتدریج ارتقا کرتا رہا، یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اِس تکمیل کے ذریعے نہ صرف واقعاتِ فطرت ظہور میں آئے جنھوں نے اسلامی عقائد کے اثبات کے لیے سائنسی بنیاد فراہم کی، بلکہ اِس کے ذریعے دوسرے وہ اجتماعی واقعات ظہور میں آئے جو اسلامی دعوت کے عین موافق تھے۔ مثلاً آزادی، جمہوریت اور مذہب کے اعتبار سے کھلا پن (openness)، وغیرہ۔

قرآن کی اِس آیت میں اظہار سے مراد سیاسی غلبہ نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد فکری غلبہ اور ایسے حالات کا پیدا ہونا ہے جس کے بعد قرآن کے مشن کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، ہر قسم کے مواقع

اس کے لیے قابلِ استعمال ہو جائیں — اکیسویں صدی عیسوی میں، قرآن کی یہ پیشین گوئی عملاً پوری طرح وقوع میں آچکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکیسویں صدی عیسوی اظہارِ دین کی صدی ہے۔ اسلامی انقلاب کے ذریعے جو تاریخی عمل ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا، وہ اکیسویں صدی میں اپنے آخری نقطۂ انتہا (culmination) تک پہنچ گیا ہے۔ اب اہلِ اسلام کا واحد فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام دوسری چیزوں کو ثانوی (secondary) بنائیں۔ وہ دعوت الی اللہ، بہ الفاظ دیگر دورِ جدید کی نسبت سے قرآنی تعلیمات کی اشاعتِ عام کریں، یہاں تک کہ ہر عورت اور ہر مرد اس سے باخبر ہو جائے۔

لوحِ محفوظ

قرآن کی سورہ البروج میں یہ آیت آئی ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ○ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (85:21-22) یعنی وہ ایک باعظمت قرآن ہے، لوح محفوظ میں۔ اِس آیت میں لوحِ محفوظ (well-guarded tablet) کا مطلب کیا ہے۔ اِس سلسلے میں کوئی مستند حدیث موجود نہیں۔ تاہم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ملاءِ اعلیٰ میں ایک محفوظ لوح ہے اور اِس لوح پر قرآن کا متن لکھا ہوا ہے۔ یہ بات اصولاً درست ہے، لیکن لوح سے مراد معروف لوح نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد ربانی لوح ہے۔

اصل یہ ہے کہ پورا عالمِ موجودات مکمل طور پر اللہ کے امر کے تحت ہے۔ شمس وقمر اور دوسرے ستاروں اور سیاروں کے بارے میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اُن کا ایک مقرر کورس ہے، اور وہ ادنیٰ انحراف کے بغیر اِس مقرر کورس پر چلتے ہیں (36: 38)۔ اِسی معاملے کو علمی طور پر اِس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ عالمِ مادی، فطرت کے قانون کی پابند ہے، اور عالمِ حیوانات اپنی جبلت (instinct) کی پابند۔

انسان کا معاملہ بظاہر مختلف ہے، کیوں کہ انسان کو اپنے قول وعمل کی آزادی دی گئی ہے۔ مگر اِس آزادی کے باوجود انسانی تاریخ پر اللہ نے اپنا کنٹرول قائم کر رکھا ہے۔ تاریخ پر اِسی کنٹرول کی ایک صورت وہ ہے جس کو قرآن کے حوالے سے اِس طرح بتایا گیا ہے کہ قرآن ایک لوح محفوظ میں ہے۔ لوحِ محفوظ کا معاملہ کوئی پر اسرار معاملہ نہیں ہے، مطالعہ کے ذریعے اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن سے پہلے اپنے نبیوں کے ذریعے بہت سی کتابیں بھیجیں جو انسان کے لیے

معتبر ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔مگر پچھلی کتابیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ساتویں صدی عیسوی میں جب اللہ کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب آخری پیغمبر بھیج دیا جائے تو اِس فیصلے کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ آخری پیغمبر کے ذریعے آئی ہوئی کتاب (قرآن) کی مستقل حفاظت کا انتظام کر دیا جائے — لوح محفوظ کے الفاظ میں قرآن کے اِسی مخصوص حفاظتی انتظام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اِس کی تدبیر یہ کی گئی کہ اولاً قرآن کا معیاری متن (standard version) علمِ الٰہی یا بہ الفاظِ دیگر، ملاءِاعلیٰ میں محفوظ کر دیا گیا اور پھر تاریخ کے لیے مقدر کر دیا گیا کہ وہ اِس معاملے میں اِسی رخ پر سفر کرے۔ چناں چہ عملاً یہی ہوا۔اولاً یہ ہوا کہ ساتویں صدی کے نصف اول میں قرآن کو حافظے سے کتابت کی صورت میں محفوظ کیا گیا۔ ہزاروں لوگوں نے نسل در نسل یہ کیا کہ قرآن کو نہ صرف یاد کر کے اپنے حافظے میں ریکارڈ کر لیا، بلکہ اِسی کے ساتھ وہ قرآن کے کتابت شدہ نسخے برابر تیار کرتے رہے۔ اِس طرح وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک مکتوب قرآن کو پہنچاتے رہے۔ یہی وہ معاملہ ہے جس کی طرف قرآن میں اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: علّم بالقلم۔تعلیم بالقلم کا یہ عمل اِس طرح مسلسل تقریباً ہزار سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ انسانوں کو یہ توفیق دی کہ وہ طباعت کے آلات ایجاد کریں۔اِس فن کے ارتقا میں بہت سے انسانوں نے کام کیا۔آخر کار جرمن گولڈسمتھ جوہانس گوٹن برگ (وفات: 1468) اِس میں کامیاب ہو گیا کہ وہ ایک قابلِ عمل طباعتی آلہ دریافت کرے۔ اِس دریافت کے بعد تاریخ میں ایک پرنٹنگ انقلاب (printing revolution) آیا جو تیزی سے ترقی کرتے ہوئے موجودہ اعلیٰ طباعتی مشین (printing press) تک پہنچا۔

لوح محفوظ کے الفاظ میں اِسی تاریخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔قرآن کا نزول 610 عیسوی میں شروع ہوا۔اس کی تکمیل تقریباً 23 سال میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق سے استثنائی طور پر یہ واقعہ پیش آیا کہ خدا کے نزدیک،قرآن کا جو معیاری متن(standard version) تھا، وہ ادنیٰ تغیر کے بغیر پہلے انسانی حافظے میں ریکارڈ ہوا، پھر ادنیٰ تغیر کے بغیر کتابت کے ذریعے اس کی جلدیں بنائی گئیں، پھر تاریخ میں ایک پراسس جاری ہوا جس کے نتیجے میں پرنٹنگ پریس کا دور آ گیا۔

پرنٹنگ پریس کے زمانے میں یہ ممکن ہوگیا کہ قرآن کا ایک نسخہ نہایت درست طور پر تیار کیا جائے اور پھر اس کی بلین اور بلین کا پیاں تیار کر لی جائیں۔ آج ہر گھر میں اور ہر مسجد میں اور ہر مدرسہ اور ہر لائبریری میں قرآن کے نہایت صحیح مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ اِس طرح خدا کی تقدیر اِس بات کی ضامن بن گئی کہ قرآن کسی بھی قسم کے تغیر اور تبدل کے بغیر ہر انسان کے لیے قابلِ دستیاب ہو جائے۔

ادخالِ کلمہ

سیکولر مبصرین عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا سفر اس کے پیغمبر کے جلد ہی بعد ٹوٹ گیا، بعد کی تاریخ میں اسلام کا تسلسل باقی نہ رہا۔ مگر یہ رائے صرف سرسری مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اسلام خدا کا دین ہے۔ اسلام کی تاریخ خدائی منصوبے کے تحت مسلسل سفر کر رہی ہے۔ غلط فہمی صرف اِس لیے ہوتی ہے کہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ تاریخ کا ہر سفر ناموافق حالات میں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا سفر انسانی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے جاری ہے، نہ کہ انسانی آزادی کو منسوخ کر کے۔ انسانی تاریخ میں اسلام کے سفر کے تین مرحلے ہیں:

Land expansion — consolidation — overseas expansion

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں اپنے مشن کا آغاز 610 عیسوی میں کیا۔ اِس کے بعد دینِ توحید کی ایک نئی تاریخ بنی۔ اِس تاریخ کا خلاصہ یہ تھا کہ — انسانی آزادی کو منسوخ کئے بغیر دینِ توحید کی تاریخ بنانا اور اس کو اس کی آخری تکمیل تک پہنچانا۔ اس تاریخ پر اب تقریباً ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں۔ یہ تاریخ مسلسل طور پر اپنی منزل کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اِس مدت کے دوران بظاہر جو اتار چڑھاؤ کے واقعات نظر آتے ہیں، وہ انسانی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے تاریخ کو مینیج کرنے کی مثالیں ہیں۔

قرآن کی سورہ الانعام میں بتایا گیا ہے کہ — یہ قرآن اِس لیے اتارا گیا ہے کہ تم اے پیغمبر، آگاہ کر دو اہلِ مکہ کو اور مکہ کے اطراف کے لوگوں کو (6: 92)۔ قرآن کی اِس آیت میں، مکہ اور اطرافِ مکہ سے مراد برّی حصۂ ارض ہے، جہاں تک اُس زمانے کے درمیان حق کا پہنچنا بہ آسانی ممکن تھا۔

زمین کے نقشہ پر نظر ڈالیں تو عرب کے ایک طرف بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) ہوگا، جس کے دوسری طرف یورپ کا براعظم واقع ہے۔ اِسی طرح اگر آپ عرب سے افریقہ کی طرف چلیں تو

اس کی آخری سرحد پر اٹلانٹک سمندر (Atlantic Ocean) ہوگا، جس کے دوسری طرف امریکا کا براعظم واقع ہے۔ اسی طرح اگر آپ عرب سے بحرِ ہند (Indian Ocean) کی طرف چلیں تو اس کے دوسری طرف آسٹریلیا کا براعظم دکھائی دے گا۔

عقبہ بن نافع (وفات: 683ء) ایک تابعی تھے۔ وہ عرب سے ایک دستہ لے کر نکلے اور افریقہ میں اسلام کی اشاعت کرتے ہوئے اس کے مغربی ساحل تک پہنچ گئے۔ یہاں تاحدِ نظر اٹلانٹک سمندر (Atlantic Ocean) پھیلا ہوا تھا۔ وہ اُس وقت گھوڑے پر سوار تھے۔ انھوں نے اپنا گھوڑا سمندر کے کنارے کھڑا کیا اور کہا: اللهم إني لو أعلم وراء هٰذا البحر بلداً لخُضتُه إليه، حتى لا يُعبد أحد دونك (خدایا، اگر میں جانتا کہ اِس سمندر کے اُس پار بھی کوئی ملک ہے تو میں سمندر میں گھس کر وہاں جاتا، یہاں تک کہ تیرے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے)۔

عقبہ بن نافع کا یہ واقعہ علامتی طور پر یہ بتاتا ہے کہ دورِ اول میں اسلام کی دعوتی توسیع زمین کے برّی حصے میں برابر ہوتی رہی، لیکن وہ سمندر پار کے ملکوں تک نہ پہنچ سکی، کیوں کہ سمندری سفر کے لیے اُس زمانے میں قابلِ اعتماد اسباب موجود نہ تھے۔ اِس کے بعد تاریخ میں ایک نیا عمل شروع ہوا۔ اِس کا ایک پہلو استحکام (consolidation) تھا۔ استحکام کے بغیر دعوتی توسیع عملاً غیر موثر ہوجاتی، حتی کہ قرآن کی حفاظت بھی ممکن نہ ہوتی۔ اِس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے عالمی حالات پیدا کئے کہ ایشیا اور افریقہ میں مسلمانوں کا سیاسی ایمپائر قائم ہوگیا۔ یہ مسلم ایمپائر اِس بات کا ضامن تھا کہ خدا کا آخری دین پوری طرح محفوظ ہوجائے اور اس کی اشاعت مسلسل جاری رہے۔

مذکورہ استحکام کے دور میں اس کے زیر اثر ایک اور تاریخی پراسس (historical process) شروع ہوا۔ اِس کا مقصد تھا فطرت (nature) میں چھپے ہوئے امکانات کو وقوع میں لانا۔ یہ عمل تدریج کے ساتھ تاریخ میں جاری رہا۔ اِس عمل کا آغاز ابتداءً مسلمانوں نے کیا۔ اس کے بعد یورپ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار وہ چیز وجود میں آگئی جس کو کمیونکیشن کا دور کہا جاتا ہے۔ اِس مواصلاتی انقلاب کے بعد یہ ممکن ہوگیا کہ اسلام کی توسیع زمین کے برّی حصے تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ

سمندر پار کے ملکوں تک بہ آسانی پہنچ جائے۔

اسلامی دعوت کی عالمی توسیع اول دن سے اسلام کا نشانہ تھی (25: 1)۔ مگر اسلام کی یہ عالمی توسیع، اسباب کی اِس دنیا میں ضروری وسائل کے بغیر ممکن نہ تھی۔ جدید مواصلاتی انقلاب نے اِس کو پوری طرح ممکن بنا دیا۔ مستقبل میں پیش آنے والا یہی واقعہ تھا جس کی خبر پیشگی طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں دے دی تھی: لا یبقى على ظهر الأرض بيت مدر ولا وبر إلا أدخله اللّٰه كلمة الإسلام (مسند احمد، رقم الحدیث: 24215) یعنی زمین کی پشت پر کوئی گھر یا خیمہ ایسا نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے۔

اسلام ایک دعوتی مشن ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام انسان جو اِس زمین پر پیدا ہوئے، اُن کو موت سے پہلے یہ بتا دیا جائے کہ خدا کا تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) ان کے بارے میں کیا ہے۔ انسان کی پوری تاریخ میں اس کو مسلسل طور پر جاری رہنا ہے۔ آغاز کے پہلے مرحلے میں اس کی توسیع زمین کے بری حصہ (ایشیا اور افریقہ) میں ہوتی رہی۔ اس کے بعد استحکام کے ساتھ ایسے مادی اسباب پیدا ہوئے جس کے تحت مواصلاتی ذرائع میں ایسا انقلاب آیا جس کے تحت یہ ممکن ہو گیا کہ اسلامی دعوت کی عالمی اشاعت کا کام کیا جا سکے۔ موجودہ زمانے میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا اور دوسرے ذرائع کی بنا پر اسلامی دعوت کے اِس عالمی نشانے کو پورا کرنا آخری حد تک ممکن ہو گیا ہے۔ اسی کے ساتھ موجودہ زمانے میں مذہبی آزادی (religious freedom) بھی مکمل طور پر حاصل ہو چکی ہے۔ اب امتِ محمدی سے وابستہ افراد کی یہ لازمی ذمے داری ہے کہ وہ اسلام کے دعوتی مشن کو اس کی آخری تکمیل تک پہنچائیں، یہاں تک کہ کرۂ ارض پر بسنے والا کوئی مرد یا عورت خدا کے اِس پیغام سے بے خبر نہ رہے۔

انسانی تاریخ کی تعبیر

(Interpretation of Human History)

تاریخ کیا ہے، تاریخ گزرے ہوئے ماضی کی سرگزشت کا دوسرا نام ہے۔ تاریخ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ عام طور پر گزرے ہوئے واقعات کا ریکارڈ ہوتی ہیں۔ لیکن تاریخ کا ایک ضمنی موضوع وہ ہے جس کو فلسفہ تاریخ (philosophy of history) یا تعبیر تاریخ (interpretation of history) کہا جاتا ہے۔ اِس موضوع کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے واقعات کی ایک ایسی توجیہہ تلاش کی جائے جس میں مختلف واقعات کے درمیان ایک قابلِ فہم ربط دریافت کیا جاسکے۔ تاریخ کے پہلے موضوع (تاریخ نگاری) پر بڑی تعداد میں کتابیں موجود ہیں، لیکن جہاں تک تعبیر تاریخ کے موضوع کا تعلق ہے، اس موضوع پر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جس کو تاریخ کی قابلِ فہم توجیہہ قرار دیا جاسکے۔

اِس کا سبب ڈاکٹر الکسس کیرل نے اپنی کتاب ''انسان نامعلوم'' (*Man the Unknown*) میں درست طور پر یہ بتایا ہے کہ تعبیر تاریخ کا موضوع براہِ راست طور پر انسان کی آزادی سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان قابلِ پیشین گوئی نہیں، اِس لیے اس کے عمل کی کوئی جامع توجیہہ بھی ممکن نہیں۔ ہر انسان آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے، اِس لیے انسانی تاریخ کی مجموعی تعبیر سخت مشکل کام ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی تاریخ دو متضاد تقاضوں کے درمیان سفر کرتی ہے۔ اِن دونوں تقاضوں کو آزادی اور جبر (freedom and determinism) کہا جاسکتا ہے۔ میرے علم کے مطابق، کوئی مورخ اِن دو متضاد تقاضوں کے درمیان ربط قائم کرنے کا کوئی اصول دریافت نہ کرسکا، اِس لیے وہ انسانی تاریخ کی کوئی کامیاب تعبیر بھی پیش نہ کرسکا۔

راقم الحروف نے اِس موضوع پر کافی غور وفکر کیا اور تعبیر تاریخ کا اصول دریافت کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار مجھے قرآن کی ایک آیت میں یہ اصول دریافت ہوا۔ وہ آیت یہ ہے: وَعَلَى اللّٰهِ

قَصۡدُ السَّبِيۡلِ وَمِنۡهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰٮكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ (16: 9) یعنی اللہ کے اوپر ہے (انسانیت کو) صراطِ مستقیم پر قائم رکھنا، اور کچھ راستے منحرف راستے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے منصوبۂ تخلیق (creation plan) کے مطابق، انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کو مینج (manage) کر رہا ہے۔ خدا، انسان کو آزادی بھی دئے ہوئے ہے اور اِسی کے ساتھ وہ اِس کی نگرانی بھی کر رہا ہے کہ انسانی قافلہ بھٹک کر صراطِ مستقیم سے بہت دور نہ چلا جائے۔ تاریخ کے بارے میں اِس خدائی اصول کو ایک لفظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ — انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کی تنظیم کرنا:

It is to manage history while maintaining human freedom.

تاریخ اور تعبیر تاریخ

تاریخ سادہ طور پر واقعہ نگاری (narration of events) کا نام ہے۔ تعبیر تاریخ (interpretation of history) کا تعلق فلسفۂ تاریخ سے ہے، یعنی اُن قوانین کو دریافت کرنا جو تاریخ کے عمل میں کام کر رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں، مگر یہ تمام نظریات محض انسانی قیاس پر مبنی ہیں۔ تاریخ کی صحیح تعبیر وہ ہے جو انسان کے بارے میں خالق کے نقشۂ تخلیق (creation plan) کے مطابق ہو۔

قدیم زمانے میں بادشاہ کو تاریخ کا مرکزی کردار سمجھا جاتا تھا۔ اِس لیے تاریخ عملاً بادشاہوں کی تاریخ بن گئی۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد دنیا میں جمہوریت کا دور آیا۔ اب تاریخ کا مرکزی کردار فرد کے بجائے سوسائٹی کو سمجھا جانے لگا۔ اب سماجی افکار کی روشنی میں تاریخ لکھی جانے لگی۔ اِس میں ایک نمایاں نام جرمن مفکر کارل مارکس (وفات: 1883) کا ہے۔ مارکس نے تاریخ کا ایک نیا تصور پیش کیا جس کو تاریخی مادیت کہا جاتا ہے۔ یہ تصورِ تاریخ بنیادی طور پر یہ تھا کہ انسان کا شعور تاریخ کی صورت گری نہیں کرتا، بلکہ مادی حالات تاریخ کی صورت گری کرتے ہیں:

The mode of production in material life determines the general character of the social, political, and spiritual process of human life.

تاریخ کا ایک تصور وہ ہے جو نیشن (nation) پر مبنی ہے۔ کسی نیشن کی مختلف سرگرمیوں کے ریکارڈ کو اس کی تاریخ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً انڈین نیشن کی تاریخ، جرمن نیشن کی تاریخ، وغیرہ۔

ایک اور تاریخی نظریہ وہ ہے جس کو برٹش مورخ آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے پیش کیا۔ اُس نے اِس موضوع پر ایک مکمل کتاب 12 جلدوں میں لکھی جس کا نام یہ ہے:

A Study of History

ٹائن بی نے تاریخ کا یہ تصور پیش کیا کہ تاریخ، تہذیب کے ارتقائی مراحل کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ تہذیبوں کے معمار ہی تاریخ کے معمار ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک زمانے میں رومی تہذیب نے تاریخ سازی کا رول ادا کیا۔ اِس کے بعد مسلم تہذیب، تاریخ ساز تہذیب کی حیثیت سے ابھری۔ اس کے بعد برٹش تہذیب کو تاریخ سازی کا یہ مقام ملا، وغیرہ۔

دوسرا تصورِ تاریخ وہ ہے جس کو مذہبی تاریخ کہا جاتا ہے۔ مذہبی تصور تاریخ کو علمی اعتبار سے، کوئی مستند درجہ نہیں ملا، حتی کہ موجودہ زمانے میں اس کو بالکل ناقابلِ حوالہ سمجھ لیا گیا۔ انسائکلو پیڈیا برٹینکا کے مقالہ نگار (Patrick Lancaster Gardinar) نے اپنے مقالہ فلسفۂ تاریخ (Philosophy of History) کے تحت لکھا ہے کہ — مذہبی اور مابعد الطبیعی قیاسات کی روشنی میں، انسانی تقدیر کے معاملات کی تعبیر کا دور، جدید مورخین کے نزدیک، اب ختم ہو چکا ہے:

> The age of religious and metaphysical conjectures concerning the destiny of human affairs had, in their opinion, come to a close (EB. 8/962, 1974)

یہ بات بلاشبہہ بے بنیاد ہے۔ یہ بات اُسی طرح غیر علمی ہے جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کا دور ختم ہو گیا (God is dead)، یا یہ کہ پیغمبر کی وحی صرف ایک شاعرانہ تجربہ (poetic experience) تھی، یا یہ کہ مذہب کی کوئی بنیاد نہیں، وہ صرف ایک سماجی ظاہرہ (social phenomenon) ہے، وغیرہ۔

خدا کا منصوبۂ تخلیق

اللہ نے ایک معیاری دنیا بنائی۔ یہ دنیا ہر اعتبار سے ایک پرفکٹ دنیا تھی۔ اللہ نے یہ مقدر کیا کہ اِس معیاری دنیا میں ایسے افراد بسائے جائیں جو ہر اعتبار سے معیاری انسان ہوں۔ اِس مقصد کے لیے اللہ نے انسان کو پیدا کرکے اس کو سیارہ ارض پر آباد کیا۔ اس نے انسان کو مکمل آزادی عطا کی۔ موجودہ دنیا اِس منصوبے کے لیے ایک سلیکشن گراؤنڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں یہ دیکھا جارہا ہے کہ کون شخص اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون شخص اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ تاریخ کے خاتمے پر یہ ہوگا کہ آزادی کا غلط استعمال کرنے والے افراد رد کردئے جائیں گے اور جن افراد نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا، اُن کو منتخب کرکے اُنھیں جنت میں آباد کردیا جائے گا۔ جنت کے تصور کو ملحد مفکرین انسانی تمناؤں کی خوب صورت نظریہ سازی (beautiful idealization of human wishes) کا نام دیتے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ جنت کے تصور کو انسانی تاریخ کی خوب صورت تعبیر (beautiful interpretation of human history) کہا جائے۔

یہ ایک پیچیدہ منصوبہ ہے۔ اِس کا ایک جُز یہ ہے کہ انسان کی آزادی پوری طرح برقرار رہے۔ اِس کا دوسرا جز یہ ہے کہ اللہ اس منصوبے کی تکمیل تک اپنے علم کے مطابق، اس کی تنظیم کرتا رہے۔ اِس طرح یہ دوطرفہ تقاضے کو مینیج کرنے کا ایک معاملہ ہے۔ تاریخ کی کوئی قابلِ فہم تعبیر صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ تاریخ کو اِس دوطرفہ تقاضے کی روشنی میں دیکھا جائے۔ تعبیر تاریخ کا یہی درست اصول ہے۔ اِس اصول کو نظر انداز کرنے کے بعد تاریخ کی تعبیر کسی بھی شخص کے لیے ممکن نہیں۔

انسانی تاریخ کی تعبیر کا کام انسان کرتا ہے، مگر انسان کا خالق خود انسان نہیں، انسان کا خالق اللہ ہے۔ اِس لیے تاریخ کی تعبیر کا رہنما اصول (guiding principle) صرف یہ ہوسکتا ہے کہ مورخ سب سے پہلے خالق کے منصوبۂ تخلیق (creation plan of the Creator) کو معلوم کرے۔ یہی اِس معاملے میں ماسٹر پرنسپل (master principle) ہے۔ اِس ماسٹر پرنسپل کو ذہن

میں رکھے بغیر کوئی شخص تاریخ کی درست تعبیر نہیں کرسکتا — زیر نظر مقالے میں اسی اصول کی روشنی میں تاریخ کی ایک قابلِ فہم تعبیر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مطلوب افراد کا انتخاب

خدا کے اِس تخلیقی منصوبہ کا ذکر قرآن کی سورہ البقرہ میں آیا ہے۔ اِن آیات کا ترجمہ یہ ہے:

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اُس میں فساد برپا کریں اور خون بہائیں، اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھا دئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے اِن لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے''۔ (2: 30-32)

فرشتوں کو یہ معلوم تھا کہ تمام موجودات مکمل طور پر خدا کے تابع فرمان ہیں، مگر انسان کو آزادی دے کر زمین پر بسایا جارہا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ہوگا کہ لوگ آزادی کا غلط استعمال کریں گے اور وہ زمین میں فساد اور خوں ریزی برپا کریں گے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرہ کے ذریعے فرشتوں کو بتایا کہ اگر چہ انسانوں کی بڑی تعداد آزادی کا غلط استعمال کرکے مفسد بن جائے گی، لیکن انھیں میں سے ایسے افراد بھی نکلیں گے جو صالح افراد ہوں گے۔ آدم نے فرشتوں کے سامنے انھیں صالح افراد کا تعارف کرایا اور پھر فرشتے مطمئن ہو گئے۔

اصل یہ ہے کہ فرشتے پورے انسانی مجموعے کو دیکھ کر اپنی رائے بنا رہے تھے۔ اللہ نے ایک مظاہرہ کے ذریعے واضح کیا کہ خدائی تخلیق کا نشانہ مجموعہ نہیں ہے، بلکہ افراد ہیں۔ مجموعے کی سطح پر اگر چہ بگاڑ آئے گا، لیکن افراد کی سطح پر ہمیشہ اچھے افراد وجود میں آتے رہیں گے۔ خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا ایک سلیکشن گراؤنڈ (selection ground) ہے، یعنی پورے مجموعے میں سے مطلوب افراد کا انتخاب کرنا۔ تخلیق کا نشانہ یہ نہیں ہے کہ انسان اِسی سیارۂ ارض پر معیاری نظام بنائے،

بلکہ تخلیق کا نشانہ یہ ہے کہ ہر دور اور ہر نسل میں سے اُن افراد کو منتخب کیا جائے جو کامل آزادی کے باوجود اپنے آپ کو بطور خود ضابطۂ خداوندی کا پابند بنالیں۔

تاریخ کے چند اوراق

خالق کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، انسانی تاریخ کے سفر کو چند بڑے ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادوار یا یہ تاریخی مراحل حسب ذیل ہیں:

1- پہلا دور نبیوں کے ذریعے اعلان کا دور ہے۔ یہ دور حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد تک پھیلا ہوا ہے۔ اِس دور میں بہت سے پیغمبر آئے، لیکن اُن کا مشن اعلان کے مرحلے تک محدود رہا، وہ انقلاب کے مرحلے تک نہیں پہنچا۔

2- دوسرا مرحلہ وہ ہے جو حضرت اسماعیل بن ابراہیم سے شروع ہوتا ہے۔ اِس مرحلے میں ایک ایسی امت تیار ہوئی جو خدا کی کتاب کی حامل امت بن سکے۔

3- حاملِ کتاب امت کے وجود میں آنے کے بعد جو اہم واقعہ ہوا، وہ یہ کہ قرآن خدا کی ہدایت کے مستند متن (authentic text) کی حیثیت سے محفوظ ہوگیا۔

4- اصحاب رسول کے ذریعے تاریخ میں جو نیا دور آیا، اُس کا ایک اہم جُز آزادیٔ رائے (freedom of thought) تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اِس کا آغاز ایک پراسس (process) کی شکل میں ہوا۔ ہزاروں سال بعد مغربی تہذیب کی صورت میں وہ اپنے کمال کو پہنچا۔

5- اس تاریخی عمل میں مغربی تہذیب کا ایک سپورٹنگ رول ہے۔ مغربی تہذیب کی حیثیت اِس تاریخی سفر میں ایک سیکولر مؤید (secular supporter) کی ہے۔

6 - دورِ جدید میں سائنس کی حیثیت اِس تاریخی سفر میں ایک مؤید عنصر (supportive element) کی ہے۔ جدید سائنس نے نیچر کی انفولڈنگ کر کے اُن خدائی نشانیوں کو کھولا جن کو قرآن میں آیات (signs) کہا گیا ہے (41: 53)۔

7- جدید دور کو ایج آف کمیونکیشن کہا جاتا ہے۔ یہ ایج دراصل موافقِ دعوت ایج ہے۔ گلوبل کمیونکیشن نے پہلی بار گلوبل دعوہ کو ممکن بنا دیا ہے۔

8- پچھلی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی بار دعوت الی اللہ کا ایک نیا امکان پیدا ہوا ہے۔ اس امکان کو جو لوگ استعمال کریں گے، اُن کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے (صحیح مسلم)۔ اخوانِ رسول کا لفظ فضیلت کو نہیں، بلکہ رول کو بتاتا ہے۔ اصحابِ رسول وہ لوگ تھے جنھوں نے ساتویں صدی میں اُس وقت کے امکانات کو استعمال کیا۔ اخوانِ رسول وہ لوگ ہوں گے جو اکیسویں صدی کے امکانات کو دعوت الی اللہ کے لیے استعمال کریں۔

مقصدِ تخلیق

فلاسفہ اور مفکرین کے یہاں زیر بحث سوالات میں سے ایک اہم سوال یہ ہے کہ تخلیق کی غایتِ اصلی (*raison d'être*) کیا ہے۔ سیکولر مفکرین نے اس کا جواب مختلف انداز سے دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے خالق خود اپنی تکمیل چاہتا ہے۔ قرآن میں اِس سوال کا جواب ایک آیت میں اِس طرح دیا گیا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (51:56) یعنی میں نے جن اور انس کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

صحابی مفسر عبد اللہ بن عباس نے اِس آیت کی تشریح اِس طرح کی ہے کہ اِس آیت میں **’لیعبدون‘** سے مراد **’لیعرفون‘** ہے، یعنی خدا کی عبادت کرنے سے مراد ہے خدا کی معرفت حاصل کرنا۔

خالق کی معرفت کوئی سادہ بات نہیں۔ انسان اپنے خالق کو براہِ راست نہیں دیکھ سکتا، لیکن تخلیق کا مطالعہ اور صاحبِ تخلیق کی کتاب (قرآن) کا مطالعہ کرکے آدمی یقینی طور پر خالق کی عظمتوں کو دریافت کرسکتا ہے۔ تخلیق کی اعلیٰ معنویت خالق کا اعلیٰ تعارف ہے۔ تخلیق کے مطالعے سے آدمی خالق کا جو علم حاصل کرتا ہے، اُسی کا نام معرفت ہے۔

کسی آدمی کو جب خالق کی یہ معرفت حاصل ہوتی ہے تو یہ اُس کے لیے سپر تھرل (super thrill) کا ایک تجربہ ہوتا ہے۔ یہ تجربہ آدمی کی شخصیت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کردیتا ہے۔ اِس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی سوچ خدا رخی سوچ بن جاتی ہے، آدمی کا کلام خدا رخی کلام بن جاتا ہے، آدمی کا سلوک خدا رخی سلوک بن جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، آدمی کی

پوری زندگی خدا کے رنگ میں رنگ جاتی ہے (2: 138)۔

یہی معرفت مزید وسعت پا کر دعوت الی اللہ بن جاتی ہے۔ دعوت الی اللہ کیا ہے۔ وہ آدمی کی معرفتِ خدا کی توسیع یا اس کا خارجی ظہور ہے۔ جو آدمی گہرائی کے ساتھ خدا کی معرفت حاصل کرے، اس کے اندر شدید طور پر یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اِس معرفت میں دوسروں کو حصے دار بنائے۔ اِسی واقعے کا دوسرا نام دعوت الی اللہ ہے۔

خدا کی معرفت ایک فرد کے اندر متحقق ہوتی ہے، نہ کہ کسی مجموعے کے اندر۔ جب ایک بڑی تعداد خدا کے عارفوں پر مشتمل ہو جائے تو اُس وقت پورے مجموعے یا اس کی بڑی تعداد معرفت کی حامل بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام اصلاً فرد پر مبنی کام ہے، نہ کہ مجموعے پر مبنی کام۔ دعوت الی اللہ کا نشانہ اصلاً کسی سسٹم یا کسی اجتماعی نظام کے وجود میں لانا نہیں ہے، بلکہ فرد فرد کو معرفتِ خداوندی کا حامل بنانا ہے۔ اِس کے بعد جو واقعات پیش آتے ہیں، وہ اصل نشانے کے بالواسطہ نتائج ہیں، نہ کہ اصل نشانہ۔

تاریخ کی بامعنی تعبیر

ایک بڑی انڈسٹری قائم کی جائے تو بظاہر اُس میں بہت سے اجزا اور بہت سی سرگرمیاں دکھائی دیں گی، لیکن انڈسٹری کا مقصودِ اصلی صرف ایک ہوگا، اور وہ ہے— کوئی خاص پروڈکٹ (product) نکالنا، یہی پروڈکٹ انڈسٹری کا حقیقی جُز ہوگا اور بقیہ تمام چیزیں انڈسٹری کے اضافی اجزا قرار پائیں گے۔ یہی وہ واحد اصول ہے جس پر انڈسٹری کی صحتِ کارکردگی کو جانچا جائے گا۔

یہی معاملہ انسانی تاریخ کا ہے۔ انسانی تاریخ کے بظاہر بہت سے اجزا ہیں۔ اس میں بظاہر بہت سی سرگرمیاں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن تاریخ کی توجیہہ کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ تاریخ کے معاملے میں خالق کا منصوبہ کیا ہے اور خالق کے منصوبے کے مطابق، اِس عظیم کارخانۂ تاریخ سے کون سا پروڈکٹ نکالنا مقصود ہے۔ اِس کے سوا، کوئی دوسرا نقطۂ نظر تاریخ کی درست توجیہہ میں کارآمد نہیں ہوسکتا۔

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی مختلف سرگرمیوں کے دوران خالق کو جو پروڈکٹ وجود میں لانا مقصود ہے، وہ صرف ایک ہے۔ اِس پروڈکٹ کو قرآن میں ربانی انسان (3: 79) کہا گیا ہے، یعنی ایک فرد کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر۔ یہی ربانی افراد خدا کے منصوبۂ تخلیق کی اصل غایت (raison d'être) ہیں۔ جب تک یہ ربانی افراد بنتے رہیں گے، اُس وقت تک تاریخ کے ہنگامے جاری رہیں گے، اور جب اِس قسم کے افراد پیدا ہونا بند ہو جائیں تو اِس کے بعد وہ وقت آجائے گا، جب کہ تاریخ کے موجودہ دور کو ختم کرکے اس کے دوسرے دور کا آغاز کردیا جائے۔

خالق کے منصوبے کے مطابق، انسانی تاریخ کو عادلانہ اجتماعی نظام (just social system) کی اصطلاح میں جانچنا درست نہیں۔ خالق کا منصوبہ یہ نہیں ہے کہ موجودہ دنیا میں عادلانہ نظام قائم ہو، بلکہ خالق کا منصوبہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا کی تجربہ گاہ میں عادل افراد پیدا ہوں اور پھر اِن عادل افراد کو منتخب کرکے اُنھیں یہ موقع دیا جائے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں ابدی طور پر رہ سکیں۔ تاریخ کی بامعنی تعبیر (meaningful interpretation of history) صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ مذکورہ اصول کی روشنی میں تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ کوئی دوسرا اصول، تاریخ کی معنویت (meaning) کو واضح کرنے کے لیے کارآمد نہیں۔

افراد، نہ کہ مجموعہ

تاریخ کی صحیح تعبیر صرف وہ ہے جو خالق کے تخلیقی پلان کی روشنی میں کی جائے۔ تعبیر تاریخ کے اِس موضوع پر، قرآن کو ایک مستند ماخذ کا درجہ حاصل ہے۔ قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ خدا کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق، تاریخ کی تعبیر کیا ہونا چاہیے۔ پچھلے ادوار میں ہزاروں مورخین پیدا ہوئے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اِن تمام مورخین کی تیار کردہ کتابیں صرف تاریخی واقعات کا دفتر (chronicles) ہیں، وہ انسانی تاریخ کی معنویت کو واضح نہیں کرتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ کتبِ تاریخ کی روشنی میں تاریخ صرف بے معنی واقعات کا ایک جنگل نظر آتی ہے۔ اِسی حقیقت کو انگریز مورخ ایڈورڈ گبن (وفات: 1794) نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے— انسانیت کی تاریخ، جرائم، حماقت اور

بدقسمتی کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے:

History, which is, indeed, little more than the register of crimes, follies and misfortunes of mankind.

تعبیر تاریخ کے اعتبار سے، سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تمام مورخین تاریخ کو مجموعہ کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور وہ مجموعہ کے اعتبار سے، اس کے حسن وقبح کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مگر خدائی تخلیق کے مطابق، تعبیر تاریخ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مجموعۂ انسانیت کو دیکھ کر تاریخ کی تعبیر نہ کی جائے، بلکہ افرادِ انسانی کو دیکھ کر اس کی تعبیر کی جائے۔ مجموعہ کے اعتبار سے دیکھنے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کا کوئی عہد عہدِ زریں (golden age) نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر افراد کے اعتبار سے، تاریخ کو دیکھا جائے تو ہر عہد، زریں افراد (golden individuals) کا عہد نظر آئے گا۔

معیاری افراد کا انتخاب

اصل یہ ہے کہ خالق نے موجودہ دنیا کو اِس لیے نہیں بنایا کہ یہاں مجموعہ کی سطح پر معیاری نظام (ideal system) قائم کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں ہر انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے، وہ چاہے مصلح بن کر رہے یا مفسد بن کر رہے۔ اِس لیے یہاں مجموعہ کی سطح پر کبھی معیاری نظام نہیں بن سکتا۔ معیاری نظام کا مقام صرف جنت ہے اور وہ جنت ہی میں بنے گا۔

موجودہ دنیا دراصل معیاری افراد کا انتخابی میدان (selection ground) ہے۔ یہاں ہر نسل سے معیاری افراد کا انتخاب کیا جارہا ہے۔ مثلاً آدم کی پہلی نسل میں قابیل، قابلِ رد تھا اور ہابیل، قابلِ قبول۔ یہی معاملہ پوری تاریخ میں جاری ہے۔ ہر دور میں اور ہر نسل میں خدا معیاری افراد کو منتخب کررہا ہے اور غیر معیاری افراد کو رد کررہا ہے۔ رد وقبول کے اِسی معاملے کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ○ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ (56: 39-40) یعنی اگلوں میں سے ایک بڑا گروہ اور پچھلوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ۔

قابلِ قبول اور قابلِ رد انسانوں کی یہ مطلوب فہرست جب مکمل ہوجائے گی تو اس کے بعد

خالق کائنات موجودہ دنیا کو ختم کرکے ایک اور دنیا بنائے گا، جہاں وہ معیاری دنیا ہوگی جس کو جنت کہا جاتا ہے۔ قابلِ قبول افراد اِس جنت میں بسا دئے جائیں گے، جہاں وہ ابد تک خوف وحزن سے پاک زندگی گزاریں گے۔ اورنا قابلِ قبول افراد کورد کرکے کائناتی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے گا، جہاں وہ ابد تک حسرت کی زندگی گزاریں گے۔

معیارِ تاریخ

یہی تاریخ کو دیکھنے کا صحیح معیار ہے۔ اِس معیار سے تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فساد کے جنگل میں ہمیشہ اعلیٰ درجے کے صالح افراد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اِسی جنگل میں آدم کے بیٹے ہابیل بھی تھے جنھوں نے اپنے قاتل سے کہا: لَئِنۡ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡکَ لِاَقۡتُلَکَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ (5: 28) یعنی اگر تم مجھ کو قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہان کا رب ہے۔ ہابیل کا یہ قول امن کا قول تھا۔ ہابیل نے اپنی اِس روش سے امن پسندی کی وہ اعلیٰ ترین مثال قائم کی جس کے آگے امن پسندی کا کوئی اور درجہ نہیں۔

اِسی طرح، تاریخ کے اِس جنگل میں ہاجرہ اُمّ اسماعیل جیسی خاتون پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ڈھائی ہزار سال پہلے، خدا کے منصوبے کے مطابق، ایک نئی نسل برپا کرنے کے لیے یہ قربانی دی کہ وہ اپنے چھوٹے بچے (اسماعیل) کو لے کر عرب کے صحرا میں آباد ہوگئیں۔ اُس وقت اُن کی زبان سے یہ تاریخی کلمہ نکلا کہ جب خدا کا یہی منصوبہ ہے تو خدا ہم کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا (إذن لا یضیّعنا اللہ)۔ ہاجرہ کی اِسی قربانی کے نتیجے میں بنو اسماعیل کی وہ نسل پیدا ہوئی جو اعلیٰ انسانی اوصاف کی حامل تھی۔ ایک مغربی اسکالر پروفیسر ڈی ایس مارگولیتھ (وفات: 1940) نے اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے بنو اسماعیل کی اِس نسل کو ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) قرار دیا تھا۔

اِسی طرح، تاریخ کے اِس جنگل میں ابوبکر اور عمر جیسے افراد پیدا ہوئے جن کو اقتدار ملا، لیکن انھوں نے اپنے آپ کو بگاڑ سے کامل طور پر بچایا۔ مہاتما گاندھی نے ابوبکر اور عمر کا اعتراف کرتے ہوئے

لکھا تھا کہ — اگر چہ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے، مگر انھوں نے فقیروں جیسی زندگی گزاری:

> Though, they were masters of vast empire, yet they lived the life of paupers. (*Harijan,* July 27, 1937)

انسان کو پیدا کرنے والا خدا ہے۔ خدا نے انسان کی فطرت میں جنت کا تصور ودیعت کر دیا ہے۔ اِسی لیے ہر عورت اور مرد جو پیدا ہوتے ہیں، وہ تمناؤں اور خواہشوں (desires) کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر فطری طور پر ایک تصوراتی دنیا بسی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے، انسان ایک طالبِ جنت مخلوق (paradise-seeking animal) ہے۔

اِسی فطرت کی بنا پر ایسا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا انسان اپنے لیے ایک معیاری دنیا کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔ ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی طاقت اور اپنے تمام وسائل کو ایک ایسی دنیا کے حصول میں لگا دیتا ہے، جو اس کے لیے خوشی اور سکون کی دنیا ہو، جہاں اس کو پورے معنوں میں فل فل مینٹ (fulfilment) مل سکے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر آدمی جو اِس دنیا میں آیا، وہ اپنی مطلوب دنیا کی تعمیر میں ناکام رہا، اور مایوسی کی نفسیات میں مر کر اِس دنیا سے چلا گیا۔ اِس عموم میں کسی بھی شخص کا کوئی استثنا نہیں۔ راقم الحروف نے ایک بار انٹرنیٹ کے ذریعے ایسے تقریباً 400 ممتاز افراد کے بارے میں یہ معلوم کیا کہ ان کے آخری ایام کیا تھے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ بلا استثنا اُن میں سے ہر شخص سخت مایوسی (despair) کی حالت میں مرا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو معیاری دنیا بسی ہوئی ہے، وہ جنت ہے۔ مگر جنت کو پانے کا مقام آخرت ہے، نہ کہ موجودہ دنیا۔ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، انسان کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جنت میں بسائے جانے کے قابل بنائے۔ مگر ساری تاریخ میں انسان نے یہ کیا کہ ہر ایک موجودہ دنیا ہی میں اپنی جنت کی تعمیر کرنے لگا۔ ایسا کرنا خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف تھا۔ اِس لیے ہر انسان صرف ناکامی کی ایک مثال بن کر رہ گیا۔ مفکرین اور مصلحین نے عام طور پر اپنا نشانہ یہ بنایا کہ وہ اِس دنیا میں انصاف اور انسانی اقدار (human values) کے اعتبار سے ایک معیاری دنیا بنائیں۔

مگر اُن کا نشانہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف تھا، اِس لیے وہ کبھی واقعہ نہ بن سکا۔ خدا کا تخلیقی نشانہ یہ نہیں ہے کہ موجودہ دنیا میں معیاری نظام (ideal system) وجود میں لایا جائے، بلکہ خدا کا تخلیقی نشانہ یہ ہے کہ معیاری افراد وجود میں آئیں۔ اِس قسم کے معیاری افراد تاریخ میں بکھرے ہوئے ہیں۔ آخرت میں یہ ہوگا کہ اِن افراد کو منتخب کرکے اُنھیں جنت کی معیاری دنیا میں بسا دیا جائے گا۔

تعبیر تاریخ کی مثالیں

تاریخ کی تعبیر (interpretation of history) ایک مستقل سبجکٹ ہے، مگر اِس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ سب کی سب کنفیوژن کا کیس ہیں۔ میرے علم کے مطابق، کوئی بھی شخص اِس موضوع پر اب تک ایسی کتاب نہ لکھ سکا جس میں انسانی تاریخ کی قابلِ فہم تعبیر پیش کی گئی ہو۔

اِس موضوع پر سب سے زیادہ نمایاں نام غالباً کارل مارکس (وفات: 1883) کا ہے۔ اس نے بطور خود تاریخ کی ایک متعین تعبیر دینے کی کوشش کی۔ مارکس کی اِس تعبیر تاریخ کو مادی تعبیر تاریخ (material interpretation of history) یا تاریخی مادیت (historical materialism) کہا جاتا ہے۔ کارل مارکس نے یہ کیا کہ اس نے نیوٹن کے دریافت کردہ قانون فطرت (law of nature) کو انسانی تاریخ پر منطبق کردیا، مگر مارکس کی یہ تعبیر تاریخ پہلی ہی نسل میں اہل علم کے درمیان قابلِ رد قرار پا گئی۔ انسان ایک صاحب اختیار مخلوق ہے۔ اِس کے برعکس، مادہ کوئی ذاتی اختیار نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں ایک کے قانون کو دوسرے کے اوپر چسپاں کرنا قیاس مع الفارق ہے، جو کہ عملاً ممکن نہیں۔

پہلی عالمی جنگ (1914-1918) کا واقعہ اس مارکسی نظریے کی عملی آزمائش تھا۔ یہ نظریہ اِس پہلی ہی آزمائش میں مکمل طور پر رد ہوگیا۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ مشہور کمیونسٹ لیڈر ولا دمیر لینن (وفات: 1924) نے 1919 میں کمیونسٹ انٹرنیشنل (comintern) قائم کی۔ اُس کا نظریہ تھا کہ ساری دنیا کے مزدور ایک طرف ہیں اور تمام دنیا کے سرمایہ دار ایک طرف۔ اس کے بعد 1939 میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ یہ جنگ جن ملکوں کے درمیان ہوئی، اُن ملکوں کے سربراہ مارکسی تصور کے مطابق، سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مارکسی تصور کے مطابق، یہ فرض کرلیا گیا کہ اِن ملکوں کے

مزدور اپنے ملکوں کی سرمایہ دار حکومتوں کا ساتھ نہیں دیں گے، بلکہ وہ عالمی مزدور طبقہ (class) کا ساتھ دیں گے، مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔ ہر ملک کے مزدوروں نے خود اپنے ملک کی حکومتوں کا ساتھ دیا۔ اِس طرح تاریخی مادیت یا جدلیاتی مادیت کا نظریہ اپنے پہلے ہی تجربے میں ختم ہو گیا۔

اِسی طرح کچھ اور اہل علم نے انسانی تاریخ کو ایک تعبیر دینے کی کوشش کی۔ مگر عملاً وہ بھی کنفیوژن کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اِس کی ایک مثال کیمبرج کے پروفیسر ایچ بٹرفیلڈ (H. Butterfield) کی ہے۔ انھوں نے اِس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جو 146 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب 1931 میں لندن سے چھپی ہے۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Whig Interpretation of History

اِس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ کسی یونی ورسل مارل کوڈ (universal moral code) کی روشنی میں پوری تاریخ کو ایک اخلاقی تعبیر دی جائے، مگر خود مصنف نے یہ اعتراف کیا ہے کہ تاریخ کی عملی تصویر کے مطابق، اِس قسم کی تعبیر ممکن نہیں۔

اِسی طرح ایک مثال مشہور برطانی رائٹر جارج برناڈ شا (وفات: 1950) کی ہے۔ اِس سلسلے میں اس کی ایک کتاب ''مین اینڈ سپر مین'' *(Man and Superman)* ہے۔ اِس کتاب میں اُس نے مفروضہ ارتقائی اصول کی روشنی میں تاریخ کی ایک تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان لازمی ارتقائی قانون کے مطابق، بشر (man) سے فوق البشر (superman) کی طرف سفر کر رہا ہے۔ مگر اس کا یہ نظریہ صرف ایک خیالی کہانی ہے۔ خالص علمی اعتبار سے اس کا کوئی وزن نہیں۔

منفی تصورِ تاریخ

انسانی تاریخ کے بارے میں عام طور پر اہلِ علم کا نقطۂ نظر منفی ہوتا ہے۔ مثلاً مشہور انگریز مورخ ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) نے لکھا ہے کہ — انسانیت کی تاریخ جرائم، حماقت اور بدقسمتی کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے:

History, which is, indeed, little more than the register of crimes, follies and misfortunes of mankind.

مختلف زبانوں میں جو بڑے بڑے ناول لکھے گئے ہیں، وہ سب کے سب المیہ (tragedy) ہیں، نہ کہ طربیہ (comedy)۔ انسانی تاریخ کے بارے میں اِس قسم کا منفی تصور کیوں ہے۔ اِس کا سبب دراصل تاریخ کا غیر فطری طریق مطالعہ ہے۔ تاریخ کا فطری طریقِ مطالعہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تاریخ کے بارے میں خالق کے نقشہ (model) کو دریافت کیا جائے، اور اس کے بعد اِس خدائی نقشے کی روشنی میں تاریخ کا جائزہ لیا جائے۔

جو لوگ تاریخ کے بارے میں منفی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اُن سب کی مشترک غلطی یہ ہے کہ وہ اپنے مفروضہ نقشے کی روشنی میں تاریخ کو سمجھنا چاہتے ہیں، اور جب تاریخ ان کے مفروضہ نقشے کے مطابق، بامعنی نظر نہیں آتی تو وہ تاریخ کے بارے میں منفی سوچ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تاریخ کے بارے میں اِسی منفی نقطۂ نظر کے تحت ایک مغربی مفکر نے کہا کہ اِس دنیا میں ہر چیز حسین ہے، صرف ایک چیز حسین نہیں، اور وہ انسان ہے:

In this world everything is beautiful except man.

یہ تبصرہ غلط معیار کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے سوا بقیہ دنیا جتنی حسین ہے، اُس سے بھی زیادہ انسانی دنیا حسین ہے۔ انسان مقصدِ کائنات ہے، پھر وہ غیر حسین کیسے ہوسکتا ہے۔ انسانی تاریخ

یہ تبصرہ دراصل ایک غلط معیار کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ مبصر نے مادی دنیا کو دیکھا۔ اس کو نظر آیا کہ مادی دنیا میں پورے مجموعے کی سطح پر حسن پایا جاتا ہے۔ اس نے چاہا کہ یہی مجموعی حسن اس کو انسانی دنیا میں بھی نظر آئے۔ جب اُس نے پایا کہ انسانی دنیا میں اِس قسم کا مجموعی حسن نہیں ہے، تو اُس نے مذکورہ قسم کا ریمارک (remark) دے دیا۔

خالق کے منصوبے کے مطابق، انسانی دنیا اور بقیہ مادی دنیا کے درمیان ایک فرق پایا جاتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ انسان کے سوا بقیہ کائنات میں مجموعی نظم (collective discipline) درکار ہے، کیوں کہ بقیہ دنیا امتحان (test) کے لیے نہیں پیدا کی گئی ہے، بلکہ وہ انسان کے لیے ایک معاون ذریعے کے طور پر پیدا کی گئی ہے، مجموعی نظم کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

اِس کے برعکس، انسان کا معاملہ فرد فرد کا معاملہ ہے۔ یہاں مجموعی حسن مطلوب نہیں، بلکہ یہاں انفرادی حسن مطلوب ہے۔ انسانی دنیا میں ہر فرد کو الگ الگ جانچا جا رہا ہے۔ ہر فرد کو الگ الگ یہ موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرکے اپنے آپ کو جنت کے معاشرے کا ایک کامیاب ممبر بنا سکے۔ اِسی منصوبۂ تخلیق کی بنا پر دونوں کی جانچ کا الگ الگ معیار ہوگا۔ انسان کو فرد کی سطح پر جانچنا چاہئے اور بقیہ کائنات کو مجموعے کی سطح پر۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کی دونوں مثالیں شاہ کار ہیں، انسان بھی اور بقیہ کائنات بھی، مگر دونوں کو جانچنے کا معیار ایک دوسرے سے الگ ہے۔

تاریخ کے مطالعے کے بارے میں جو لوگ منفی نقطہ نظر رکھتے ہیں، ان کی مشترک غلطی یہ ہے کہ وہ پورے انسانی معاشرے یا پورے انسانی مجموعے کو دیکھ کر اپنی رائے بناتے ہیں۔ چوں کہ مجموعے کی سطح پر اُنھیں مطلوب معیاری سماج نظر نہیں آتا، اِس لیے وہ کہہ دیتے ہیں کہ انسانی دنیا میں برائی (evil) کے سوا کچھ اور نہیں، حالاں کہ اُنھیں یہ کہنا چاہیے کہ انسانی دنیا میں اگر چہ مجموعہ کی سطح پر برائی ہے، لیکن افراد کی سطح پر خیر موجود ہے۔ مذکورہ منفی سوچ کے تحت 'پرابلم آف اِول' (problem of evil) جیسا نظریہ وجود میں آیا ہے، جو کہ موجودہ زمانے میں عام طور پر اہلِ علم کے ذہن پر چھایا ہوا ہے۔

انسانی دنیا کو مجموعی سطح پر معیاری بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسانی آزادی کو منسوخ کر دیا جائے، کیوں کہ انسانی سماج میں تمام برائیوں کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ انسان کی طرف سے آزادی کا غلط استعمال (misuse of freedom) ہے۔ مگر انسان کی آزادی کو منسوخ کرنا خود خالق کے منصوبے کو منسوخ کرنے کے ہم معنی ہے۔ اِس لیے خالق نے اپنے منصوبے کی اِس طرح تشکیل کی کہ اس نے انسان کے معاملے کو مبنی بر مجموعہ (collective-based) نہیں بنایا، بلکہ اس کو مبنی بر فرد (individual-based) بنایا۔ اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، خدا کا کنسرن (concern) یہ نہیں ہے کہ پورے مجموعۂ انسانی میں لازماً معیاری نظام قائم ہو۔ ایسا صرف اُس وقت ہوسکتا تھا جب کہ انسان کی آزادی کو کلی طور پر منسوخ کر دیا جاتا، اور خالق کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، ایسا ہونا ممکن نہیں۔

اِس منصوبۂ تخلیق کے مطابق، پورے اجتماع یا پورے مجموعے کی سطح پر معیار (ideal) کا

حصول ممکن نہیں، لیکن یہ عین ممکن ہے کہ انسانوں کی بھیڑ میں ایسے معیاری افراد وجود میں آتے رہیں جو اپنی ذات کی سطح پر سچائی کو دریافت کریں اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیں، یہی استثنائی افراد خالق کو مطلوب ہیں — یہی مطلب ہے انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مطلوب کے مطابق، تاریخ کو مینیج (manage) کرنے کا۔

خالقِ کائنات کی یہ اسکیم قرآن کے مطالعے سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ النساء کی دو آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا، وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے، یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور صالح۔ کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ کا علم کافی ہے'' (4: 69-70)۔

قرآن کے اِس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون سے منتخب افراد ہوں گے جن کے مجموعے سے جنت کا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اِن افراد کو بتانے کے لیے یہاں چار الفاظ استعمال کئے گئے ہیں — نبی، صدیق، شاہد، صالح۔ نبی سے مراد صاحب وحی انسان (revealed person) ہے۔ صدیق سے مراد وہ انسان ہے جو حق کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا زیادہ وابستہ کرے کہ اس کو پیغمبر کے ساتھ مزاجی مناسبت حاصل ہوجائے۔ شہید یا شاہد سے مراد وہ انسان ہے جس کی زندگی میں حق اتنا زیادہ متشکّل ہوجائے کہ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ لوگوں کے درمیان حق کا گواہ بن جائے۔ صالح سے مراد وہ انسان ہے جس کی زندگی میں فکر وعمل کی مطابقت کامل درجے میں پائی جائے۔

بنیادی طور پر یہی چار قسم کے افراد ہیں جن کے مجموعے سے وہ معیاری معاشرہ تشکیل پائے گا جس کو جنت کہا جاتا ہے۔ اِن افراد کا تعلق کسی ایک زمانے یا کسی ایک معاشرے سے نہیں ہوگا، بلکہ وہ مختلف غیر معیاری معاشروں کے منتخب کئے ہوئے افراد ہوں گے۔ خالق کی اِس اسکیم کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اِس دنیا میں صرف انفرادی کامیابی (individual achievement) ممکن ہے۔ جہاں تک اجتماعی کامیابی (social achievement) کا تعلق ہے، وہ امتحان کی اس دنیا میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔

موجودہ دنیا میں درست روش پر قائم ہونے کے لئے مثبت ذہن ضروری ہے۔ مگر مثبت ذہن کے ساتھ جینا کوئی سادہ بات نہیں۔ مثبت ذہن کے ساتھ جینے کے لئے آدمی کو ایک لازمی امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ ہے دومتضاد رجحانات کو مینج (manage) کرتے ہوئے زندگی گزارنا۔

اصل یہ ہے کہ آدمی پیدائشی طور پر ایک معیار پسند مخلوق ہے، مگر عملاً اس کو ایک غیر معیاری دنیا میں رہنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے شعوری طور پر باخبر ہونا بہت ضروری ہے۔ ورنہ یہ ہوگا کہ اس کا معیار پسند ذہن دنیا کے غیر معیاری تجربات کی بنا پر ردعمل کا شکار ہوتا رہے گا اور نتیجۃً وہ مثبت ذہن سے محروم ہوجائے گا، اور مثبت ذہن سے محروم ہونا ہر چیز سے محروم ہونے کے ہم معنی ہے۔

آدمی کو شعوری طور پر یہ جاننا چاہیے کہ اس کا معیار پسند ذہن اس لئے ہے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا کا طالب بنے، نہ یہ کہ وہ اسی موجودہ دنیا میں جنتی زندگی یا جنتی معاشرہ کو حاصل کرنے لگے۔ موجودہ دنیا جنتی انسان بنانے کے لئے ہے، نہ کہ جنتی معاشرہ بنانے کے لئے۔ جو آدمی شعوری طور پر اس راز کو جان لے کہ موجودہ دنیا میں اس کو اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے وہ کامیاب ہوا۔ اور جو آدمی موجودہ دنیا ہی کو جنتی دنیا بنانے کی کوشش میں لگ جائے، وہ ناکام ونامراد رہا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں جنتی شخصیت بنناتو ممکن ہے، مگر جنتی نظام بننا ممکن نہیں۔

تاریخ کی خدائی تنظیم

قرآن میں تاریخ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، اس کے مطابق، انسانی تاریخ آدم سے شروع ہوتی ہے، جو کہ پہلے انسان (first man) تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اور ان کی بیوی حوا کو پیدا کر کے اُنھیں جنت میں آباد کیا۔ خدا کی طرف سے اُن کو صرف ایک ہدایت دی گئی تھی، وہ یہ کہ: اے آدم، تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس سے کھاؤ آسودگی کے ساتھ، جہاں سے چاہو۔ اور اس درخت کے قریب مت جانا، ورنہ تم ظالموں میں سے ہوجاؤگے‘‘ (2: 35)۔

آدم کے ساتھ ان کی بیوی کو پیدا کرنے میں اِس بات کا اشارہ تھا کہ انسان کی پیدائش سے اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے، وہ صرف ایک انسانی فرد نہیں، بلکہ ایک انسانی نسل ہے۔

انسان کے لیے جنت کا مستحق ہونے کی شرط صرف ایک تھی، یہ کہ وہ خود انضباطی کردار (self-disciplined character) کا پابند رہے، وہ آزادی کا غلط استعمال نہ کرے۔ مگر آدم اور حوا اِس شرط پر پورے نہیں اترے۔ اِس لیے انھیں جنت سے نکال کر سیارۂ ارض پر آباد کر دیا گیا۔

اِس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے انسان کو یہ موقع دیا گیا تھا کہ انسان عمومی بنیاد (general basis) پر جنت میں رہے، یعنی ہر پیدا ہونے والے عورت اور مرد کو جنت کی زندگی حاصل ہو۔ لیکن جب انسان اِس اعتماد پر پورا نہیں اترا تو اس کے بعد اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ انسان کی آزادی تو برقرار رہے گی، لیکن اب عمومی بنیاد پر نہیں، بلکہ انتخابی بنیاد پر صرف مستحق افراد کو جنت میں داخلہ دیا جائے گا۔ یہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کو خدا کی طرف سے مینج کرنے کا پہلا واقعہ تھا۔

موجودہ زمین اِس تخلیقی مقصد کے لیے سلیکشن گراؤنڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب یہ ہوگا کہ قیامت کے بعد فرشتوں کے ریکارڈ کے مطابق، صرف منتخب عورتوں اور مردوں، قرآن کے الفاظ میں احسن العمل ((67:2 افراد کو، یہ خوش نصیبی حاصل ہوگی کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں آباد ہوسکیں۔

زمین پر لائف سپورٹ سسٹم کا انتظام تو خدا کی طرف سے کیا گیا تھا، مگر انسان کو اپنے قول و عمل کی مکمل آزادی حاصل تھی، لیکن دوبارہ انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔ دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ عمومی طور پر انسانی نسل شرک یا فطرت پرستی میں مبتلا ہوگئی۔ گویا کہ پہلے انسان نے ''درخت'' کا صرف پھل کھایا تھا، اب انسان نے ''درخت'' کو معبود قرار دے کر اس کی پرستش شروع کردی۔

تاہم منصوبۂ تخلیق (creation plan) کے مطابق، یہ ممکن نہیں تھا کہ انسان کی آزادی کو منسوخ کردیا جائے، اِس لیے اللہ نے انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو مینج (manage) کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اللہ نے یہ کیا کہ انسانوں میں سے کسی فرد کو منتخب کر کے اُس کو اپنا پیغمبر بنایا۔ اُس کو وحی (revelation) کے ذریعے اپنی رہنمائی بھیجی۔ اِن پیغمبروں نے انسانوں کو بتایا کہ عبادت کے قابل صرف ایک اللہ ہے۔ تم ایک اللہ کی عبادت کرو اور خود ساختہ معبودوں کی عبادت چھوڑ دو۔

مگر انسانوں کی بڑی تعداد ایسا نہ کرسکی۔ اللہ کی عبادت کا معاملہ ناقابلِ مشاہدہ

(unobservable) ہستی کو معبود بنانے کا معاملہ تھا۔ انسان نے اپنی ظاہر پرستی کی بنا پر نیچر کو اپنا معبود بنالیا، جو کہ اس کے لیے ایک قابلِ مشاہدہ (observable) معبود کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِسی نیچر ورشپ کا دوسرا نام شرک ہے۔

پیغمبروں کی آمد کے باوجود انسان کے لیے آزادئ اختیار (freedom of choice) کا موقع بدستور باقی تھا۔ اِس لیے انسان پیغمبروں کا انکار کرتا رہا۔ یہ معاملہ نسل درنسل جاری رہا، یہاں تک کہ شرک انسان کے لیے غالب کلچر بن گیا، تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔

مشرکانہ کلچر کے عمومی غلبہ کا مزید نتیجہ یہ ہوا کہ وقت کی حکومتوں نے شرک کو اسٹیٹ کے مذہب کے طور پر اختیار کرلیا۔ اِس طرح شرک کو ہر جگہ سیاسی طاقت کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ پہلے اگر شرک سادہ معنوں میں ایک اعتقادی برائی تھی تو اب وہ ایک طاقت ور برائی بن گئی۔ مشرکانہ اقتدار کا کلچر بڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ برائی پیدا ہوئی جس کو فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے مطلق شہنشاہیت (absolute imperialism) کا نام دیا ہے۔

شرک کی اِسی سیاسی سرپرستی کے نتیجے میں وہ جارحانہ مذہبیت پیدا ہوئی جس کو تاریخ میں، مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ سیاسی حاکموں نے ایسا ماحول قائم کیا جس کے نتیجے میں لوگوں کے لیے صرف ایک ہی آپشن باقی رہا، اور وہ مشرکانہ مذہب تھا۔ توحید کا مذہب اختیار کرنے والوں کے لیے یہ انجام مقدر ہوگیا کہ وہ یا تو ریاست کے مذہب کو اختیار کرلیں، یا وہ قتل کردئے جائیں۔ دورِ قدیم کی یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی طرف قرآن کی سورہ البروج کی آیات (85: 4-8) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اِس صورت حال سے یہ واضح ہوگیا کہ اب مذہبِ حق کا صرف اعلان کافی نہیں ہے۔ اب پہلی ضرورت یہ ہے کہ مذہب کو سیاسی اقتدار سے جدا کردیا جائے، تاکہ انسان کے لیے آزادی کے ساتھ اپنے عقیدے کا فیصلہ کرنا ممکن ہوجائے۔

تخلیقِ آدم

اللہ تعالیٰ نے پہلے لمبے تدریجی عمل (gradual process) کے ذریعے مادی کائنات بنائی۔

آخر میں اُس نے سیارہ ارض پر انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے آباد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسانِ اوّل (آدم) کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اُس وقت اللہ اور فرشتوں کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ یہ واقعہ قرآن کی سورہ البقرہ میں آیا ہے۔ یہاں متعلق آیات کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اُس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے سکھائے آدم کو سارے نام، پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے اُن لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے کہا: اے آدم، ان کو بتاؤ اُن لوگوں کے نام، تو جب آدم نے بتائے اُن کو اُن لوگوں کے نام تو اللہ نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں، اور مجھ کو معلوم ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو'' (2: 30-33)۔

یہاں یہ سوال ہے کہ فرشتوں نے آدم کے بارے میں جس شک کا اظہار کیا تھا، وہ کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کے وضاحتی جواب کے بعد فرشتے جس چیز پر مطمئن ہوئے، وہ چیز کیا تھی۔ یہ بات قرآن میں بطور اشارہ موجود ہے۔ اِس اشارے کی تفصیل جاننے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا منصوبہ کیا تھا اور وہ کس طرح اپنی تکمیل تک پہنچا۔

یہ اشارہ قرآن کی ایک اور سورہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کی سورہ التین میں ارشاد ہوا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِينَ ○ إِلَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (95: 4-6) یعنی ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اُس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو اُن کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ ایک عظیم احسان کا معاملہ کیا جس کو

قرآن میں تکریم (17: 70) کہا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعلیٰ صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا، اُس کو کامل آزادی دی، اس کو یہ موقع دیا کہ وہ خود اپنے آزادانہ انتخاب (choice) سے اپنی زندگی کے لیے درست روش کو اختیار کرے اور پھر اللہ تعالیٰ یہ کہہ کر اس کے لیے جنت کا فیصلہ کرے کہ یہ تیرے اپنے عمل کی جزا ہے جو تو نے دنیا میں کیا۔ مگر انسانوں کی اکثریت نے اِس منصوبۂ الٰہی کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا اور اِس طرح انھوں نے جنت کا استحقاق کھو دیا۔ البتہ اِس عموم میں کچھ مستثنیٰ افراد پیدا ہوئے جنھوں نے اِس منصوبۂ الٰہی کو سمجھا اور اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرکے انھوں نے اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنالیا۔

اِس قرآنی بیان کی روشنی میں غور کیجئے تو سورہ البقرہ کے مذکورہ بیان کا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں نے پوری انسانی نسل (total human race) کو لے کر سوچا تو وہ اِس رائے پر پہنچے کہ کامل آزادی انسان کے اندر بگاڑ پیدا کرے گی۔ وہ ظلم اور فساد جیسے کاموں میں ملوث ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مظاہرہ کی صورت میں اس کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ انسانوں کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے بلاشبہہ اُن کے اندر بگاڑ آئے گا، لیکن اِس مجموعے میں ایسے مستثنیٰ افراد بھی پیدا ہوتے رہیں گے جو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کریں گے، اور اِس طرح وہ ابدی رحمتِ خداوندی کے مستحق قرار پائیں گے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ایک مظاہرہ کے ذریعے انسانی تاریخ کے اِن مستثنیٰ افراد کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ دیکھ کر فرشتے مطمئن ہوگئے۔ یہ دیکھ کر فرشتوں نے جانا کہ اُن کا اشکال انسانوں کے پورے مجموعے کی نسبت سے تھا، جب کہ اللہ کا یہ منصوبہ نہیں۔ اللہ کا منصوبہ مبنی برافراد (individual-based) ہے، وہ مبنی بر مجموعہ (totality-based) نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم تھا کہ کامل آزادی دینے کی بنا پر انسانی دنیا ظلم وفساد کا جنگل بن جائے گی، مگر اِس عموم میں استثنا بھی ہوگا۔ انسانوں کے پھیلے ہوئے جنگل میں ایسے استثنائی افراد بھی پیدا ہوں گے جو ظلم وفساد کے جنگل میں ربانی پھول کے مانند ہوں گے۔ اللہ کی نظر اِنھیں ربانی پھولوں پر تھی۔ اللہ کو یہ کرنا تھا کہ وہ فرشتوں کے ذریعے پوری انسانی تاریخ کا ریکارڈ تیار کرے، پھر اِن ربانی افراد کو منتخب کرکے

اُنھیں انسانوں کی عمومی بھیڑ سے الگ کیا جائے اور پھر ان کو جنت کے ابدی باغوں میں بسا یا جائے۔

جنت سادہ معنوں میں کوئی عیش کدہ نہیں۔ جنت وہ اعلیٰ مقام ہے جہاں تاریخ انسانی کے منتخب افراد کا معاشرہ بنایا جائے۔ وہاں اُن کو ہر قسم کا بہترین انفراسٹرکچر (infrastructure) حاصل ہو۔ تاریخ انسانیت کے یہ منتخب افراد یہاں فرشتوں کے تعاون سے ایک برتر تہذیب (super civilization) وجود میں لائیں۔ موجودہ دنیا میں جو تہذیب بنی، وہ قوانین فطرت (laws of nature) کی جزئی دریافت سے بنائی گئی۔ آخرت میں جو مافوق تہذیب بنے گی، وہ کلمات اللہ کی کلّی انفولڈنگ کے ذریعے تشکیل پائے گی۔

اِس معاملے کی مزید وضاحت قرآن کی دوسری آیتوں سے ہوتی ہے۔ اِس سلسلے کی ایک آیت یہ ہے: وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (31: 27) یعنی اگر زمین میں جو درخت ہیں، وہ قلم بن جائیں اور سمندر سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں، تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

قرآن کی یہ آیت بظاہر خبر کے اسلوب میں ہے، مگر حقیقت میں وہ انشا ہے، یعنی اِس میں کلمات اللہ کے بارے میں صرف ایک موجود امکان کو نہیں بتایا گیا ہے، بلکہ اُس میں مخصوص قرآنی اسلوب کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ اِن لامحدود کلمات اللہ کی انفولڈنگ کی جائے۔ یہ کام جنت کے ابدی ماحول میں انجام پائے گا۔ وہاں پوری تاریخ بشری کے منتخب افراد اکھٹا ہوں گے اور وہ اعلیٰ ترین مواقع کے درمیان کلمات اللہ کی انفولڈنگ کا کام انجام دیں گے۔ یہ ایک لامحدود کام ہوگا جو ابد تک جاری رہے گا۔ اِس عمل کو قرآن میں شُغلِ فاکہ (35: 55) یعنی پُرمسرت سرگرمی (joyful activity) کا نام دیا گیا ہے۔

فردِ انسانی، مجموعۂ انسانی

تاریخ میں جتنے مفکر اور مصلح گزرے ہیں، وہ سب کے سب آئڈیلسٹ (idealist) تھے۔

اُن میں سے ہر ایک پوری انسانیت کی سطح پر معیاری نظام (ideal system) قائم کرنا چاہتا تھا۔قدیم یونان کے فلسفی افلاطون اورارسطو کا خواب یہ تھا کہ دنیا میں آئڈیل سوسائٹی بنے۔ برٹش فلسفی برٹرینڈرسل چاہتا تھا کہ ایک پرامن دنیا وجود میں آئے۔ انڈیا کے لیڈر مہاتما گاندھی کا نشانہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد انڈیا میں مبنی برخدمت سماج (سیوا سماج) تشکیل پائے، وغیرہ۔ یہ سب انسانی زندگی کے معیاری تصورات تھے۔مگر واقعات بتاتے ہیں کہ عملاً تمام کے تمام مفکرین اور مصلحین معیاری دنیا(ideal world) کو وجود میں لانے میں ناکام رہے۔

اِس کا سبب یہ تھا کہ ہر مفکراور ہر مصلح نے اپنے دماغ سے سوچا۔کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ اِس معاملے میں خالق کی اسکیم (scheme of things) کیا ہے۔مفکرین اورمصلحین کا منصوبہ خالق کے منصوبے سے مطابقت نہ رکھتا تھا،اِس لیے وہ مکمل طور پرناکام رہا۔

خالق نے ہرانسان کوآزادیٔ اختیار (freedom of choice) دی ہے۔یہ آزادیٔ اختیار قیامت سے پہلے، ہرگز منسوخ ہونے والی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اِس دنیا میں مجموعۂ انسانی کی سطح پر کسی معیاری نظام کا بننا ممکن نہیں۔ یہاں معیاری فرد تو وجود میں آ سکتا ہے،لیکن مجموعے کی سطح پر کوئی معیاری نظام کبھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ معیاری افراد کا وجود میں آنا تو ممکن ہے،مگر معیاری سماجی نظام کا وجود میں آنا ممکن نہیں۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اِس دنیا میں مجموعۂ انسانیت کی سطح پر کوئی معیاری نظام تو کبھی وجود میں نہ آسکا،لیکن عین اسی وقت ہرزمانے میں فرد (individual) کی سطح پر معیاری انسان وجود میں آتے رہے۔ خالق کے نقشے کے مطابق، یہ ممکن نہیں کہ موجودہ دنیا میں پورے سماج کی سطح پر کوئی معیاری نظام تشکیل پائے۔لیکن عین اِسی وقت پوری تاریخ میں ایک واقعہ مسلسل پیش آرہا ہے، وہ یہ کہ ہر دور میں معیاری افراد بن رہے ہیں۔ خالق کی اسکیم کے مطابق، جو ہونے والا ہے، وہ یہ کہ مختلف زمانوں میں پیدا ہونے والے اِن معیاری افراد کو چن کر الگ کرلیا جائے اور پھر مختلف زمانوں میں پیدا ہونے والے اِن معیاری افراد کے اجتماع سے ایک آئڈیل سوسائٹی بنائی جائے۔ اِسی معیاری سماج کا نام

مذہبی اصطلاح میں جنت (paradise) ہے۔

حضرت نوح کا رول

آدم پہلے انسان تھے اور پہلے نبی بھی۔ اُن کو اوران کی بیوی حوا کو غالباً عراق کے اُس مقام پر بسایا گیا جس کو قدیم زبان میں میسوپوٹامیا (Mesopotamia) کہا جاتا تھا۔ آدم اورحوا کی نسل سے جو لوگ پیدا ہوئے، وہ کئی نسل تک شریعتِ آدم پر قائم رہے، پھر دھیرے دھیرے اُن کے اندر بگاڑ پیدا ہوا اور تقریباً تمام نسل شرک میں مبتلا ہوگئی۔ انھوں نے اپنے بڑوں (وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق، نسر) کو اپنا معبود بنالیا۔ پھر اِسی علاقہ (میسوپوٹامیا) میں حضرت نوح پیدا ہوئے۔ انھوں نے لمبی مدت تک نسلِ آدم کو توحید کا پیغام دیا۔ مگر ان کی قوم کے بہت کم لوگ اُن پر ایمان لائے (11: 40)۔ بعض روایات کے مطابق، ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد 80 تھی۔ اُن کی قوم کے بقیہ تمام افراد اصرار کے ساتھ شرک پر قائم رہے۔

حضرت نوح نے اِسرار واعلان (71: 9) کی تمام صورتیں اختیار کیں۔ لیکن آخر کار اُن پر یہ واضح ہوا کہ معاشرے کی کنڈیشننگ (conditioning) اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ اب قوم کے اندر جو بچہ پیدا ہوگا، وہ آخر کار قوم ہی کے مذہب کو اختیار کرے گا۔ جب بگاڑ اِس حد تک پہنچ چکا تو اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ مومنینِ نوح کو بچا کر بقیہ قوم کو ہلاک کردیا جائے۔

اُس وقت حضرت نوح نے اللہ کے حکم سے ایک بڑی کشتی بنائی۔ اِس کشتی میں ایمان لانے والے 80 مردوں اور عورتوں کو سوار کیا گیا۔ اِس کے بعد اُس علاقے میں ایک سیلاب آیا۔ یہ سیلاب اتنا بڑا تھا کہ اُس علاقے کی پہاڑیاں بھی پانی کے اندر ڈوب گئیں۔ حضرت نوح کی کشتی تیرتی ہوئی جودی پہاڑ پر رُکی (11: 44)۔ یہ واقعہ تقریباً 5 ہزار سال پہلے پیش آیا۔ اِس پہاڑ کا موجودہ نام ارارات (Mount Ararat) ہے۔ جدید دریافت کے مطابق، وہ مشرقی ترکی میں واقع ہے۔

کسی قوم کو عذاب دینے کا واقعہ تاریخ میں کئی بار پیش آیا ہے، لیکن ایک عظیم سیلاب کے ذریعے عذاب دینے کا واقعہ صرف ایک بار پیش آیا۔ یہ واقعہ بھی خدا کی طرف سے تاریخ کی تنظیم سے

تعلق رکھتا ہے۔ اِس بنا پر یہ ممکن ہوا کہ کشتی میں سوار اہلِ ایمان دور کے علاقے میں پہنچ جائیں۔ چناں چہ یہی بچے ہوئے اہلِ ایمان تھے جن کی وجہ سے دنیا کے مختلف حصوں میں انسان کی آبادیاں قائم ہوئیں۔ حضرت نوح کے زمانے تک انسان کی نسل صرف میسوپوٹامیا (عراق) کے محدود علاقے میں پائی جاتی تھی، لیکن طوفانِ نوح کے بعد انسان کی نسل زمین کے مختلف حصوں میں پھیل گئی۔

تاریخ کے دو دھارے

قرآن کے بیان کے مطابق، انسانی تاریخ کے آغاز ہی سے انسانی زندگی کے دو دھارے بن گئے — ایک، اتباعِ ابلیس کا دھارا، اور دوسرا، اتباعِ ملائکہ کا دھارا۔ زندگی میں ہمیشہ مثبت اور منفی دونوں قسم کے پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اتباعِ ابلیس یہ ہے کہ آدمی مثبت پہلو کو نظر انداز کرکے منفی پہلو کو اختیار کرے۔ اس کے برعکس، اتباعِ ملائکہ یہ ہے کہ آدمی منفی پہلو کو نظر انداز کرکے مثبت پہلو پر فوکس کرے۔ پوری انسانی تاریخ اِسی دو قسم کے اتباع کی کہانی ہے۔ ایک روش کو اتباعِ ابلیس کا کلچر کہہ سکتے ہیں اور دوسری روش کو اتباعِ ملائکہ کا کلچر۔

خالق نے انسان کو مکمل آزادی دے دی ہے، خواہ اِس آزادی کی بنا پر بگاڑ کی وہ صورت پیدا ہوجائے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30: 41)، مگر خالق نے انسان کی آزادی منسوخ نہیں کی، البتہ خالق نے اِس کا اہتمام کیا کہ اصل مقصدِ تخلیق میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ خالق نے انسان کو آزادی بھی دے دی ہے اور اِسی کے ساتھ وہ تاریخ کو اِس طرح مینج (manage) کررہا ہے کہ مجموعے کی سطح پر بگاڑ کے باوجود مطلوب افراد کی پیدائش کا سلسلہ برابر جاری رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو تاریخ کی معنویت کو واضح کرتا ہے۔

تاریخ میں ایسے انسانوں کی مثالیں کم ہیں جنھوں نے اپنی آزادی کا صحیح استعمال کیا۔ زیادہ مثالیں وہ ہیں، جب کہ انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔ بظاہر یہ تاریخ کی ایک منفی تصویر ہے، مگر اِس منفی تصویر کا بھی ایک مثبت پہلو ہے، وہ یہ کہ اِسی ماحول کے دوران وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جب کہ انسانوں کا امتحان لے کر مطلوب افراد کا انتخاب کیا جاسکے۔ مزید یہ کہ یہ نظام مطلق معنوں میں

شر نہیں ہے، بلکہ اس میں خیر کا بھی ایک پہلو پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ آزادی کی بنا پر جب ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنی اپنی سرگرمیاں جاری کرتا ہے تو اِس سے لوگوں کو طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگوں کو طرح طرح کے نقصانات پیش آتے ہیں۔ یہ سب گویا ایک طرح کا شاک ٹریٹمنٹ (shock treatment) ہوتا ہے۔ اِس طرح کے ناخوش گوار تجربات کی بنا پر افراد کے اندر وہ ذہنی سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں جس کو نفسیات کی اصطلاح میں برین اسٹارمنگ (brain storming) کہا جاتا ہے — نفسیاتی مطالعے کے مطابق، یہی برین اسٹارمنگ ہر قسم کی ذہنی ترقیوں کا ذریعہ ہے۔

معتدل حالات میں آدمی بڑے بڑے کام نہیں کرتا۔ بڑے بڑے کام صرف اُس وقت کئے جاتے ہیں، جب کہ غیر معتدل حالات پیدا ہوں۔ غیر معتدل حالات کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر شدید قوتِ عمل جاگتی ہے۔ اس کے اندر شدید محرک (strong incentive) پیدا ہوتا ہے۔ یہی شدید محرک تمام بڑے بڑے واقعات کو رونما کرنے کا سبب ہے۔

مثلاً صلیبی جنگوں کے ذریعے وہ حالات پیدا ہوئے جن کے ذریعے اہلِ یورپ میں نیچر کی طاقتوں کی دریافت کا شدید جذبہ پیدا ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں اِسی طرح کا شدید جذبہ پیدا ہوا، جس کے نتیجے میں ہوابازی (aviation) کو ترقی ہوئی۔ اِسی طرح دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں وہ شدید محرک پیدا ہوا جس کی بنا پر کمیونکیشن کو ترقی ہوئی، وغیرہ۔

نئی منصوبہ بندی

منصوبۂ تخلیق کے مطابق، یہ ممکن نہیں تھا کہ انسان کی آزادی کو منسوخ کیا جائے۔ اِس لیے اب اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں بالواسطہ طور پر ایک دخل دیا۔ اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ایسا گروہ پیدا کیا جائے جو مذہب اور سیاسی اقتدار کو ایک دوسرے سے الگ کردے، تاکہ انسانی تاریخ اپنے صحیح رخ پر سفر کرسکے، بغیر اس کے کہ انسانی آزادی کو منسوخ کیا گیا ہو۔ اِس نئے منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کا مجموعہ خواہ آزادی کا صحیح استعمال نہ کرنے کی بنا پر غلط رخ پر چلتا رہے، لیکن پھر بھی افراد کو یہ موقع حاصل رہے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق، صحیح مذہب کو اختیار کرسکیں۔

اِس نئے منصوبے کا آغاز چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم کے ذریعے ہوا۔ حضرت ابراہیم کا مقامِ عمل قدیم عراق تھا۔ یہاں اُس وقت مشرکانہ کلچر کا غلبہ تھا۔ حضرت ابراہیم نے لمبی مدت تک اُنھیں توحید کی دعوت دی، مگر وہ لوگ اپنی کنڈیشننگ کی بنا پر توحید کی فکر کو قبول نہ کرسکے، یہاں تک کہ انھوں نے حضرت ابراہیم کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اِس صورتِ حال کا تقاضا ہوا کہ حضرت ابراہیم اپنے مقامِ عمل کو بدل دیں۔ چناں چہ وہ اپنی اہلیہ ہاجرہ اور اپنے فرزند اسماعیل کو لے کر مکہ کے قریب آگئے جو اُس وقت صرف ایک ویران صحرا کی حیثیت رکھتا تھا۔

اِس صحرائی ماحول میں توالد وتناسل کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں وہ گروہ وجود میں آیا جس کو بنواسماعیل کہا جاتا ہے۔ صحرائی ڈی کنڈیشننگ کے ماحول میں ایک نئی قوم بنانے کا یہ عمل تقریباً ڈھائی ہزار سال تک جاری رہا۔ پھر بنواسماعیل کے اِسی گروہ میں پیغمبر اسلام محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ پیغمبر اسلام کی 23 سالہ جدوجہد کے نتیجے میں یہ ہوا کہ بنواسماعیل کے صالح افراد بڑی تعداد میں آپ کے گرد جمع ہوگئے، یہاں تک کہ وہ گروہ بنا جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

اصحابِ رسول کا زمانۂ عمل ساتویں صدی عیسوی ہے۔ اُن کے ذریعے منصوبہ خداوندی کے مختلف کام انجام پائے۔ مثلاً کتاب الٰہی (قرآن) کا محفوظ ہوجانا۔ دینِ خداوندی کا ایک عملی ماڈل قائم ہوجانا۔ دین خداوندی جو پچھلے انبیا کے زمانے میں زیادہ تر فکری مرحلے تک محدود تھا، وہ اب انقلابی مرحلے میں پہنچ گیا۔ اِن تبدیلیوں کی بنا پر یہ ممکن ہوگیا کہ پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم کردیا جائے۔ تاریخ میں انفرادی پیغمبر کا دور ختم ہوجائے اور اجتماعی امت کا دور شروع ہوجائے، وغیرہ۔

اللہ کی خصوصی نصرت سے، اصحاب رسول کے ذریعے جو انقلابی کام انجام پایا، اُس کا ایک خاص پہلو وہ تھا جس کا ذکر قرآن کی اِس آیت میں کیا گیا ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (8:39)۔ اِس آیت میں ’فتنہ‘ سے مراد وہ جارحانہ نظام ہے جو قدیم طرز کی شہنشاہیت (imperialism) کی سرپرستی میں قائم تھا۔ اِس شہنشاہی نظام نے ایک ایسا نظام قائم کررکھا تھا جو خدا کے تخلیقی منصوبے کی تنسیخ کے ہم معنی تھا، یعنی آزادیٔ فکر کا خاتمہ۔

اِس لیے خدا کو یہ مطلوب تھا کہ اِس جبری شہنشاہی نظام کو توڑ دیا جائے، تاکہ انسانی قافلے کے سفر میں کوئی مصنوعی رکاوٹ حائل نہ رہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں اِس جبری شہنشاہیت کے دو بڑے نمائندے تھے — ایک ساسانی ایمپائر (Sassanid Empire) اور دوسرے، رومن ایمپائر یا بازنطینی ایمپائر (Byzantine Empire)۔ یہ دونوں ایمپائر اتنا زیادہ طاقت ور تھے کہ اصحابِ رسول کے ذریعے ان کو مغلوب کرنا عملاً ناممکن تھا۔ عین اُس زمانے میں ایک معاون واقعہ پیش آیا، یعنی دونوں سیاسی چٹانوں کے درمیان باہمی ٹکراؤ۔ چناں چہ دونوں ایمپائر ایک دوسرے سے لڑ گئے۔ پہلے ساسانی ایمپائر نے رومن ایمپائر کو تباہ کیا، اس کے بعد رومن ایمپائر نے ساسانی ایمپائر کا زور توڑ دیا۔ اِس کے بعد یہ ممکن ہوگیا کہ خدائی منصوبے کے مطابق، اصحابِ رسول اُن کو مغلوب کرسکیں۔ یہ تاریخی واقعہ پیشگی طور پر منصوبۂ الٰہی میں مقدر کردیا گیا تھا۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کی طرف بائبل میں پیشین گوئی کے طور پر ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا تھا — اُس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے (*Habakkuk*, 3: 6)۔

یہ ساتویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ اِس کے بعد یہ ہوا کہ اہلِ اسلام کو وہ سیاسی غلبہ حاصل ہوگیا جو اس سے پہلے صرف اُن سیاسی نظاموں کو حاصل تھا جو مشرکانہ کلچر کی سرپرستی کرتے تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی غلبہ کے تحت تاریخ میں ایک نیا عمل (process) شروع ہوا۔ اِس عمل کا نشانہ تھا — فطرت (nature) کو موضوعِ تحقیق (object of investigation) بنانا، جو اَب تک انسان کے لیے صرف موضوعِ پرستش (object of worship) بنی ہوئی تھی۔ انسان کو مکمل آزادی عطا کرکے اس کے لیے ذہنی ارتقا کا راستہ کھولنا، فطرت میں چھپے ہوئے اُن وسائل کو وقوع میں لانا جو عالمی دعوت کو ممکن بنانے والے ہوں، وغیرہ۔

انسانی آزادی کی بنا پر اِس دنیا میں تمام واقعات اسباب کے ماحول میں پیش آتے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان علمی تحقیق کا کام خاص طور پر عباسی دور میں شروع ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبے میں مسلمانوں کی عظیم سلطنت قائم ہوچکی تھی۔ اِس بنا پر علمی تحقیق کی طرف

مسلمان صرف جزئی طور پر متوجہ ہوسکے۔ مسلمانوں کی توانائی کا بڑا حصہ سیاسی سرگرمیوں میں لگا ہوا تھا۔ ان کی توانائی کا صرف محدود حصہ علمی تحقیق کے میدان میں صرف ہورہا تھا۔ یہ تناسب ناکافی تھا۔ علمی تحقیق کا یہ کام بہت بڑا کام تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان اپنی طاقت کو پوری یکسوئی کے ساتھ علمی تحقیق کے میدان میں وقف کردیں۔ مگر سیاسی اقتدار اِس قسم کی علمی یکسوئی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

اِس کے برعکس، صلیبی جنگوں کے بعد علمی تحقیق کا کام جب یورپ کی مسیحی قوموں میں شروع ہوا تو سیاسی اقتدار اُن کے لیے رکاوٹ نہ بن سکا، کیوں کہ عملاً وہ اُن کے پاس موجود ہی نہ تھا۔ چناں چہ مسیحی قوموں کے اعلیٰ ذہن بڑی تعداد میں علمی تحقیق کے میدان میں مصروف ہوگئے۔ انھوں نے پوری یکسوئی کے ساتھ علمی تحقیق کا کام شروع کردیا۔

یہ بھی انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کو مینج (manage) کرنے کا معاملہ تھا۔ جب خالق نے دیکھا کہ مسلم دنیا کے حالات علمی تحقیق کو زیادہ بڑے پیمانے پر انجام دینے میں رکاوٹ بن رہے ہیں، تو اُس نے علمی تحقیق کے کام کو مسلم دنیا سے نکال کر مسیحی دنیا کی طرف منتقل کردیا، جہاں اِس قسم کی رکاوٹ والے اسباب موجود نہیں تھے۔

مشرق سے مغرب کی طرف

اسلام کا آغاز 610 عیسوی میں ہوا۔ حالات کی موافقت کی بنا پر اس کی توسیع اتنی تیز رفتاری کے ساتھ ہوئی کہ 50 سال کے اندر اہلِ اسلام کا ایک ایمپائر قائم ہوگیا۔ اب یہ مطلوب تھا کہ امتِ محمدی تسخیرِ فطرت اور سماجی انقلاب کے وہ مطلوب کام انجام دے جس کے لیے اُس کو سیاسی غلبہ عطا کیا گیا تھا۔ مگر مسلمان بہت جلد آپس کے سیاسی ٹکراؤ میں مشغول ہوگئے اور مطلوب کام کی طرف وہ زیادہ پیش قدمی نہ کرسکے۔

اب خدائی منصوبے کے مطابق، تاریخ میں وہ واقعہ پیش آیا۔ جس کو قرآن کی سورہ محمد میں استبدالِ قوم (47: 38) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ استبدال (replacement) کا مطلب یہ تھا کہ مذکورہ منصوبے کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کے بجائے ایک اور قوم کو کھڑا کرنا۔ صلیبی جنگوں (Crusades)

کے ذریعے استبدال کا یہی معاملہ پیش آیا۔

خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ مسلمانوں نے فلسطین کو مسیحیوں سے چھین لیا اور اُس پر اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ فلسطین مسیحی قوموں کے لیے ایک مقدس سرزمین (holy land) کی حیثیت رکھتا تھا۔ چناں چہ مسیحی قومیں اِس قبضے کو کبھی قبول نہ کرسکیں۔ یہ نزاع باقی رہی، یہاں تک کہ یورپ کی مسیحی سلطنتوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ فوجی کارروائی کے ذریعے وہ شام اور فلسطین کے علاقے کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیں۔

صلیبی جنگوں کا یہ سلسلہ 1095ء میں شروع ہوا۔ تقریباً 200 سال کے اندر دونوں قوموں کے درمیان وقفے وقفے سے 9 بار خوں ریز لڑائیاں ہوئیں، مگر یورپ کی مسیحی سلطنتوں کی متحدہ کوشش کے باوجود اُن کو زبردست ناکامی ہوئی۔ اِس کے بعد وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ مسلّح جنگ کے ذریعے مسلمانوں کو شکست دینا اُن کے لیے ممکن نہیں۔ چناں چہ مسیحی قوموں میں ایک نیا ذہن شروع ہوا۔ اس نئی جدوجہد کا نام اسپریچول کروسیڈ (spiritual crusades) تھا۔ اسپریچول کروسیڈ سے مراد دراصل انٹلکچول کروسیڈ (intellectual crusades) تھا۔ چناں چہ مسیحی قوموں نے اب اپنی کوششوں کو علمی ترقی کی طرف موڑ دیا۔ یونانی فلسفیوں اور مسلم فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے وسیع پیمانے پر لاتینی زبان میں کئے جانے لگے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ یورپ میں تعلیم اور علمی رسرچ کی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری ہوئیں۔ چناں چہ اِس کی دو مثالیں یہ ہیں کہ ''اسپریچول کروسیڈ'' کے سینٹر کے طور پر 1096 میں برطانیہ میں آکسفورڈ یونی ورسٹی قائم ہوئی اور 1209 میں کیمبرج یونی ورسٹی قائم کی گئی، وغیرہ۔

اس کے بعد چودھویں صدی اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان یورپ میں وہ انقلاب آیا جس کو نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ اب اسپریچول کروسیڈس نے مزید ترقی کرکے نیچرل کروسیڈس (natural crusades) کی حیثیت اختیار کرلی۔

مغرب میں اسپریچول کروسیڈ اور نیچرل کروسیڈ ابتداءً منفی ذہن کے تحت پیدا ہوئی۔ مغربی قوموں کو

جس چیز نے ابتداءً متحرک کیا تھا، وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف ہتھیار کے میدان میں ہاری ہوئی جنگ کو دوبارہ علم کے میدان میں کامیاب بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ مغرب کی اس منفی نفسیات کو محرک (incentive) کے طور پر استعمال کیا۔ اللہ نے اہلِ مغرب کو اِس کا ذریعہ بنایا کہ وہ نیچر میں چھپے ہوئے اسرار کو دریافت کریں اور ایک ایسی دنیا وجود میں لائیں جو اسلامی مشن کے لیے تائید کا ذریعہ ثابت ہو۔

اہلِ مغرب کے ذریعے یہ تائیدی واقعہ جو اپنی پوری صورت میں بیسویں صدی میں ظہور میں آیا، اس کی پیشگی خبر قرآن کی ایک آیت میں دی گئی تھی: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41: 53) یعنی مستقبل میں ہم اُن کو اپنی آیات دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی۔ یہاں تک کہ اُن کے اوپر یہ آشکارا ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے۔

اہلِ مغرب کے اِس رول کا تذکرہ حدیث میں بھی بطور پیشین گوئی موجود ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: إن اللہ لیؤید ہذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 3062) یعنی اللہ اِس دین کی تائید فاجر انسان کے ذریعے بھی کرے گا۔

اِس حدیث میں 'فاجر' کا لفظ سیکولر کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِن سیکولر مؤیدین سے مراد مغربی دنیا کے وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں سے جدید تہذیب (modern civilization) وجود میں آئی اور اس کے ذریعے آفاق وانفس کی آیات دریافت ہوئیں۔ اہلِ مغرب کے اندر انتقام کی جو نفسیات پیدا ہوئی، وہ فطری طور پر نہایت شدید تھی۔ اِس شدید محرک کو اللہ نے رموزِ فطرت کی دریافت کے لیے استعمال کیا۔

رموزِ فطرت کی دریافت کا یہ کام ایک بے حد مشکل کام تھا۔ اُس میں اپنے آپ کو ڈیڈی کیٹ (dedicate) کرنے کے لیے نہایت شدید محرک (strong incentive) درکار تھا۔ صلیبی جنگوں میں اہلِ مغرب کی توہین آمیز شکست (humiliating defeat) نے اُن کے اندر یہی شدید محرک پیدا کیا۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں برطانیہ کی ایک سائنٹفک ٹیم نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ انٹارکٹکا (Antarctica) کی دریافت کریں۔ یہ ایک نہایت جان جوکھم کا کام تھا۔

ٹیم کے سربراہ سر ارنسٹ شیکلٹن (Sir Ernest Shackleton) نے 1900ء میں لندن کے اخبار ٹائمس (*The Times*) میں ایک اشتہار چھپوایا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

"Men wanted for hazardous journey. Small wages, bitter cold, long months of complete darkness, constant dangers, safe return doubtful. Honour and recognition in case of success."

یعنی ایک پر خطر سفر کے لیے آدمی درکار ہیں۔ بہت کم معاوضہ، شدید ٹھنڈک، لگاتار تاریکی کے لمبے مہینے، مسلسل خطرہ، محفوظ واپسی مشتبہ، کامیابی کی صورت میں عزت اور اعتراف۔

یہ اشتہار جب ٹائمس میں چھپا تو اس میں شرکت کے لیے اتنے زیادہ افراد کی درخواستیں آئیں کہ سلیکشن (selection) کی بنیاد پر اُن میں سے صرف منتخب افراد کو لیا گیا— یہی وہ مجنونانہ اسپرٹ تھی جس نے اہلِ مغرب کو یہ موقع دیا کہ وہ جدید دور کو وجود میں لاسکیں۔

فطرت کا ایک قانون

اہلِ مغرب، اصلاً خدائی دین کے مؤید کے طور پر ابھرے تھے، لیکن ردعمل کی نفسیات کی بنا پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے اِس خدائی منصوبے کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر اہلِ مغرب کو اپنا دشمن سمجھ لیا اور اُن سے لڑنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی دوسو سالہ تاریخ اِس غیر ضروری لڑائی میں ضائع ہوگئی۔ تاریخ کے اِس ارتقائی سفر کو جاری رکھنے کے لیے ہمیشہ ایک قائد درکار ہوتا ہے۔ اہلِ مغرب اِسی قسم کے ایک قائد تھے۔ اِس سے پہلے اہلِ اسلام کو قیادت کا یہ موقع ملا تھا۔ موجودہ زمانے میں منصوبۂ الٰہی کے تحت یہ موقع اہلِ مغرب کے حصے میں آیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں اصحاب رسول جب ایران میں داخل ہوئے تو اہلِ ایران اُن سے خائف ہوگئے۔ انھوں نے اصحابِ رسول کے طاقت ور داخلے کو دیکھ کر کہا: دیواں آمدند، دیواں آمدند (دیو آگئے، دیو آگئے)۔ اہلِ ایران نے اصحابِ رسول کے داخلے کو منفی معنوں میں لیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ ایک نئی تہذیب کے نقیب (harbinger) تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار ایک صحابی رسول ربعی بن عامر نے ایران کے سپہ سالار رستم سے گفتگو

کرتے ہوئے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا: الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد إلى عبادة الله (البداية والنهاية، 7/46) یعنی اللہ نے ہم کو بھیجا ہے، تاکہ وہ جس کو چاہے، ہم اُس کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔

ساتویں صدی میں اٹھنے والے اصحاب رسول کی اصل حیثیت یہی تھی کہ وہ اُس زمانے میں ایک نئے دور کے نقیب تھے۔ یہ فطرت کا اصول ہے کہ جو گروہ نئے دور کا نقیب بن کرا بھرتا ہے، اس کو دوسروں کے اوپر قیادت (leadership) کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے۔ یہ قیادت کسی سازش یا دشمنی کے سبب وجود میں نہیں آتی، بلکہ وہ فطرت کے لازمی تقاضے کے طور پر وجود میں آتی ہے۔

یہی معاملہ موجودہ زمانے میں اہلِ مغرب کے ساتھ پیش آیا۔ اہلِ مغرب اصلاً ایک نئی تہذیب کے نقیب (harbinger) تھے۔ لیکن فطری تقاضے کے طور پر مزید یہ ہوا کہ اُن کو اپنی ہم عصر قوموں کے اوپر قیادت حاصل ہوگئی۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ اہلِ مغرب کی اس قیادت کو ایک فطری واقعہ سمجھ کر قبول کرلیں، جیسا کہ اِس سے پہلے دنیا کی قوموں نے مسلم قیادت کو قبول کرلیا تھا۔ مگر موجودہ زمانے کے مسلمان اِس راز کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کو دشمنی اور سازش کا کیس قرار دے دیا۔ وہ اُن سے نفرت کرنے لگے، یہاں تک کہ ہر جگہ وہ اُن سے لڑنے لگے۔ یہ لڑائی جو جہاد کے نام پر کی گئی تھی، وہ قانونِ فطرت کے خلاف تھی، اِس لیے وہ غیر معمولی قربانیوں کے باوجود مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی۔

اِس ناکامی کی ذمے داری مکمل طور پر خود مسلمانوں کے اوپر ہے۔ مسلمانوں نے اہلِ مغرب کے خلاف جو جنگ چھیڑی، وہ اُن کے خیال کے مطابق، اہلِ مغرب کے خلاف جنگ تھی، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ منصوبۂ الٰہی کے خلاف جنگ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جنگ مکمل طور پر ناکام ہوئی، اُس کا انجام اِس کے سوا کچھ اور نہیں نکلا کہ مسلمانوں کی تباہی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

خلافتِ آدم

قرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے جب آدم (انسانِ اول) کو پیدا کیا، اُس وقت آدم کے علاوہ

دو اور مخلوقات تھیں — جن اور ملائکہ۔ اللہ تعالیٰ نے جن اور ملائکہ سے کہا کہ تم آدم کے آگے جھک جاؤ۔ اُس وقت فرشتے آدم کے سامنے جھک گئے، لیکن جنات کا سردار ابلیس نہیں جھکا۔ ابلیس نے کہا کہ میں آدم سے برتر ہوں، کیوں کہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے۔

ایسا کیوں ہوا۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین بنائی تو پہلے اس کو جنات کے چارج میں دے دیا۔ مگر جنات نے سرکشی کی اور باہم لڑ کر فساد برپا کیا۔ اِس طرح جنات زمین کا انچارج بننے کے لیے نا اہل ہو گئے۔ اِس کے بعد اللہ نے جنات کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ انسان کو پیدا کر کے زمین کو انسان کے چارج میں دے دیا۔ اِس تبدیلی کو جنات نے قبول نہیں کیا، اس لیے جنات کے سردار ابلیس نے آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے پہلے جنات کو پیدا کیا تھا (15:27)۔ اِس لحاظ سے انسان زمین پر جنات کا جانشین، یعنی خلیفۃ الجن ہے۔ کچھ لوگ خلافت کی آیت (إني جاعل فی الأرض خلیفة) سے یہ نظریہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ (خلیفۃ اللہ) ہے۔ یہ نظریہ بلاشبہہ ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ قرآن اور حدیث میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں۔

انسان کو زمین میں خلیفہ بنانے کا مطلب کیا ہے، اِس کو قرآن کی دوسری آیتوں کے مطالعے سے سمجھا جاتا ہے۔ یہاں اِس قسم کی دو آیتوں کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

1- ’’کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی نشانیوں کو لکھنے کے لیے روشنائی ہو جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا، اِس سے پہلے کہ میرے رب کہ باتیں ختم ہوں، اگر چہ ہم اس کے ساتھ اِسی کے مانند اور سمندر ملا دیں‘‘ (15: 109)

2- ’’اور اگر زمین میں جو درخت ہیں، وہ قلم بن جائیں اور سمندر سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں، تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے‘‘۔ 31:27

قرآن کی اِن آیتوں میں جن لامحدود کلماتِ الٰہی کا بیان ہے، وہ صرف بطور خبر نہیں ہے، بلکہ وہ

بطور انشاء ہے۔ اِن آیتوں میں اشارۃً یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ کائنات میں چھپے ہوئے اِن کلمات کو دریافت کیا جائے اور ان کو ''قلم'' سے لکھا جائے، تاکہ انسان اللہ کی عظمتوں سے واقف ہو اور اعلیٰ درجۂ معرفت کے ساتھ الحمد للہ کہہ سکے۔

اللہ کے منصوبے کے مطابق، کلمات اللہ کی دریافت (discovery) اور ان کو قلم بند کرنے کا پراسس (process) موجودہ دنیا میں شروع ہوتا ہے اور آخرت میں دوبارہ جاری رہ کر وہ تکمیل کے منازل طے کرتا ہے۔ موجودہ دنیا میں اِس عمل کے ذریعے ظہور میں آنے والے واقعے کا نام انسانی تہذیب (human civilization) ہے۔ جدید انسانی تہذیب اپنی نوعیت کے اعتبار سے، دراصل، فطرت (nature) میں چھپے ہوئے کلماتِ الٰہی کو دریافت کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ عمل ابتدائی طور پر اِسی دنیا میں انجام پاچکا ہے اور اِسی کا نام جدید تہذیب ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن کی اِس آیت میں پیشگی طور پر کیا گیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41: 53)۔

کلمات اللہ کے اِس دنیوی اظہار کا کام زیادہ تر سیکولر اہلِ علم نے کیا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر ایک حدیث رسول میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: إن اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3062)۔ اِس حدیث میں، ''رجل فاجر'' سے مراد موجودہ زمانے کے سیکولر اہلِ علم ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے غیر معمولی محنت کے ذریعے جدید تہذیب کو وجود دیا ہے جو کہ ''کلمات اللہ'' کی جزئی انفولڈنگ (unfolding) کے ہم معنی ہے۔

کلمات اللہ لامحدود ہیں اور موجودہ دنیا کے امکانات محدود۔ اِس لیے موجودہ دنیا میں کلمات اللہ کی انفولڈنگ صرف محدود طور پر ہی ہوسکتی ہے۔ کلمات اللہ کی کامل انفولڈنگ کے لیے ایک اور وسیع تر دنیا درکار ہے۔ اِسی وسیع تر دنیا کا نام آخرت ہے۔ آخرت میں یہ ہوگا کہ پوری انسانی تاریخ سے، لائق افراد منتخب کیے جائیں گے اور اِن منتخب افراد کو آخرت کی ابدی دنیا میں بسایا جائے گا۔ وہاں یہ منتخب افراد کلمات اللہ کی مزید انفولڈنگ کا کام انجام دیں گے۔

یہ انفولڈنگ ابد تک جاری رہے گی، وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ آخرت میں کلمات اللہ کی انفولڈنگ کے ذریعے ایک برتر تہذیب وجود میں آئے گی۔ اِس کو خدائی تہذیب (divine civilization) کہا جاسکتا ہے۔ کلمات اللہ کی اِس لامحدود انفولڈنگ کو قرآن میں: **وأشرقت الأرض بنور ربها** (39: 69) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کی پہلی سورہ کی پہلی آیت یہ ہے: **اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ** ۔ یہ حمد خداوندی کا ابتدائی درجہ ہے جو موجودہ دنیا میں کلمات اللہ کی جزئی انفولڈنگ کے دوران ادا ہوگا۔ ٹھیک یہی کلمہ (**اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ**) قرآن کی سورہ الزمر میں آیا ہے (39: 75)۔ سورہ الفاتحہ میں حمد خداوندی کے اُس درجے کا بیان تھا جو کہ دنیا میں کلمات اللہ کی ابتدائی انفولڈنگ کے وقت ادا ہوا۔ اور سورہ الزمر میں اُس حمد خداوندی کا ذکر ہے جو کہ آخرت میں کلمات اللہ کی انتہائی انفولڈنگ کے وقت اہلِ جنت کی زبان سے ادا ہوگا۔

موجودہ دنیا وہ جگہ تھی جہاں انسان کو تمام چیزیں بقدرِ ضرورت دی گئی تھیں (14: 34)۔ آخرت کی جنت وہ جگہ ہوگی جہاں اس کے باشندوں کو تمام اعلیٰ نعمتیں درجۂ اشتہا (41:31) میں حاصل ہوں گی۔ آخرت کی جنت میں یہ تمام نعمتیں اس کے باشندوں کو خدائی میزبانی (divine hospitality) کے طور پر حاصل ہوں گی۔

آخرت میں اہلِ جنت کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہ ہوگا کہ وہ لامحدود کلمات اللہ کی بقیہ انفولڈنگ کریں اور ایک برتر تہذیب (super civilization) کو وجود میں لائیں۔ کلمات اللہ کی انفولڈنگ کا یہ کام ابد تک جاری رہے گا۔ اس لیے اہلِ جنت کا دورِ مسرت بھی ابد تک جاری رہے گا، وہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

اسلام کی تاریخ

خدا نے انسان کو مکمل آزادی دی ہے۔ اِسی کے ساتھ خدا عام تاریخ کو نیز اسلامی تاریخ کو مینج (manage) کر رہا ہے، تاکہ تخلیق کا خدائی مقصد یقینی طور پر حاصل ہوتا رہے۔ خدائی سنت

کے مطابق، اس مینج مینٹ کی تکمیل ہمیشہ کچھ افراد کے ذریعے ہوتی ہے۔ اِس خدائی مینج مینٹ کی چار بڑی صورتیں ہیں:

1- ادارتی رول (institutional role)

2- انقلابی رول (revolutionary role)

3- علمی رول (academic role)

4- انفرادی رول (individual role)

ادارتی رول کی ایک معلوم تاریخی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ انھوں نے تقریباً چار ہزار سال پہلے مکہ میں کعبہ (بیت اللہ) کی تعمیر کی۔ یہ کعبہ گویا کہ مذہبِ توحید کا ایک ادارتی مرکز (institutional centre) ہے۔ کعبہ سارے عالم کے موحدین کا مرکز ہے اور قیامت تک وہ موحدین کا مرکز بنا رہے گا۔

خدا کے دین کی لمبی تاریخ میں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم (وفات: 632ء) کا رول ایک انقلابی رول ہے۔ آپ نے تاریخ انسانی کو ایک نئے دور میں داخل کیا۔ اِس انقلابی عمل میں صحابہ اور تابعین کا رول مددگار رول (supporting role) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس انقلاب کے اثرات تاریخ میں آج تک جاری ہیں اور قیامت تک جاری رہیں گے۔

علمی رول یا اکیڈمک رول کی حیثیت سے محدثین کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ محدثین نے یہ کیا کہ انھوں نے دینِ خداوندی کے دوسرے مستند ماخذ حدیثِ رسول کو اِس طرح مدوّن کر دیا کہ وہ بعد کی تمام نسلوں کے لیے خدا کے رسول کی رہنمائی کو جاننے کا قابلِ اعتبار ماخذ بنا۔ ابتدائی دور کے ان محدثین کا زمانہ نویں صدی عیسوی ہے۔

انفرادی رول کی حیثیت سے نمایاں نام اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز (وفات: 720ء) کا ہے۔ وہ 717 عیسوی میں بنو امیہ کے خلیفہ منتخب ہوئے جن کا دار السلطنت دمشق تھا۔ ان کی خلافت کی مدت صرف ڈھائی سال ہے۔ انھوں نے اِس مختصر مدت میں ایک بہت بڑا تجدیدی کام کیا، مگر اُن کا

یہ رول ایک انفرادی رول تھا جو اُن کی زندگی تک باقی رہا اور ان کی وفات پر عملاً ختم ہوگیا۔

مذکورہ چار تاریخی ماڈل میں ابتدائی تین ماڈل صرف ایک بار کے لیے تھے۔ بعد کی نسلوں کے لیے یہ رہنمائی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، لیکن اب ان کا اعادہ ممکن نہیں۔ البتہ چوتھا رول (انفرادی رول) بدستور جاری ہے۔ بعد کی نسلوں میں بھی یہ ممکن ہے کہ اُن کے درمیان کوئی فرد اٹھے اور اپنے حالات کی نسبت سے کوئی مطلوب انفرادی رول ادا کرے۔ مگر اصلاً یہ ایک شخص کا رول ہوگا جو عملاً اس کی شخصی زندگی تک جاری رہے گا اور اس کے بعد ختم ہوجائے گا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی پہلو سے اس کا اثر حسب حالات بعد کے زمانے میں بھی باقی رہے۔

واضح ہو کہ اگر اس قسم کا کوئی فرد اپنے زمانے میں ایک تنظیم بنائے اور وہ تنظیم اس کی وفات کے بعد باقی رہے تو یہ تنظیم اس فرد کے رول کے استمرار (continuation) کے ہم معنی ہوگی، بلکہ وہ ایک ایسے ڈھانچہ کے استمرار کے ہم معنی ہوگا جو متوفیؒ کے نام پر اس کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ایسی کوئی تنظیم بعد کو اگر باقی رہتی ہے تو وہ کسی مادی بنیاد پر باقی رہتی ہے، نہ کہ مشن کی اصل اسپرٹ کی بنیاد پر۔

اخوانِ رسول کا رول

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت حدیث کی کتابوں میں اِس طرح آئی ہے:

وددتُ أنا قد رأينا إخواننا، قالوا: أولسنا إخوانك يا رسول الله، قال: أنتم أصحابي، وإخواننا الذين لم يأتوا بعد (صحيح مسلم، رقم الحديث: 249) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ ہم اپنے اخوان (بھائیوں) کو دیکھیں۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا ہم آپ کے اخوان نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم میرے اصحاب ہو، ہمارے اخوان وہ ہیں جو ابھی نہیں آئے۔

مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں دو اہم رول مقدر تھے — ایک، اصحابِ رسول کا رول، اور دوسرے، اخوانِ رسول کا رول۔ اصحابِ رسول کا رول یہ تھا کہ وہ انسانی تاریخ میں ایک نئے عمل (process) کا آغاز کریں، ایک ایسا عمل جب کہ قدیم دور ختم ہو اور ایک نیا دور نئے مواقع

اور نئے امکانات کے ساتھ ظہور میں آئے۔ اِس بات کو سمجھنے کے لیے اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ پہلے دور سے مراد روایتی دور ہے، اور دوسرے دور سے مراد سائنٹفک دور۔

اصحاب رسول اور اخوانِ رسول دونوں ہی کا نشانہ ایک ہوگا اور وہ ہے دعوت الی اللہ۔ اِس دعوت الی اللہ کے دو بڑے دور ہیں — ایک ہے عالمی کمیونکیشن سے پہلے کا دور۔ دوسرا ہے، عالمی کمیونکیشن کے بعد کا دور۔ اصولی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عالمی کمیونکیشن کے ظہور سے پہلے جو مواقع تھے، اصحابِ رسول نے اُن کا بھر پور استعمال کیا۔ بعد کو عالمی کمیونکیشن کے زمانے میں جو مواقعِ دعوت پیدا ہوں گے، اُن کو جو لوگ بھر پور طور پر استعمال کریں، وہی وہ لوگ ہیں جن کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔ اخوانِ رسول کسی پراسرار گروہ کا نام نہیں۔

جنت کی دنیا

انسانی تاریخ ایک عورت اور ایک مرد سے شروع ہوئی، پھر لوگ پیدا ہوتے رہے اور مرتے رہے۔ اِس طرح یہ سلسلہ نسل درنسل ہزاروں سال سے قائم ہے۔ اکیسویں صدی کے رُبع اوّل میں پورے کرۂ ارض پر انسانوں کی تعداد سات بلین سے زیادہ ہوچکی ہے۔ اس سے پہلے جو لوگ مر گئے، وہ بھی معدوم نہیں ہوئے، بلکہ وہ آخرت کی دنیا میں بدستور زندہ موجود ہیں۔

جس طرح انسانی تاریخ کا ایک آغاز ہے، اُسی طرح اس کا ایک اختتام بھی ہے۔ انسانی تاریخ کے خاتمے کے بعد ایک اور دنیا بنے گی۔ یہ دنیا کامل معنوں میں ایک معیاری دنیا ہوگی۔ اِس معیاری دنیا میں پوری تاریخ کے منتخب افراد آباد کئے جائیں گے۔ قرآن میں اِس حقیقت کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (21: 105) یعنی زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

یہ حقیقت پچھلی آسمانی کتابوں میں بھی بیان ہوئی ہے۔ موجودہ بائبل میں اِس سلسلے میں یہ الفاظ آئے ہیں — بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر اور ہمیشہ تک آباد رہ، کیوں کہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے اور وہ اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا، وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں، پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔

صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ آباد رہیں گے:

Depart from evil, and do good; And dwell forevermore. For the Lord loves justice, And does not forsake His saints; They are preserved forever, But the descendants of the wicked shall be cut off. The righteous shall inherit the land, and dwell in it forever. (Psalm 37: 27-29)

قرآن کی بہت سی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں کیسا معیاری ماحول ہوگا اور وہاں ہر قسم کے اعلیٰ سامان وافر مقدار میں موجود ہوں گے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّمُلْکًا کَبِیْرًا (76:20) یعنی تم جہاں دیکھو گے، وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے:

Wherever you look, you will see bliss and a great kingdom.

جنت میں اہلِ جنت کے لیے جو اعلیٰ انتظامات ہوں گے، اُن کا خلاصہ قرآن کے اِن الفاظ میں بیان کردیا گیا ہے نعیم، اور ملکِ کبیر۔ نعیم سے مراد ہر قسم کی نعمتیں (blessings) ہیں۔ انسان جو کچھ چاہے گا، وہ سب وہاں اُس کے لیے کامل صورت میں موجود ہوگا (41: 32)۔ ملکِ کبیر سے مراد مکمل آزادی ہے، یعنی کسی بھی قسم کی پابندی کے بغیر زندگی گزارنے کا موقع حاصل ہونا۔ اِس مکمل آزادی کی نعمت اُن خوش قسمت افراد کو حاصل ہوگی جنھوں نے موجودہ دنیا میں یہ ثبوت دیا تھا کہ وہ آزادی کے باوجود اپنی آزادی کا صرف صحیح استعمال کرنے والے ہیں۔

جنت کی وسعتوں کو بتاتے ہوئے قرآن میں یہ بات آئی ہے: وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ (3: 133) یعنی دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی طرح ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک اور آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَہٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّۃِ حَیْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (39: 74) یعنی اہلِ جنت کہیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کردکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا،

ہم جنت میں جہاں چاہیں، مقام کریں۔ پس کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔

جنت کی یہ وسعت موجودہ زمانے میں ایک قابلِ فہم واقعہ بن چکی ہے۔ جدید دوربینوں کے مشاہدے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ کائنات کی وسعتوں میں ایسے قابلِ آباد کاری سیارے (habitable planets) بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ صرف ہماری کہکشاں (Milky Way) کے اندر کئی بلین کی تعداد میں اِس طرح کے سیارے موجود ہیں۔

اِس نئی دریافت کو لے کر غور کیا جائے تو جنت کے بارے میں عجیب قسم کا پر اہتزاز تصور (thrilling concept) معلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً جنت بے شمار ہرے بھرے سیاروں کا ایک کائناتی مجمع الجزائر (universal archipelago) ہے۔ تمام جزیرے اپنی اپنی جگہ پر مکمل دنیائیں ہیں۔ اِسی کے ساتھ وہ انتہائی اعلیٰ قسم کے کمیونکیشن کے ذریعے باہم جڑے ہوئے ہیں۔ آخرت کے دور میں شاید ایسا ہوگا کہ ہر جنتی کو زندگی گزارنے کے لیے مستقل دنیائیں حاصل ہوں گی۔ اِسی کے ساتھ وہ دوسرے جنتی باشندوں سے معیاری کمیونکیشن کے ذریعے ہر لمحہ مربوط ہوگا۔ جنت میں ہر قسم کی نعمتیں بھی ہوں گی اور کامل آزادی بھی۔ اِسی کے ساتھ جنت گویا اعلیٰ انسانوں پر مبنی ایک کائناتی سماج ہوگا، جہاں ہر انسان کو کامل معنوں میں فل فل مینٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔

ابدی جنت کی یہ ناقابلِ بیان حد تک اعلیٰ نعمتیں اہلِ جنت کو تمام تر اور یک طرفہ طور پر اللہ کی رحمت کے ذریعے حاصل ہوں گی، لیکن اہلِ جنت کے اعزاز کے لیے اللہ کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے گا کہ: وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (43: 72) یعنی یہ وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنادئے گئے ہو، اُس عمل کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔

قرآن کا تصورِ تاریخ

قرآن کے بارے میں ایک لمبی حدیث کتابوں میں آئی ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: کتاب اللہ، فیہ نبأ ما قبلکم، وخبر ما بعدکم (الترمذي، رقم الحدیث: 2906) یعنی قرآن اللہ کی

کتاب ہے۔ اس میں تم سے پہلے کے لوگوں کی باتیں ہیں اور اس میں تمھارے بعد کے لوگوں کی خبریں ہیں۔ ایک صحابی رسول عبد اللہ بن مسعود نے قرآن کے بارے میں فرمایا: فیه علم الأوّلین والآخرین (البیهقي، شعب الإیمان، رقم الحدیث: 1808) یعنی قرآن میں پچھلے لوگوں کا بھی علم ہے اور بعد کے لوگوں کا بھی علم ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن جامع معنوں میں انسانی نسلوں کی کوئی تفصیلی تاریخ ہے۔ اِس کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن میں تاریخِ بشری کے نمائندہ واقعات موجود ہیں، یعنی ایسے تاریخی حوالے جن پر غور کر کے پورے دورِ تاریخ کی ایک جامع تصویر بنائی جاسکتی ہے۔

تاریخ کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ گزرے ہوئے واقعات کا سلسلہ وار بیان (chronicle) ہو۔ یہ تاریخ کا معروف مؤرخانہ تصور ہے۔ تاریخ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ تاریخی واقعات کو اِس اعتبار سے بیان کیا جائے کہ وہ خالق کے نقشۂ تخلیق کو بتانے والا ہو۔ تاریخ کے پہلے تصور میں تمام واقعات کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ تاریخ کے دوسرے تصور میں تاریخ کے صرف منتخب اور نمائندہ اجزا بیان کئے جاتے ہیں۔

یہی دوسرا طریقہ قرآن کے تصورِ تاریخ کے مطابق ہے۔ مگر یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تاریخ کے نمائندہ واقعات بھی قرآن میں مروّجہ تاریخی اسلوب میں نہیں ہوتے، وہ صرف حوالہ (reference) کے اسلوب میں ہوتے ہیں۔ اِس معاملے میں قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں جن تاریخی حوالوں کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ اشارے کی زبان میں ہوتے ہیں۔ یہ قاری کے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ایسا کرے کہ قرآن کے باہر جو تاریخی ریکارڈ موجود ہے، اُس سے ضروری اجزا لے کر وہ قرآن کے اشارات کی تفصیل کرے۔ وہ بظاہر غیر متعین زبان میں کہی ہوئی بات کو متعین اسلوب میں مدوّن کرے۔

اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت آدم کے بعد ان کی نسل میسوپوٹامیا (Mesopotamia) کے علاقے میں آباد ہوئی۔ یہ نسل شریعتِ آدم پر قائم تھی۔ بعد کے زمانے میں جب اُن کے اندر بگاڑ آیا تو تقریباً پانچ ہزار سال پہلے پیغمبر نوح پیدا ہوئے۔ انھوں نے لمبی مدت تک لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ کچھ افراد نے آپ کی دعوت کو مانا، لیکن بیش تر افراد نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اِس کے بعد اِس علاقے میں ایک بڑا طوفان آیا۔

اِس موقع پر ایمان لانے والے افراد ایک کشتی کے ذریعے بچا لئے گئے اور بقیہ تمام افراد ہلاک کر دئے گئے۔

اِس کشتی کے بارہ میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: فَأَنْجَيْنٰهُ وَأَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (29:15) یعنی پھر ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو بچا لیا۔ اور ہم نے اس کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔ قرآن کی ایک اور آیت میں اس واقعے کا ذکر اِن الفاظ میں آیا ہے: وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (54:15) اِس آیت کا ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی نے اِن الفاظ میں کیا ہے — اور اس کو ہم نے رہنے دیا نشان کے لیے (We have left it as a sign)

حضرت نوح کا واقعہ ایک پورے دورِ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے جو حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا ایک نمائندہ جُز کشتیٔ نوح (Noah's Ark) ہے۔ کشتیٔ نوح کے بارہ میں قرآن نے بتایا کہ اُس کو اللہ نے عبرت کے طور پر باقی رکھا ہے۔ ساتویں صدی کے ربع اول میں بوقتِ نزولِ قرآن کسی کو اِس کشتی کا علم نہ تھا۔ موجودہ زمانے میں گلوبل وارمنگ کے نتیجے میں پہاڑوں کے اوپر جمی ہوئی برف بڑے پیمانے پر پگھلنے لگی۔ اس کے بعد ہوائی سروے کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ ترکی کے مشرقی علاقے میں کوہِ ارارات (Mount Ararat) کے اوپر وہ کشتی برف کی موٹی تہ کے نیچے دبی ہوئی موجود تھی جو اکیسویں صدی میں سامنے آ گئی۔

قرآن میں کشتی نوح کا ذکر مختصر طور پر موجود تھا۔ اب بعد کو دریافت کردہ معلومات کی روشنی میں یہ ممکن ہو گیا کہ تاریخ بشری کے اس باب کو زیادہ تفصیل کے ساتھ مرتب کیا جائے اور اس کو قرآن کی تاریخی تفہیم کے لیے استعمال کیا جائے۔

اِس قسم کا ایک اور تاریخی حوالہ وہ ہے جو پیغمبر موسیٰ کے دورِ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ تقریباً تین ہزار سال پہلے مصر میں یہ واقعہ ہوا کہ پیغمبر موسیٰ کے معاصر بادشاہ فرعون کو خدا نے بحرِ قلزم (Red Sea) میں غرق کر دیا۔ اس کے بارے میں قرآن میں یہ آیت آئی ہے کہ بوقتِ غرق اللہ نے فرمایا: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً (10:92) یعنی آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے، تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی بنے۔

فرعون کا یہ واقعہ بھی ایک پورے دورِ تاریخ کی علامت ہے۔ مگر ساتویں صدی عیسوی میں جب کہ قرآن نازل ہوا، یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ فرعون کی لاش کہاں محفوظ ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں یورپ کے کچھ مستشرقین نے دریافت کیا کہ مذکورہ فرعون کی لاش محفوظ حالت میں اہرامِ مصر میں موجود ہے۔ اب یہ لاش اہرامِ مصر سے نکال کر قاہرہ کے میوزیم میں رکھ دی گئی ہے۔ اِس واقعے کی تفصیل ڈاکٹر موریس بکائی کی کتاب (*The Bible, The Quran and Science*) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

قرآن نے انسانی تاریخ کا جو تصور دیا ہے، اس کے مطابق، ایسے علامتی واقعات قرآن میں موجود ہیں جن کو مزید معلوم تاریخ کے اضافے سے از اول تا آخر مدون کیا جاسکتا ہے۔ قرآن میں پچھلی تاریخ کے بارے میں علامتی واقعات ملتے ہیں اور بعد کی تاریخ کے بارے میں ایسی پیشین گوئیاں موجود ہیں جو قیامت تک کی پوری تاریخِ انسانی کا احاطہ کررہی ہیں۔ قرآن میں موجود اِن تاریخی حوالوں کی حیثیت صرف عنوانات کی ہے۔ اِن عنوانات کی روشنی میں اگر دیگر حاصل شدہ معلومات کو شامل کیا جائے، تو اس کے ذریعے قرآن کے تصورِ تاریخ کے مطابق، انسانی تاریخ کی پوری تصویر بنائی جاسکتی ہے۔

خلاصۂ کلام

مورخین کے یہاں مختلف قسم کے تاریخی تصورات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً خاندانی بادشاہت کے اعتبار سے تاریخ کی تدوین، قوموں کے عروج وزوال کے اعتبار سے تاریخ کی تدوین، مختلف تہذیبوں (civilizations) کے اعتبار سے تاریخ کی تدوین، وغیرہ۔ مگر خدائی تصورِ تاریخ (divine concept of history) اِس سے مختلف ہے۔ خدائی تصورِ تاریخ کیا ہے، اس کو قرآن کے مطالعے سے سمجھا جاسکتا ہے۔

خدائی تصورِ تاریخ کے مطابق، اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کے بعد انسان کو یہ موقع دیا کہ وہ توالد وتناسل کے ذریعے اپنی تعداد بڑھائے۔ اس کی نسلیں کرۂ ارض (planet earth) کے مختلف حصوں میں آباد ہوں۔ اللہ نے انسان کو مکمل آزادی عطا کی۔ اللہ نے انسان کو یہ موقع دیا کہ خواہ وہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے یا وہ اس کا غلط استعمال کرے، وہ زمین میں اصلاح کرے یا وہ زمین میں

فساد برپا کرے، وہ اپنی زندگی کو عدل پر قائم کرے یا بے انصافی پر قائم کرے، حتی کہ انسان کو یہ بھی آزادی حاصل ہے کہ چاہے تو وہ اللہ کا اقرار کرے اور چاہے تو وہ اللہ کا انکار کرکے سرکش بن جائے۔ اللہ کے منصوبے کے مطابق، آزادی کی یہ صورتِ حال قیامت تک جاری رہے گی۔

اِس پورے تاریخی عمل کے دوران اللہ کا مطلوب صرف ایک ہے، اور وہ ہے صالح افراد کا انتخاب۔ یہ افراد وہ ہیں جو ہر قسم کے ہنگاموں کے باوجود اپنے آپ کو آزادی کے صحیح استعمال پر قائم رکھیں، جو اپنی ذہنی قوتوں کو استعمال کرتے ہوئے اور نبیوں کی ہدایت سے استفادہ کرتے ہوئے اللہ کو دریافت کریں اور اپنی زندگی کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق بنائیں۔ اِسی قسم کے صالح افراد اللہ کو مطلوب ہیں۔ اللہ اپنے خصوصی انتظام کے تحت پوری تاریخ میں مسلسل طور پر ایسے ہی صالح افراد کا انتخاب کر رہا ہے۔

آدم سے لے کر قیامت تک کے پورے تاریخی عمل کے دوران اللہ کی سنت یہ ہے کہ انسان کی آزادی کو منسوخ نہ کیا جائے، البتہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے تاریخ کو اِس طرح مینج (manage) کیا جائے کہ اللہ کا اصل مطلوب (صالح افراد کی پیداوار) کا عمل برابر جاری رہے۔

دوسرے مورخین تاریخ کو مجموعے کی صورت میں دیکھتے ہیں، جب کہ خدائی تصور کے مطابق، صحیح یہ ہے کہ تاریخ کو افراد کے اعتبار سے دیکھا جائے۔ انسانی مجموعے کو لے کر تاریخی رائے قائم کرنا مورخین کا طریقہ ہے، جب کہ خدائی تصور کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسانی افراد کو لے کر تاریخ کے بارے میں رائے قائم کی جائے۔